Scanned by CamScanner

اسلام
مکمل دین
مستقل تہذیب

تالیف

محمد عبید اللہ الاسعدی

تقریظ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی دامت برکاتہم

تقدیم

مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی

مکتبہ احسان لکھنؤ
MAKTABA AHSAN
Lucknow-20

جملہ حقوق محفوظ ہیں:

نام کتاب: اسلام مکمل دین مستقل تہذیب

کمپوزنگ: محمد یونس ہتورا 9648373700

طباعت:

قیمت: ۲۵۰

ناشر: مکتبہ احسان لکھنؤ

باہتمام: محمد طاہر ندوی و محمد عرفان ندوی

ناشر:

مکتبۂ احسان لکھنؤ

MAKTABA AHSAN

504/119, Tagore Marg, Daliganj, Lucknow-20 (U.P.)

Ph. : 0522-3206907 M. : 9793118234, 9335982413

E-mail : maktabaahsan1@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابوالحسن علی الحسنی الندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ، الہند

Abul Hasan Ali Nadwi

DARULULOOM NADWATULULAMA

LUCKNOW-226007 (India)

تقریظ بر کتاب "اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب"

عزیز گرامی مولوی سید عبید اللہ الاسعدی کے خاندان سے ہمارے قدیم دینی و روحانی روابط چلے آرہے ہیں۔ ان کے خاندان کے متعدد افراد دار العلوم ندوۃ العلماء سے مختلف حیثیتوں سے مربوط و وابستہ رہے ہیں۔ ان کے والد عزیز گرامی مولانا سید ... صاحب ... کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ناظر ہیں، اور ان کے چچا زاد برادر مولوی سید اجتبا حسینی ندوی حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور ہمارے علمی و دینی حلقے کے ایک عزیز ترین اور رفیق کار ہیں۔ خود عزیز القدر مولوی محمد عبید اللہ اسعدی قاسمی دار العلوم کے طالب علم رہے ہیں، اور ان کے بعض علمی رسائل پر پہلے نظر پڑ چکی ہے۔

لیکن ان سب روابط و واقفیت کے باوجود ہم کو ان کی اس تصنیفی صلاحیت، وسعت مطالعہ اور اسلوب نگارش کا قطعاً اندازہ نہ تھا، جس کا ان کی وسیع کتاب "اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب" میں اظہار ہوا ہے اور یہ میرے لیے خوشگوار انکشاف اور قابل مسرت اعتراف کا باعث ہے۔

مصنف کی کوشش یہ ہے کہ ایک متوسط درجے کے تعلیم یافتہ مسلمان کے سامنے اسلامی عقائد، سیرت نبوی، صحابہ کرام، اسلام کے بنیادی ارکان، مسلمانوں کے علم کے سرچشمے اور ان کی علمی خدمات، اسلامی ثقافت و علوم دینی، ان کی تہذیبی و علمی خدمات اور تاریخ اسلام کے وہ اہم پہلو اور ان کی بنیادی معلومات کو پیش کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی معاشرت، عائلی و اخلاقی، اقتصادی و معاشی نظام کی خصوصیات بھی سامنے آجائیں، جن سے واقف ہونا اس دور ترقی میں اور ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب و معاشرے پائے جاتے ہیں، بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب "اسلام کے مکمل دین اور مستقل تہذیب" ہونے کے موضوع پر ایک ذخیرہ گرامی بن گئی ہے اور اس قابل ہے کہ جو تعلیم یافتہ مسلمان تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بڑی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتا وہ اس کے ذریعہ ... واقفیت اور اسلام کے مکمل دین و مستقل تہذیب ہونے پر اطمینان و اذعان حاصل کرلے، اور غیر مسلموں کے سامنے بھی وقت ضرورت اسلام کو پیش کر سکے۔

میں عزیز موصوف کو اس کتاب پر مبارکباد دیتا ہوں۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ

رائے بریلی

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ

۵ جون ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

TELE.: NADWA

Abul Hasan Ali Nadwi
DARULULOOM NADWATULULAMA
LUCKNOW-226007 (INDIA)

ابوالحسن علی الحسنی الندوی
ندوۃ العلماء، لکھنؤ، الہند

عزیزی مولوی سید عبید اللہ الاسعدی کے خاندان سے ہمارے قدیم دینی و روحانی روابط چلے آرہے ہیں ان کے خاندان کے متعدد افراد دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مختلف نوعیتوں سے مربوط و وابستہ رہے ہیں ان کے والد عزیز گرامی مولوی سید مرتضیٰ صاحب نقوی کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ناظر ہیں اور ان کے چچا ڈاکٹر مولوی سید اجتبا حسینی ندوی حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور ہمارے علمی و دینی حلقے کے ایک عزیز رکن اور رفیق کار ہیں، خود عزیز القدر مولوی محمد عبید اللہ اسعدی سلمہ دارالعلوم کے طالب علم رہ ہیں اور ان کے بعض علمی رسائل پر پہلے نظر پڑ چکی ہے۔

لیکن ان سب روابط و واقفیت کے باوجود مجھے ان کی اس تصنیفی صلاحیت، وسعت مطالعہ اور اسلام کے جامع تصور کا قطعاً اندازہ نہ تھا، جس کا ان کی وقیع کتاب "اسلام مکمل دین مستقل تہذیب" میں اظہار ہوا ہے۔ اور یہ میرے لئے خوشگوار انکشاف اور قابل مسرت اعتراف کا باعث ہے۔

انھوں نے کوشش کی ہے کہ ایک متوسط درجے کے تعلیم یافتہ مسلمان کے لئے اسلامی عقائد، سیرت نبوی، صحابہ کرام، اسلام کے بنیادی ارکان، مسلمانوں کے ساتھ علم کے رابطے اور ان کی علمی خدمات، اسلامی ثقافت و علوم دینی، ان کی تہذیبی و علمی خدمات اور تاریخ اسلام کے اہم پہلو اور ان کی بنیادی معلومات کو پیش کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ اسلامی معاشرت، عائلی و اخلاقی، اقتصادی و معاشی نظام کی خصوصیات بھی سامنے آجاتی ہیں، جن سے واقف ہونا اس دور ترقی میں اور ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب و معاشرے پائے جاتے ہیں بہت ضروری ہو گیا ہے۔

اس طرح یہ کتاب "اسلام کے مکمل دین اور مستقل تہذیب" ہونے کے موضوع پر ایک ڈائرکٹری بن گئی ہے۔

اور اس قابل ہے کہ جو تعلیم یافتہ مسلمان تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بڑی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتا وہ اس کے ذریعہ ضروری واقفیت اور اسلام کے مکمل دین و مستقل تہذیب ہونے پر اطمینان و اذعان حاصل کرے اور غیر مسلموں کے سامنے بھی وقت ضرورت اسلام کو پیش کر سکے۔

میں عزیز موصوف کو اس کتاب پر مبارکباد دیتا ہوں۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ
رائے بریلی

۱۳ رمضان المبارک ۱۴۰۵
۲ جون ۱۹۸۵

فہرست مضامین

باسمہ سبحانہ

تعارف کتاب

از:-مولانا شمس الحق صاحب ندوی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اسلامیات پر بے شمار کتابیں لکھیں گئی ہیں؛ عقائد پر الگ، عبادات پر الگ، اسلامی احکام وقوانین پر الگ، اسلام کا نظام اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست، عدالت، مساوات سبھی موضوعات پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔

لیکن کوئی ایسی جامع ومختصر کتاب جو اسلام کا مکمل تعارف اور اولوالعزم انبیاء کا ذکر کرتی، وحی ورسالت اور عقیدۂ آخرت وملائکہ کے ساتھ ازواج مطہرات، اولاد نبیؐ، خلفاء راشدین، ائمہ اربعہ، مشہور محدثین ومفسرین، علوم اسلامیہ تفسیر اور فقہ وحدیث سب کا یکجا ذکر وتعارف جو خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات اور اس طبقہ کے لئے جس کو زیادہ مطالعہ کا موقع نہیں؛ مفید ہو، اس کی بڑی ضرورت تھی، مولوی محمد عبیداللہ صاحب اسعدی نے بڑی خوبی وکامیابی کے ساتھ ''اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب'' کتاب لکھ کر یہ مفید کام انجام دیا ہے۔

کتاب کی زبان سادہ ودل نشین ہے، لفاظی وعبارت آرائی سے گریز کیا گیا ہے، ساتھ ساتھ چونکہ کتاب میں موضوع بدلتا رہتا ہے؛ اس لئے اس کے مطالعہ سے ذہن پر بار ہو جانے کے بجائے معلومات وواقفیت کے ساتھ ساتھ ذہن کو تازگی بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔

امید ہے کہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی!! فقط

شمس الحق ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی

ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اسلام ایک جامع دین ہے اور آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری سال میں اس کے مکمل کئے جانے کا اعلان بھی ہو چکا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا)۔

جامع اور مکمل دین ہونے کی صفت تنہا اسلام کی شان ہے، دنیا کا کوئی دوسرا دین قدیم ہو یا جدید اس مقام تک نہیں پہنچا؛ خواہ وہ دین سماوی ہو جیسے یہودیت ونصرانیت یا زمینی جیسے تمام مشرکانہ مذاہب، بشمول ہندو مذہب، بدھ مذہب اور وہ عقائد وخیالات جنہوں نے انسانی زندگیوں میں مذہب کی جگہ لے لی ہو، جیسے کیمونزم اور دیگر اسی سے ملتے جلتے ازم۔

جامع سے مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور مکمل کا مطلب یہ ہے کہ جو رہنمائی اور احکامات اس نے دے دئے ہیں ان میں اب مزید اضافہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ دین رب العالمین کی طرف سے آیا ہے اور اسی نے یہ بات بتائی ہے کہ اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔

جب رب العالمین نے ہی اس انسان کو پیدا کیا ہے، جو اس دین پر عمل کرنے کا پابند ہے اور اسی نے یہ دنیا بنائی اور دنیا کے حالات بنائے تو وہی سب سے زیادہ جانتا ہے کہ یہ

انسان ان حالات میں کتنا عمل کر سکتا ہے اور اس کو کیا کیا عمل کرنا چاہئے، اسی لئے جب کوئی اسلامی حکم ہمارے سامنے آئے جو قرآن وسنت سے ثابت ہو تو اس کو قبول کرنے یا اس کو مفید ومناسب سمجھنے میں ہمارے لئے کسی تردد کی گنجائش نہیں۔

دین اسلام عقائد، عبادات اور معاملات پر مشتمل ہے اور یہی وہ تین پہلو ہیں جو انسانی زندگی پر محیط ہیں، عقائد کی بنیاد پر تو یہ طے ہوتا ہے کہ کن باتوں کے ماننے پر آدمی دین اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے اور کن باتوں کے نہ ماننے سے خارج ہوتا ہے، اس لئے دین میں عقائد کو سب سے زیادہ بنیادی اور اولین حیثیت حاصل ہے، لہٰذا عقائد کی صحیح نوعیت اور ان کی تفصیل سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ ناواقفیت کی بنا پر کوئی مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہو جائے، عقائد میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور صفات، اس کا دینی پیغام لانے والے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کا مقام نبوت اور اس کی ضروری تفصیل، نیز خدا کی پیدا کی ہوئی غیر مرئی یعنی دکھائی نہ دینے والی عام نظروں سے مخفی مخلوق فرشتوں، اس کی اتاری ہوئی کتابوں اور یوم آخرت کے ہونے اور وہاں حساب سزا وجزا ہونے پر یقین کرنا شامل ہے۔

عقائد کو صحیح طور پر ماننے کے بعد اسے ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اپنی زندگی کو ان کے مطابق بنانا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ خالق ومعبود ہے، اس لئے اس کی عبادت فرض ہے اور چوں کہ وہ تن تنہا معبود ہے، اس لئے اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا، اس نے اپنے احکامات کو سمجھانے کیلئے رسول بھیجے اور آخر میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی بنا کر بھیجا ہے، ان کی پوری پوری اطاعت کرنا ضروری ہے۔

عقائد وعبادات کے بعد زندگی کے عام معاملات آتے ہیں، ان میں بھی خدا تعالیٰ کے احکامات جن کی وضاحت اس کے رسول نے کی ہے، ان کی تعمیل واجب ہے۔

مذکورہ بالا اشاروں کی بنیاد پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سب باتیں تفصیلات رکھتی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

از حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی

ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اسلام ایک جامع دین ہے اور آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری سال میں اس کے مکمل کیے جانے کا اعلان بھی ہو چکا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا)۔

جامع اور مکمل دین ہونے کی صفت تنہا اسلام کی شان ہے، دنیا کا کوئی دوسرا دین قدیم ہو یا جدید اس مقام تک نہیں پہنچا: خواہ وہ دین سماوی ہو جیسے یہودیت ونصرانیت یا زمینی جیسے تمام مشرکانہ مذاہب، بشمول ہندو مذہب، بدھ مذہب اور وہ عقائد وخیالات جنہوں نے انسانی زندگیوں میں مذہب کی جگہ لے لی ہو، جیسے کمیونزم اور دیگر اسی سے ملتے جلتے ازم۔

جامع سے مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور مکمل کا مطلب یہ ہے کہ جو رہنمائی اور احکامات اس نے دے دئے ہیں ان میں اب مزید اضافہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ دین رب العالمین کی طرف سے آیا ہے اور اسی نے یہ بات بتائی ہے کہ اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔

جب رب العالمین نے ہی اس انسان کو پیدا کیا ہے، جو اس دین پر عمل کرنے کا پابند ہے اور اسی نے یہ دنیا بنائی اور دنیا کے حالات بنائے تو وہی سب سے زیادہ جانتا ہے کہ یہ

انسان ان حالات میں کتنا عمل کر سکتا ہے اور اس کو کیا کیا عمل کرنا چاہئے، اسی لئے جب کوئی اسلامی حکم ہمارے سامنے آئے جو قرآن وسنت سے ثابت ہو تو اس کو قبول کرنے یا اس کو مفید ومناسب سمجھنے میں ہمارے لئے کسی تردد کی گنجائش نہیں۔

دینِ اسلام عقائد، عبادات اور معاملات پر مشتمل ہے اور یہی وہ تین پہلو ہیں جو انسانی زندگی پر محیط ہیں، عقائد کی بنیاد پر تو یہ طے ہوتا ہے کہ کن باتوں کے ماننے پر آدمی دین اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے اور کن باتوں کے نہ ماننے سے خارج ہوتا ہے، اس لئے دین میں عقائد کو سب سے زیادہ بنیادی اور اولین حیثیت حاصل ہے، لہٰذا عقائد کی صحیح نوعیت اور ان کی تفصیل سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ ناواقفیت کی بنا پر کوئی مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہو جائے، عقائد میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور صفات، اس کا دینی پیغام لانے والے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کا مقام نبوت اور اس کی ضروری تفصیل، نیز خدا کی پیدا کی ہوئی غیر مرئی یعنی دکھائی نہ دینے والی عام نظروں سے مخفی مخلوق فرشتوں، اس کی اتاری ہوئی کتابوں اور یوم آخرت کے ہونے اور وہاں حساب سزا وجزا ہونے پر یقین کرنا شامل ہے۔

عقائد کو صحیح طور پر ماننے کے بعد اسے ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اپنی زندگی کو ان کے مطابق بنانا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ خالق ومعبود ہے، اس لئے اس کی عبادت فرض ہے اور چوں کہ وہ تن تنہا معبود ہے، اس لئے اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا، اس نے اپنے احکامات کو سمجھانے کیلئے رسول بھیجے اور آخر میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی بنا کر بھیجا ہے، ان کی پوری پوری اطاعت کرنا ضروری ہے۔

عقائد وعبادات کے بعد زندگی کے عام معاملات آتے ہیں، ان میں بھی خدا تعالیٰ کے احکامات جن کی وضاحت اس کے رسول نے کی ہے، ان کی تعمیل واجب ہے۔

مذکورہ بالا اشاروں کی بنیاد پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سب باتیں تفصیلات رکھتی

ہیں جن کو جاننا ایک اطاعت شعار مسلمان کیلئے ضروری ہے، خدا کا فضل وکرم ہے کہ یہ سب تفصیلات کتابوں میں اچھی طرح بیان کی گئی ہیں اور کوئی کمی باقی نہیں رکھی گئی ہے، لیکن کتابیں طول وطویل اور مفصل ہیں اور بنیادی طور پر زیادہ عربی زبان میں ہیں، جن سے استفادہ کیلئے اچھی عربی دانی کی بھی ضرورت ہے اور خاصا وقت وتوجہ بھی درکار ہے، جو ہر شخص کیلئے آسان نہیں، اس لئے ہمارے علماء نے ہر دور میں اور ہر ملک میں یہ کوشش کی ہے کہ مختصر اور آسان کتابوں میں ان کے خلاصے اور تجارب درج کریں، تاکہ ان سے استفادہ آسان ہو۔

اسی سلسلہ کی ایک ضروری کوشش عزیزم مولوی سید محمد عبید اللہ نقوی اسعدی نے کی ہے، عزیزم محترم نے اولاً ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' میں تعلیم حاصل کی، پھر ''دارالعلوم دیوبند'' میں، نیز وہاں مطالعہ ومشق فتاویٰ نویسی میں مزید وقت گذارا اور اب ''جامعہ عربیہ ہتورا، ضلع باندہ'' میں فقہ وحدیث کی تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انہوں نے سلاست اور جامعیت کے ساتھ اسلام کے متعلق وہ معتبر اور بنیادی معلومات جمع کی ہیں جن سے واقفیت کی ضرورت ہر فرزند کو ہے اور جن کے نہ جاننے سے دین اسلام کے خد وخال کو سمجھنے میں نقص پیدا ہوتا ہے۔

میں نے کتاب کے بعض اجزاء دیکھے، مجھے خوشی ہوئی کہ ایک بہت ضروری کام نہایت سلیقہ مندی اور معتبر طریقہ سے انجام پایا ہے، مصنف کا انداز بیان اور مطالب کی توضیح سب نہایت موزوں ہے۔

کتاب کے بعض ابواب مثلاً حسب ذیل ہیں:

ایمان کیا؟ توحید، وحی، آسمانی کتابیں، فرشتے، نبوت ورسالت، چند مشہور انبیاء، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلو، حضورؐ کے خصائص، حضورؐ کے معجزات، حضورؐ کی پیشین گوئیاں، امہات المومنین واولاد واعزہ کا پورا تعارف، حضورؐ کے صحابہ، خلفاء

اربعہ، صحابیات، آخرت، علامات قیامت، برزخ، جنت، جہنم، علم کی فضیلت واہمیت، تمام علوم دینیہ کا اصولی وضروری تعارف اور مشہور کتابیں ومشہور مصنفین کے حالات، اعجاز قرآن، قرآن کی جمع وترتیب، حدیث کی تدوین، حجیت حدیث، ائمہ اربعہ اور ماتریدیہ واشاعرہ کا تعارف، دوسرے علوم وفنون، اسلام میں حکومت کی حیثیت اور اہم اسلامی حکومتوں کا ضروری تعارف، اسلام کا عائلی ومعاشرتی نظام، اسلامی مساوات، اسلام میں عورت کا مقام، اسلام کی بنیادی ارکان، اسلامی قوانین کی بنیادیں۔

عزیز مصنف ایک علمی اور دعوتی خاندان کے فرد ہیں جس کا طرۂ امتیاز صحت عقیدہ اور عزیمت عقیدہ اور عزیمت وصلاح رہا ہے، لہٰذا یہ تعجب کی بات نہیں کہ اسی خاندان کے ایک فرد کی کوشش سے ''جامع ومکمل دین اسلام'' کی ضروری اور مفید معلومات ایک کتاب میں آسان اور سلیس زبان میں جمع ہوں، جن سے طالبین کی ضرورت رفع ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے اور یہ دین کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

خاکسار
محمد رابع حسنی
تکیہ کلاں، رائے بریلی
۲۰/ شعبان ۱۴۰۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مؤلف

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم أما بعد

شوال ۱۳۹۷ھ کی آخری تاریخوں سے احقر کو ''جامعہ عربیہ ہتورا، ضلع باندہ'' کے احاطہ میں اور سیدی وسندی مرشدی ومولائی حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحبؒ کے زیر سایہ رہنے اور خدمت تدریس کی انجام دہی کی سعادت حاصل ہے۔

غالباً اسی سال کے اواخر کی بات ہے کہ ''محترم مولانا اسرار الحق صاحب مالک اسلامیہ بک ڈپو، طلاق محل، کانپور'' کی ہتورا تشریف آوری ہوئی اور ایک سلسلۂ گفتگو میں انہوں نے اپنی اس دیرینہ خواہش کا اظہار کیا کہ کوئی کتاب ایسی ترتیب دی جائے جس میں اسلام واسلامیات (جس کو آج کی زبان میں ''اسلامی ثقافت'' کہہ سکتے ہیں) سے متعلق زائد سے زائد ضروری معلومات جمع ہوں اور اس انداز پر کہ اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ آسان ہو، ہو سکے تو تم ہی اس کام کو کرو، اس وقت تو ان کو حسب موقع جواب دے دیا گیا، مگر ذہن نے ان کی اس تجویز کو قبول کر کے کام کرنا شروع کیا اور ابتدائی مرحلہ میں عناوین کا خاکہ تیار کرنے لگا، جو جلد ہی ذہن سے کاغذ پر منتقل ہو گیا اور اس کو موصوف کی خدمت میں پیش کر کے معلوم کیا گیا کہ اسی انداز پر کام کرانا مقصود ہے؟ جواب: اثبات میں ملا۔

اس کے بعد کام شروع کیا گیا، کام کے دوران مزید عناوین ذہن میں آتے رہے اور فہرست میں بڑھتے رہے، بعض کو چھوڑا بھی گیا، حتیٰ کہ اخیر میں بوقت تکمیل فہرست سو سے زائد عناوین مضامین پر مشتمل تھی۔

کام بتدریج ہوتا رہا، پہلے رف پر کیا گیا، پھر تبیض ہوئی، درمیان میں اپنے اصل مشاغل اور بعض دوسری مصروفیات کی وجہ سے توقف بھی ہوتا رہا، حتی کہ گذشتہ سال یعنی

۱۴۰۲ھ کے اوائل میں اللہ کے فضل وکرم سے تبییض مکمل ہوئی اور چونکہ ابھی آگے کے مراحل کی نوبت آنے میں دیر تھی، اس لے استناد واعتماد کی غرض سے اس مجموعہ مضامین کو حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدت فیوضہم کی خدمت میں پیش کیا، جو احقر کے ہی استاذ نہیں بلکہ ان کے اہل خاندان کی تقریباً دوصدیوں سے میرے خاندان پر مشفقانہ و مربیانہ نظر رہی ہے، انہوں نے اپنے بے انتہا مشاغل کے باوجود وقت نکال کر اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے عالی سے مطلع کیا، پھر اپنے ایک دوسرے مشفق استاذ اور دار العلوم ندوہ کے دور طالب علمی کے مربی مولانا شمس الحق صاحب ندوی کی خدمت میں پیش کیا اور انہوں نے بھی سرسری نظر سے اچھے خاصے مضامین کو دیکھا اور لفظی اصلاح کے مشوروں سے نوازا، بہرحال اب یہ حقیر کاوش اور ناچیز کوشش کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

فہرست مضامین سے ہی مضامین کا تنوع ظاہر ہے جو بڑی تعداد میں کتابوں کی چھان بین اور وافر معلومات کا مقتضی ہے اور حق بھی یہی تھا، مگر کام کا بیڑہ اٹھا لیا گیا اور حالات کے اعتبار سے نہ یہ ممکن تھا اور نہ اس کا موقع تھا تاہم اپنی بساط بھر ہر مضمون کے تحت موضوع کے مناسب زیادہ سے زیادہ اور ساتھ ہی مفید ومستند معلومات جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے اور الحمد للہ حسب موقع کتابوں سے استفادہ میں کمی نہیں کی گئی ہے، کتاب کے معیار کے پیش نظر مضامین کے تحت حوالہ جات کے ذکر کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے؛ تاہم یہاں ان کی مختصر سی فہرست ذکر کی جا رہی ہے۔

اس فہرست میں علوم دینیہ یعنی تفسیر واصول تفسیر، حدیث واصول حدیث، فقہ واصول فقہ اور کلام کی اہم ومشہور ومعتمد کتب کے علاوہ خواہ وہ عربی میں ہوں یا اُردو میں، سیرت نبویہ کی کافی کتابیں شامل ہیں، جن میں ''زاد المعاد''، ''سیرت ابن ہشام''، ''سیرت ابن قتیبہ'' بھی ہے، نیز ''علم جدید کا چیلنج''، ''آلات جدیدہ کے شرعی احکام''، ''اختلاف ائمہ''،

"تاریخ المذاہب الاسلامیہ" (محمد ابوزہرہ)، "عقیدۃ المسلم" (محمد الغزالی)، "العقائد" (حسن البنا)، "المرأۃ بین الفقہ والقانون" (السباعی)، "اقتضاء الصراط المستقیم" (ابن تیمیہ)، "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" (السباعی)، "التفسیر والمفسرون" (محمد حسین ذہبی)، "عورت اور اسلام" (مفتی سعید)، "نظام قرآن نمبر" (کانپور)، "تاریخ اسلام" (شاہ معین الدین)، "ہماری بادشاہی" (عبدالسلام قدوائی)، "دین وشریعت اور اسلام کیا ہے؟" (محمد منظور نعمانی)، "مسلم پرسنل لا" (شمس تبریز)، "خلفاء راشدین" (عبدالشکور فاروقی)، "حج ومقامات حج" (محمد رابع ندوی)، "مختصر عالمی تاریخ" (عثمان اعظمی)، "مختصر تاریخ ہند" ()، "اسلام کیا ہے اور اسلامی فکر کیا ہے؟" (فارقلیط، آزاد محمد میاں)، "مرنے کے بعد کیا ہوگا" (عاشق الٰہی میرٹھی)، "سیر الصحابیات" (مولانا ابوظفر ندوی)، وغیرہ، بعض کتابیں ذہن میں رو بھی نہیں گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں اسلامی ثقافت کے موضوع پر دو اہم عربی کتابوں نے بہت فائدہ پہنچایا "معالم الثقافۃ الاسلامیۃ" (عبدالکریم عثمان) اور "لمحات فی الثقافۃ الاسلامیۃ" (عمر عودۃ الخطیب) اور ان میں بھی دوسری نے، یہ دونوں کتابیں بیسوں کتابوں کا نچوڑ ہیں، ان سے مواد بھی ملا اور عناوین ومضامین کے لئے رہنمائی بھی۔

کتابوں سے استفادہ کے علاوہ راقم سطور کی زندگی بچپن سے آج تک الحمدللہ جس ماحول میں گذرری ہے، اس کی بنا پر جو معلومات اور اکابر کے افادات ذہن یا تحریر میں موجود ہیں، ان سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اور پوری کتاب درج ذیل امور کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے:

۱- موضوع کتاب سے متعلق زائد سے زائد مضامین ہوں۔

۲- مضامین حسب موقع تین صفحات سے لے کر حد سے حد پانچ چھ صفحہ تک ہوں۔

۳- ہر مضمون میں موضوع کے تحت زائد سے زائد ومعتمد ضروری معلومات کا ذکر

واحاطہ۔

۴- اسلوب وانداز تحریر ہلکے سے ہلکا اور سہل سے سہل؛ تاکہ کتاب بیک وقت مختلف طبقات کیلئے علمی افادہ ودلچسپی کی حامل ہو، متوسط درجہ کے پڑھے لکھے اسلامی معلومات کا شوق رکھنے والے مسلمانوں کے لئے بھی اور اسکولوں وکالجوں کے مسلمان طلباء جو اسلامی ثقافت کے عنوان کے تحت اپنے نصاب میں کچھ نہ کچھ پڑھتے ہیں، یا ان کو اس سلسلہ میں معلومات کے حاصل کرنے سے دلچسپی رہتی ہے، نیز ہمارے دینی وعربی مدارس کے طلباء کے حق میں بھی، جو عموماً اس انداز کی بہت سی معلومات سے ناواقف ہوتے ہیں اور ان کے جاننے یا پڑھنے سے ان کو دلچسپی نہیں ہوتی، یا دلچسپی ہوتی ہے تو موقع یا کم از کم اس انداز کی کتابیں میسر نہیں ہوتیں، طلباء کیلئے یہ کتاب معلومات کے بڑھانے کے حق میں تو ان شاء اللہ مفید ہوگی ہی، ساتھ ہی تقریری مشق کے لئے انہیں جس انداز کے مضامین کی ضرورت وتلاش ہوتی ہے، اس کیلئے بھی۔

اخیر میں یہ تحریر کرنا بھی ضروری ہے کہ مؤلف کتاب ایک ناپختہ اور نومشق طالب علم ہے، جسے پڑھنے سے زیادہ لکھنے لکھانے کا خبط ہے، اسی جذبہ نے ایسے موضوع پر اس کو لگا دیا، جب کہ وہ کسی اعتبار سے نہ اہل تھا اور نہ حق ادا کرسکتا تھا، دینی واسلامی معلومات ہی وافر وزیادہ پختہ نہیں ہیں، چہ جائیکہ ثقافت سے متعلق دوسرے پہلوؤں کی بابت اسلام یا مسلمانوں کی ترجمانی کرسکے، اس لئے بہت امکان ہے؛ بلکہ عین ممکن ہے کہ ایک دو مقام پر نہیں بلکہ متعدد مقامات پر اپنی احتیاط وفکر کے باوجود طالب علمانہ نقص وعدم پختگی کی بنا پر کمزوریاں وخامیاں اور اہم غلطیاں واقع ہوگئی ہوں، ایسے موقع سے مطلع کرنے والے اس دار فانی میں شکریہ اور ان شاء اللہ آخرت میں جزائے خیر کے مستحق قرار پائیں گے۔

احقر ناشر صاحب کا شکر گذار ہے، جن کی تحریک اس کتاب کی ترتیب کا باعث بنی اور

جن کے شوق وشغف کی وجہ سے یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے اور اپنے ان دونوں مشفق اساتذہ کرام کا جنہوں نے اپنے مشاغل ومصروفیات کے باوجود اپنی کمال شفقت ومربیانہ عنایت کی بنا پر مسودہ کو ملاحظہ فرما کر ہمت افزائی فرمائی اور نہ صرف بلکہ کتاب ومؤلف کے حق میں گراں قدر تعارف وعلمی مقدمہ سے نوازا۔

اس ضمن میں اپنے برادر خورد عزیزی مولوی سعید حسن ندوی (حال مقیم متعلم جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ثقافت والی دونوں کتابوں سے استفادہ محض انہیں کی وجہ سے ممکن ہوا، میری تحریری وتالیفی کاوشوں سے مجھ سے زیادہ ہی انکو دلچسپی ہے، انہوں نے اس کاوش کے آغاز کا علم ہونے پر سعودیہ سے گرانقدر مصارف کے ساتھ دونوں کتابیں مجھ تک پہنچائیں۔

وہ تمام حضرات بھی شکریہ کے مستحق ہیں جن سے اس کتاب کے حق میں کسی قسم کی مدد ملی ہے، خواہ علمی مشورے کے طور پر یا عملی کسی کاوش کے طور پر، جن مؤلفین کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے وہ بھی شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں اور وہ احاطہ اور احاطہ کے روح رواں کہ جن کے زیر سایہ زندگی سعادتوں کے ساتھ گذر رہی ہے وہ بھی مستحق دعاء ہیں کہ اس احاطہ میں رہتے ہوئے کسی کام کی انجام دہی بغیر احاطہ کی برکت اور صاحب احاطہ کی نظر عنایت کے نہیں ہوتی۔

اور یہ سارے جذبات دعاء وتشکر کا منبع وسرچشمہ اس ذات والا صفات کا فضل وکرم اور عنایتیں ہیں کہ جس کے ادنیٰ سے اشارہ وارادہ کے بغیر کسی ذرہ کو بھی حرکت نہیں۔

فالحمد للہ اوّلاً وآخراً حق تعالیٰ شرف قبولیت سے نواز کر زیادہ سے زیادہ افادہ اور آخرت میں سرخروئی کا ذریعہ بنائے، فقط

العبد محمد عبید اللہ الأسعدي غفرلہ
جامعہ عربیہ ہتورا، ضلع باندہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلاۃ والسلام علی المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

ایمان کیا ہے؟

''ایمان'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں ''یقین کرنا، تصدیق کرنا، دل سے کسی بات کو مان لینا''، اسی طرح ''اسلام'' بھی عربی زبان کا ہی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں ''اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینا، اس کے سامنے ڈال دینا''۔

شریعت میں ایمان کا مطلب ہے ''دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام باتوں میں تصدیق کرنا جو دین کی بابت آپ ﷺ سے بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت ہوں اور ضرورت یا مطالبہ پر زبان سے اس کا اقرار واظہار بھی کرنا''، یعنی اگر دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نہ مانا جائے تو آدمی مسلمان نہیں ہو سکتا، اگرچہ زبان سے آپ ﷺ کے سچا ہونے کا کتنا ہی اقرار کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے منافقین یعنی وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے تو آپ ﷺ کو سچا اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، لیکن دل سے ہرگز اس کے قائل نہ تھے، اسی لئے وہ در پردہ کافروں سے ملے ہوئے تھے، اُن سے ظاہری معاملہ تو مسلمانوں جیسا کیا گیا، لیکن آخرت کے حق میں انہیں مسلمان نہیں قرار دیا گیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص دل سے آپ ﷺ کی سچائی کا معترف ہو، مگر ضرورت و مطالبہ کے باوجود زبان سے اقرار واعلان نہ کرے تو وہ بھی مسلمان نہیں کہلائے گا، جیسے کہ بہت سے کفار مکہ اور بہت سے یہودی وعیسائی تھے کہ دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل تھے، اس لئے کہ آپ ﷺ کے متعلق انہوں نے کبھی جھوٹ کا تجربہ

نہیں کیا تھا اور یہودی وعیسائی اپنی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر پڑھتے تھے، لیکن دنیاوی مصالح کے تحت زبان سے اعتراف نہیں کرتے تھے۔

شرعاً "اسلام وایمان" کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام یعنی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردینے کا مطلب یہی ہے کہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجے جائیں، ان کو بے چون وچرا مان لیا جائے اور ان کے سامنے اپنے آپ کو سپر انداز کردیا جائے۔

"مومن ومسلم" ہونے کیلئے بنیادی طور پر جن چیزوں کا یقین کرنا ضروری ہے اُن کا ذکر اس کلمہ میں ہے جسے "ایمان مفصل" کہتے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلَائِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ	ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر
وَ رُسُلِہٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْقَدْرِ	اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں اور
خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی	آخرت کے دن پر اور تقدیر پر بھلی ہو یا بری
وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ	سب اللہ کی جانب سے ہے اور موت کے
....	بعد دوبارہ زندہ کئے جانے پر۔

یعنی کل سات چیزیں ہیں، جب تک انسان انہیں نبی کے بتائے ہوئے انداز پر نہ مانے مسلمان نہیں قرار پائے گا، لیکن انہیں میں انحصار نہیں، جو چیز بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت ہو اس کا بھی دل سے یقین ضروری ہے، اس کے بغیر ایمان نہیں پایا جائے گا، البتہ مذکورہ ساتوں چیزیں بنیادی امور ہیں۔

"ایمان" ایک انسان کیلئے اسی درجہ ضروری چیز ہے جس درجہ اِس کے جینے کیلئے غذا اور پانی وہوا کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے کہ انسان کی روح کو جِلا ایمان سے ہی ملتی ہے اور اس کو ترقی وصحت ایمان کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے، روئے زمین پر ایمان سے بڑھ کر قوت والی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی فرد ومعاشرہ کی اصلاح، ضمیر کی بیداری، اخلاق کی عمدگی و

پختگی، ایک صالح معاشرہ کی تشکیل، خیر وطاعات پر باہمی تعاون کی مکمل ذمہ داری ایمان کے علاوہ کوئی چیز لے سکتی ہے، اس لئے کہ انسان کا ڈرائیور اس کا باطن ہوتا ہے اور وہی ایمان کا مرکز ومحل ہے، کیسے ہی قومی وجماعتی نظام بنائے جائیں اور کیسی ہی حکومتیں وکمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو کہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر افراد ومعاشرہ کے اخلاق واعمال کی نگرانی کرتی ہوں، اگر عقیدۂ ایمان ان کی پشت پر نہ ہو تو محض یہ چیزیں ہرگز ہرگز ایک صالح معاشرہ اور فرد کی قابل قدر وذمہ دار ودیانتدار زندگی کو وجود نہیں دے سکتیں، نظام جرم وسزا اور اخلاقی ومعاشرتی گرفت کا خوف وخیال ضرور ہوتا ہے، مگر اسی وقت تک جب تک کہ جرم کرنے کے بعد گرفت سے بچ نکلنے کی کوئی صورت سامنے نہ ہو اور جہاں ایسی صورتیں وتدبیریں سامنے آئیں تو ان کا بھی پاس ولحاظ نہیں رہ جاتا ہے، ایمان ہی سے فرد ومعاشرہ اور ملک وملت کی تعمیر وتکمیل ہوتی ہے اور اس کے نہ ہونے سے ہر ایک فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے، ایمان ہی راہ اعتدال ہے اور یہی بھائی چارگی اور ایک دوسرے پر لطف ورحم کے جذبہ کا منبع اور بڑے بڑے سے مصائب ومشکلات کا حقیقی حل وعلاج ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی	پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی
فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ	ہدایت پہنچے تو جو شخص میری اس ہدایت کی
وَ لَا یَشْقٰی وَ مَنْ اَعْرَضَ	اتباع کرے گا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی ہو
عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً	گا اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض
ضَنْکًا وَ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ	کرے گا تو اس کیلئے تنگی کا جینا ہوگا اور
اَعْمٰی ————————	قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کرکے
	اٹھائیں گے۔

توحید

"توحید" کے لفظی معنی ہیں ایک قرار دینا اور ایک ماننا و بتانا، شریعت میں اس کا مطلب ہے: اس بات کا اقرار کہ ساری کائنات اور پورے عالم کے تمام انتظامات و معاملات کا دیکھنے والا اور نگرانی کرنے والا صرف ایک اور تن تنہا ہے، اس کے کسی معاملہ میں اور کسی مرحلہ میں کوئی شریک اور معین و مددگار نہیں، اسی نے تن تنہا عالم کے ذرہ ذرہ کو پیدا کیا اور وہی تن تنہا سارے نظام کو چلا رہا ہے، کھلانا، پلانا، مارنا و جلانا، بارش و قحط، غمی و خوشی مصیبت و راحت، بیماری و صحت، غربت و دولت سب اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ اس وقت بھی تھا جبکہ اس عالم میں کوئی چیز نہ تھی اور اس وقت بھی رہے گا جب کہ سارا عالم تباہ و برباد ہو جائے گا اور ایک بھی جاندار سانس لیتا باقی نہ رہے گا۔

نہ تو اس کی ذات میں اس کا کوئی شریک ہے کہ جس کے ساتھ مل کر وہ خدائی کے مرتبہ و منصب پر فائز ہو، نہ اس کی صفات میں کوئی اس کا شریک ہے کہ جو صفات اس کے اندر پائی جاتی ہیں، اس شریک میں بھی پائی جاتی ہوں اور نہ اس کی عبادت میں کوئی شریک ہے کہ اس کی طرح وہ بھی مستحق پرستش و عبادت ہو اور نہ اس کے افعال میں کوئی شریک ہے کہ جو اس کے جیسے کام کرتا ہو، کسی چیز میں اس کا کوئی ہمسر و نظیر نہیں ہے۔

دنیا کی ساری خوبیاں اسی کو زیبا اور اسی میں جمع ہیں اور وہ ہر برائی سے پاک ہے، ہر کمال کے ساتھ متصف اور ہر نقص و کمی سے دور ہے، اسی لئے تمام تعریفوں کی مستحق اسی کی ذات ہے، یہی وجہ ہے کہ جگہ بجگہ، موقع بموقع اس کیلئے الحمد للہ (تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں) سبحان اللہ (اللہ تمام نقائص و عیوب سے پاک و دور ہے) ماشاء اللہ (اللہ نے جو چاہا ہوا) ان شاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا تو ہوگا) وغیرہ جیسے کلمات کہے جاتے ہیں اور ظاہر ہے

کہ عبادت کے لائق ایسی ہی کوئی ذات ہو سکتی ہے، اسی لئے اس کے علاوہ کسی کو بھی مستحق عبادت اور لائق پرستش نہیں سمجھا گیا اور ہر زمانہ میں اعلان کیا گیا: "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں) یہ کلمہ ہر دور میں اہل ایمان کا شعار رہا ہے۔

اس ذات عالی کا وجود ایسی چیز ہے کہ اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، ساری کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ اس کے وجود و کمال اور وحدانیت پر شاہد ہے، چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے جگہ بجگہ اپنی توحید کو ثابت کرنے و بتانے کیلئے اپنی مخلوقات کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ———

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ، وہ ذات پاک ایسی ہے کہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردۂ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے۔

ایک موقع پر ارشاد ہے:

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ

اور جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق ہے وہ تو ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، رحمٰن ہے رحیم ہے، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات و دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں

اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَ تَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ـــــــــــ

کی نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تازہ کیا اس کے خشک ہوتے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو آسمان وزمین کے درمیان مقید رہتا ہے دلائل ہیں ان لوگوں کیلئے جو عقل رکھتے ہیں۔

اہل علم وعقل نے بھی انہیں چیزوں سے اس کے وجود وحدانیت پر استدلال کیا ہے، کسی نے کہا کہ: ''جب ایک کشتی کسی صناع وملاح کے بغیر نہیں بنتی وچلتی تو یہ ساری کائنات کا وجود خود بخود کیسے ہوسکتا ہے اور اس کا نظم خود بخود کیسے چل سکتا ہے''، کسی نے کہا کہ: '' شہتوت کی پتی کو بکری کھا کر مینگنی بنائے، ہرن کھا کر مشک بنائے، ریشم کا کیڑا کھا کر ریشم کا دھاگہ تیار کرے، یہ کسی ان دیکھی قوت کے وجود کی دلیل ہے''، کسی نے کہا: ''اتنے لمبے چوڑے آسمان کا بے ستون اپنی جگہ پر قائم رہنا اور انڈے میں ایک جاندار کا وجود پانا، زندہ رہنا اور وقت مقررہ پر اسے توڑ کر باہر نکلنا اس کے وجود ووحدانیت کی دلیل ہے''، اور اس تجرباتی ومشاہداتی دور یعنی سائنس کے زمانہ میں ممتاز اہل علم وفکر اپنی سالہا سال کی تحقیقات کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں، چنانچہ ایک امریکی عالم حیوانات لکھتا ہے:

''غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے، کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہوسکتی، یقیناً وہ ایک محرک اوّل یعنی خالق اور خدا کی محتاج ہے''۔

ایک دوسرا امریکی عالم طبیعات ''جارج ارل'' لکھتا ہے:

''اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا (کہ وہ تمام مخلوقات کے فطری احوال سے جدا احوال رکھے گا) اور مادی بھی (کہ مادی اشیاء سے بنا ہوا ہوگا) میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزء نہیں بلکہ اس کا فرماں روا اور ناظم و مدبر ہے''۔

فرشتے

''فرشتے'' اللہ کی انتہائی مقرب و پاکیزہ مخلوق ہیں، عربی میں ان کے لئے لفظ ''ملائکہ'' بولا جاتا ہے، ان کے حق میں اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اس نام کی ایک شے دنیا میں پائی جاتی ہے لیکن اس کی کیا حقیقت ہے مختلف نظریات ہیں، مثلاً قدیم فلاسفہ کہتے ہیں کہ: ''ان کے لئے جسم نہیں ہوتا، لیکن ان میں دوسری چیزوں پر اثر ڈالنے کی صلاحیت ہے''، عیسائیوں کا کہنا ہے کہ: ''نیک لوگوں کی ارواح موت کے بعد جسم سے جدا ہو جانے کی حالت میں ''فرشتہ'' کہلاتی ہیں''۔

اہل سنت و جماعت مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ: ''فرشتے اللہ کی مخلوقات میں سے ہیں، اللہ نے ان کو ''نور'' سے پیدا فرمایا اور ان کے اندر نام کو بھی برائی کا کوئی جذبہ نہیں رکھا ہے اور نہ ہی کھانے پینے وغیرہ کا کوئی تقاضا ان میں رکھا ہے، ان کو ایسے جسم دیے ہیں جو عام طور سے نظر نہیں آتے اور مختلف شکل و صورت اختیار کر سکتے ہیں، اگرچہ ہر فرشتے کی اپنی ایک جداگانہ شکل و صورت ہے اور ایسی کہ اس کے دیکھنے کا کوئی انسان اپنے اندر تحمل نہیں رکھتا اور نہ ہی ان کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ کر سکتا ہے، حضرت جبرئیل کے متعلق منقول ہے کہ چھ سو بازو ہیں اور دو ہی سارے افق کا چھا لیتے ہیں، عرش باری کو اٹھانے والے فرشتوں کے متعلق منقول ہے کہ ان کے پیروں اور کولھوں کے درمیان ایسے ہی فاصلہ ہے جیسے کہ آسمان و زمین کے درمیان اور کان کی لو سے لے کر کندھوں تک بھی تقریباً اتنا ہی فاصلہ ہے۔

تمام فرشتوں میں سب سے افضل چار ہیں: حضرت جبرئیل، میکائیل، عزائیل، اسرافیل، یہ چاروں انبیاء کے بعد تمام انسانوں سے بھی افضل ہیں، حضرت جبرئیل وحی کے میکائیل روزی کے، عزائیل موت کے اور اسرافیل صور پھونکنے کے ذمہ دار ہیں۔

بنیادی طور پر فرشتوں کی دو جماعتیں ہیں: ایک جماعت کا کام ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف اور حمد و ثناء میں مشغول رہنا ہے اور دوسری جماعت اللہ کے حکم سے دنیا کے انتظام و انصرام کو دیکھتی ہے، تعداد ان کی اتنی زیادہ ہے کہ انسان شمار نہیں کر سکتے، اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک حدیث پاک میں ہے کہ: ''آسمان پر چار انگل جگہ بھی ایسی نہیں کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ وہاں اللہ کی تعریف و عبادت میں مشغول نہ ہو، خواہ کھڑا ہو یا رکوع و سجدے میں ہو''، نیز یہ کہ ساتویں آسمان پر ''البیت المعمور'' نامی جو عمارت ''بیت اللہ'' کے ٹھیک اوپر ہے اس کے متعلق آتا ہے کہ: ''اس عمارت میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور پھر دوبارہ ان کو اس میں داخلہ نصیب نہیں ہوتا''، نیز ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ''بارش کے ہر قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ اترتا ہے اور اس قطرہ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس جگہ رکھتا ہے''۔

دنیا کے نظم و نسق کو دیکھنے و چلانے کی مختلف ٹکڑیاں ہیں مثلاً: ۱-وحی لانے والے فرشتے ۲-روح نکالنے والے فرشتے جن کو ملک الموت کہتے ہیں ۳-بادلوں کو ہنکانے اور پانی برسانے والے فرشتے ۴-ہوا کا نظم و انتظام کرنے والے ۵-کراماً کاتبین وہ فرشتے جن میں سے ایک ہر انسان کے داہنے اور دوسرا بائیں کندھے پر سوار رہتا ہے، داہنے کندھے والا اس کے اچھے اعمال اور دوسرا اس کے برے اعمال لکھتا ہے ۶-وہ فرشتے جو دس دس کی تعداد میں ہر ایک انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کی جنگل کے درندوں، موذی جانوروں اور شیاطین سے حفاظت کرتے ہیں اور ہر چہار طرف سے اس کو گھیرے رہتے ہیں، نیز اس کے بعض اعضاء کی خصوصی نگرانی رکھتے ہیں ۷-حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی قبر مبارک سے دور رہنے والوں کے درود و سلام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے والے ۸-قبر میں مردہ سے سوال کرنے والے ۹-قبر میں عذاب دینے والے۔

وحی

''وحی'' اس خبر کو کہتے ہیں جو ایسے پوشیدہ طریقوں سے حاصل ہوتی ہے جس کا علم اس شخص کے علاوہ جس کے پاس وہ خبر آتی ہے کسی کو نہیں ہوتا۔

وحی کی دو قسمیں ہیں: ایک وحی الہام، دوسری وحی نبوت، ''الہام'' کا مطلب ہے اللہ کی جانب سے دل میں کسی بات کا ڈالا جانا، یہ معاملہ انبیاء کے ساتھ نبوت سے پہلے اور ان کے علاوہ دوسرے مومنین کے ساتھ بھی ہوتا رہتا ہے، عموماً مخصوص بندوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس وحی کے ذریعہ شریعت کا کوئی حکم نہیں دیا جاتا؛ البتہ دنیوی یا دینی مصالح کے تحت کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا خیال دل میں جما دیا جاتا ہے کہ یا کسی چیز کی بھلائی یا برائی دل میں بٹھا دی جاتی ہے۔

وحی نبوت انبیاء اور رسولوں کے ساتھ خاص ہے، اس سے مراد وہ آسمانی خبریں ہیں جو اللہ کی جانب سے حضرات انبیاء تک آتی ہیں اور ان میں غلط و صحیح عقائد کا ذکر، صحیح عقائد کے اختیار کرنے کا مطالبہ، کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم، اس کے کرنے کے فوائد، نہ کرنے کے نقصانات، ان کو اپنا کر فائدہ حاصل کرنے والوں اور انہیں ترک کرنے کے نیز ان کی مخالفت کی بنا پر نقصان اٹھانے والوں کا ذکر ہوتا ہے اور عبرتیں و نصیحتیں ہوتی ہیں، ہر نبی کے پاس اس قسم کی خبروں کا آنا ضروری ہے۔

البتہ اس کی ایک ہی صورت نہیں ہوتی، علماء محققین نے سات صورتیں ذکر کی ہیں: اول: اللہ تعالیٰ کا براہ راست خطاب، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج کے موقع پر ہوئی۔ دوم: اللہ تعالیٰ کا دل میں کسی بات کا ڈالنا۔ سوم: سچے خواب، اور انبیاء کا ہر خواب سچا ہی ہوتا ہے۔ چہارم: فرشتے کا آنا، اور

انسانی شکل و صورت میں ظاہر ہو کر خبر پہنچانا۔ پنجم: فرشتے کا انسانی شکل میں ظاہر ہوئے بغیر نبی کو اپنا مخاطب بنانا۔ ششم: فرشتے کا اپنی شکل و صورت میں آنا۔ ہفتم: فرشتے کا نبی کے دل میں کسی بات کا ڈالنا، ان میں پانچویں صورت انبیاء کے لئے نہایت مشقت کی ہوتی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق منقول ہے کہ سخت سردی میں بھی آپ کی پیشانی سے پسینہ چھوٹنے لگتا تھا، اور اگر آپ سواری پر ہوتے تو سواری کا کھڑا ہونا دشوار ہوتا تھا۔

ایسے مخفی طریقوں سے خبر کے حاصل ہونے کو عقل و سائنس دونوں بظاہر تسلیم نہیں کرتے، عقل اس لئے کہ یہ صورتیں نامانوس ہیں اور سائنس اس لئے کہ وہ ہر چیز کی بنیاد مشاہدہ و تجربہ پر رکھتی ہے، لیکن تحقیقات نے محققین اہل عقل و سائنس دانوں کی رسائی بعض ایسی چیزوں تک کر دی ہے کہ وہ مجبوراً اس کی صحت کی تسلیم کرتے ہیں۔

آج کی تجرباتی دنیا نے حصول علم کی بہت سی ایسی صورتیں انسانوں کے سامنے رکھ دی ہیں کہ ان کے پیش نظر کسی انسان کے پاس آسمان سے مخفی طریقہ پر خبر آنا اپنے اندر کوئی تعجب نہیں رکھتا۔

اب بکثرت ایسے آلات وجود میں آچکے ہیں جو چند فرلانگ، چند گز، بلکہ چند انگل بلکہ نہایت قریب سے نہ سنی جا سکنے والی آواز کو سمندروں، دریاؤں، جنگلات و پہاڑوں کو پار کر کے ہزاروں میل کی دوری تک اس طرح پہنچاتے اور سناتے ہیں کہ گویا کہ بات کرنے والا سامنے بیٹھا ہے اور مکھی جس کے چلنے کی آواز کوئی انسان عام حالات و حواس میں نہیں سن سکتا، اس کے چلنے کی آواز ایسے ہی سنتا و محسوس کرتا ہے گویا کہ وہ کان کے پردے پر رینگ رہی ہو، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ میں سب یہی تو کرشمے ہیں۔

اور مشینوں پر کیا بس ہے، جانداروں میں سننے و احساس کی صلاحیتیں اعلیٰ درجہ کی رکھی گئی ہیں، کتے کو دیکھئے کہ کس طرح سونگھ کر مجرم کی شناخت کرتا ہے، پتنگوں کی ایک خاص

قسم کی مادہ کو کھلی فضا میں رکھ دیجئے وہ مخصوص اشارے کرے گی، یہ اشارے اسی نوع کے نر پتنگے حیرت انگیز فاصلے سے سنیں گے اور محسوس کرلیں گے اور اس کا جواب دیں گے۔ جھینگر اپنے پیر یا پر ایک دوسرے پر رگڑتا ہے، رات کے سناٹے میں آدھے میل دور تک یہ آواز سنائی دیتی ہے، یہ اسی طرح اپنے جوڑے کے بلاتا ہے، اس کی مادہ جو بظاہر بالکل خاموش ہوتی ہے مگر پراسرار طریقے پر کوئی ایسا بے آواز جواب دیتی ہے جو نر تک پہنچ جاتا ہے اور نر اس جواب کو جسے بڑی سی بڑی حس رکھنے والا نہیں سن سکتا، سن لیتا ہے اور ٹھیک مادہ کی سمت میں روانہ ہو کر اس سے جاملتا ہے، اہل سائنس نے جانوروں سے متعلق اس قسم کے تجربات کو وحی کی صداقت کے لئے دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے۔

ایک عام چیز جس سے پوشیدہ ذرائع سے حاصل ہونے والے علم واحساس کو سمجھا جا سکتا ہے، ہمارے خواب ہیں، کم ہی لوگ ایسے ملیں گے جو خواب نہ دیکھتے ہوں اور ان میں آدمی کیا کیا نہیں دیکھتا، کیا کیا نہیں کرتا، مگر پاس میں بیٹھنے وسونے والا خواہ کتنی بیدار حس کا مالک ہو اسے ہرگز ان چیزوں کا علم واحساس نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔

آسمانی کتابیں

بعض مرتبہ انبیاء تک آنے والی خبریں مجموعہ کی صورت میں بطور کتاب حاصل ہوتی ہیں، یا ڈھیرے ڈھیرے مجموعہ بن جاتی ہیں اور یکجا ہونے کی بناء پر کتاب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، ایسی کتابیں آسمانی کتابیں کہلاتی ہیں، جن کی تعداد جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ''ایک سو چار ہے''، ان میں سے پچاس صحیفے حضرت شیث علیہ السلام پر، تیس حضرت ادریس علیہ السلام پر، بیس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے، باقی چار میں سے توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور سب سے آخری کتاب قرآن مجید حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، قرآن مجید تو ہمارے سامنے ہے، توریت اور زبور وانجیل کی تعلیمات بھی کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کے متعلق حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ان میں زیادہ تر مثالوں کا ذکر ہے؛ ایک مثال میں ظالم بادشاہ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے:

> ''اے لوگوں! پر مسلط ہوجانے والے مغرور، مبتلی، میں نے تجھے حکومت اس لئے نہیں دی تھی کہ تو دنیا کے مال پر مال جمع کرتا چلا جائے، بلکہ میں نے تو تجھے اقتدار اس لئے سونپا تھا کہ تو مظلوم کی بد دعا مجھ تک نہ پہنچنے دے، کیونکہ میرا قانون یہ ہے کہ میں مظلوم کی بدعا کو رد نہیں کرتا، اگرچہ وہ کافر کی زبان سے نکلی ہو''

ایک مثال میں عام لوگوں کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے:

''عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات کے تین حصے کرے؛
ایک حصہ اپنے رب کی عبادت اور اس سے مناجات کا ہو، دوسرا حصہ

اپنے اعمال کے محاسبہ کا، اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت وصنعت میں غور وفکر کا، تیسرا حصہ اپنی ضروریات، معاش حاصل کرنے اور طبعی تقاضوں کے پورا کرنے کا۔

عقل مند آدمی پر لازم ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف رہے اور اپنے مقصود وکام میں لگا رہے، اپنی زبان کی حفاظت کرے اور جو شخص اپنے کلام کو اپنا عمل سمجھے گا اس کا کلام بہت کم صرف ضروری کاموں میں رہ جائے گا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحائف تورات میں اکثر وبیشتر عبرت آموز باتیں ہیں، مثلاً:

"مجھے تعجب ہے اس پر جسے موت کا یقین ہو اور پھر خوش ہو، مجھے تعجب ہے اس پر جو تقدیر پر یقین رکھے اور عاجز ودرماندہ ہو، غمگین ہو، مجھے تعجب ہے اس پر جو دنیا اور اس کے انقلابات اور لوگوں کے عروج و نزول کو دیکھتا ہو؛ وہ کیسے دنیا پر مطمئن ہو بیٹھتا ہے، مجھے تعجب ہے اس پر جس کو آخرت کے حساب کا یقین ہو؛ وہ کیسے عمل کو چھوڑ بیٹھتا ہے"!!

انجیل میں زیادہ تر وعظ ونصیحت کی باتیں ہیں؛ انجیل متی کی ایک دعا جو مضامین میں سورۂ فاتحہ سے بہت زیادہ قریب ہے:

"اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو، ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض؛ ہم کو معاف کر اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ برائی سے بچا"۔

ان کتب کی چند عبارات آپ آئندہ اوراق میں "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں" کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں گے۔

قرآن مجید کے علاوہ جن آسمانی کتابوں کو یہودی وعیسائی مانتے ہیں ان کے سلسلہ میں یہ تفصیل کرتے ہیں کہ کچھ کتب وصحائف ایسے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے انبیاء کے واسطے سے حاصل ہوئے ہیں یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ان کے و حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیانی عرصہ میں ہونے والے انبیاء کے ذریعہ اور کچھ کتابیں ایسی ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خصوصی احباب واصحاب پر ہونے والے الہامات کا مجموعہ ہیں، ان تمام کتابوں کے مجموعہ کو "بائبل" کہتے ہیں، جو یونانی لفظ ہے اور "کتاب" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور حضرات انبیاء کے واسطے سے ملنے والی کتابوں کے مجموعہ کو "عہد عتیق" کہتے ہیں؛ جو اکتالیس کتابوں پر مشتمل ہے، جن میں سے اڑتیس کے مجموعہ کو کچھ کے علاوہ سب مانتے ہیں، ان اڑتیس کتابوں میں تورات وزبور و دیگر بنو اسرائیل کے اہم انبیاء پر نازل ہونے والے صحائف شامل ہیں اور "تورات" بھی دراصل پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے: ۱-سِفر التکوین ۲-سِفر خروج ۳-سِفر احبار ۴-سِفر عدد ۵-سِفر استثناء، "عہد عتیق" کی کتب کے مجموعے کو "تورات" بھی کہہ دیا کرتے ہیں، "تورات" عربی لفظ ہے، جو بمعنی تعلیم وتربیت آتا ہے، جیسے کہ لفظ "زبور" کتاب کے معنی میں ہے اور "انجیل" بشارت وتعلیم کے معنی میں۔

الہامات کے مجموعے کو "عہد جدید" کہتے ہیں جو ستائیس کتابوں پر مشتمل ہے، جن میں سے سات کو سارے عیسائی نہیں مانتے اور بیس کو سب مانتے ہیں، ان میں سے چار کو "انجیل" کہا کرتے ہیں یعنی ۱-انجیل متّیٰ ۲-انجیل مَرقُس ۳-انجیل لُوقا ۴-انجیل یُوحنّا۔

اور انہیں چار کے متعلق عیسائی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھیں، جن کے جل کر ضائع ہو جانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں نے بذریعہ الہام ان کو نقل کیا۔

قرآن مجید

قرآن مجید سب سے آخری، لیکن سب سے افضل کتاب ہے اور سب سے آخری لیکن تمام انبیاء ورسل کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور یہی اسلامی تعلیمات واحکام کا اصل منبع وسرچشمہ ہے، اسلام نے اپنے متبعین کے لئے جو دستور زندگی اور ابدی نظام پیش کیا ہے اس کا اصل مخزن یہی ہے، اسی لئے کسی حال میں مسلمان کی اس سے بے تعلقی زیبا و پسندیدہ نہیں بلکہ مضر ہے، اس سے تعلق رکھ کر ہی انفرادی واجتماعی، شخصی وقومی، ظاہری وباطنی، جسمانی وروحانی، اقتصادی وانتظامی ہر قسم کی ترقیاں حاصل کی جاسکتی ہیں، اس کے الفاظ کا دیکھ کر پڑھنا، زبانی پڑھنا، اگرچہ معنی ومطلب معلوم نہ ہو اور معنی ومطلب کا سمجھنا سمجھانا، یہ سب اہم عبادات میں سے ہے اور چونکہ قرآن مجید باری تعالیٰ کا کلام ہے، اس لئے اس کا پڑھنا گویا اس سے ہی ہم کلامی کا اور بادشاہ سے ہم کلامی سے بڑا کیا شرف ہوسکتا ہے اور پھر ایسا بادشاہ جو شاہوں کا شاہ ہے۔

اس کے احکام وتعلیمات پر عمل کرنا اصل اسلام اور اصل عبادت تو ہے ہی دنیا کے ہزار فوائد کا بھی باعث ہے، رزق میں وسعت وبرکت، مال واولاد میں اضافہ، دوسروں پر رعب ودبدبہ اور حصول اقتدار وحکومت کا بھی ذریعہ ہے، اس لئے گویا مسلمان کو سرتاپا قرآن ہی ہونا چاہئے، اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب ایک موقعہ پر پوچھا گیا کہ: ''حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے''؟ تو فرمایا: ''کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن'' حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا پوچھتے ہو؛ آپ قرآن کی عملی تصویر تھے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جاننا چاہتے ہو تو قرآن پڑھو اور قرآن کو زندہ ومتحرک اور عملی جامہ میں دیکھنا چاہو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو، شاعرِ اسلام علامہ اقبالؒ نے

مسلمان کے اسی حال کو یوں بیان کیا ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

دنیاوی عزت ووجاہت کی تلاش اور اس کی بقا کے لئے بھی اس سے تعلق ضروری ہے، اسی تعلق نے پچھلے لوگوں کو بلند کیا تھا اور اس سے بے تعلقی نے ہی بعد والوں کو پیچھے و نیچے کر دیا۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

ایک حدیث پاک میں ہے کہ: ''ہر قوم کے لئے کوئی نہ کوئی زینت کا سامان اور رونق کا ذریعہ ہوتا ہے اور میری امت کے حق میں یہ سامان وذریعہ قرآن مجید ہے''، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے پڑھنے وپڑھانے والے کو سب سے بہتر بتایا، قیامت کے دن قرآن مجید عرش کے نیچے کھڑا ہوکر دنیا میں اس سے تعلق رکھنے والوں کی وکالت کرے گا، قرآن مجید کی تلاوت اور عمل کا اہتمام کرنے والے سے قیامت میں کہا جائیگا: ''پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، جہاں تیرا پڑھنا ختم ہوگا وہیں تیری منزل ہوگی''۔

رسالت ونبوت

جب انسان اللہ کے احکام پر چلنے کا پابند ومکلف ہے تو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کے احکام کیا ہیں؟ کن کاموں کی اس کی طرف سے ہم کو اجازت اور کن کی ممانعت ہے؟ براہ راست اللہ تعالیٰ ہر ایک کو نہ بتاتا ہے اور نہ ہی یہ اس کے شایان شان ہے، دنیا میں چھوٹے چھوٹے عہدہ ومنصب کے لوگ ہر بات عوام سے براہ نہیں کہتے بلکہ کسی کو واسطہ بنا کر کہتے ہیں، بادشاہ وسلاطین کا تو معاملہ ہی جدا ہے اور ان کے منصب کی عظمت کا تقاضا بھی یہی ہے اور خود عقل ہر چیز کو بتا نہیں سکتی اور اگر بتائے تو سب کا اتفاق ضروری نہیں جیسا کہ دنیوی امور میں ہوتا ہی رہتا ہے خواہ کیسے ہی پختہ عقل وتجربہ کار افراد جمع ہوں، نیز یہ کہ محض عقل کی مدد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ یقینی نہیں ہوسکتا، وہم واندازہ اور زیادہ سے زیادہ گمان غالب کی حد میں ہوتا ہے، لہٰذا اللہ کے احکام وہدایات حاصل کرنے کیلئے کسی دوسرے ہی ذریعہ کی ضرورت ہے، جو اپنے اندر یقین واطمینان رکھتا ہو، اللہ نے نبوت و رسالت کے منصب کے ذریعہ اسی ضرورت کو پورا فرمایا ہے، نبوت ورسالت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک واسطہ ہے اور محض بندوں کی ضرورت کی چیز ہے، جیسے کہ دوسری فطری ضرورتیں ہیں، بلکہ ان سب سے اہم ہے، اس لئے کہ اُسی کے ذریعہ ہماری پیدائش کے مقصود کی تکمیل ہوتی ہے۔

بہر حال اللہ نے اس مبارک سلسلہ کو قائم فرما کر طے فرمایا کہ اپنے خاص اور منتخب بندہ کے ذریعہ عام بندوں تک اپنی ہدایات اور قوانین واحکام پہنچائے اور جس طرح یہ احکام محض اس کی جانب سے اور اس کے فیصلہ سے ہوں گے ویسے ہی ان بندوں کے انتخاب میں بھی اُسی کا فیصلہ کارگر ہوگا کہ ہر ایک کی صلاحیت واستعداد کو وہی سمجھ سکتا ہے، اَللّٰہُ

یَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ (اس موقع کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے، جہاں جہاں اپنے پیغام بھیجتا ہے)، نبی انسانوں کی طرف اللہ کا نمائندہ اور اس کے احکام کا لانے والا ہوتا ہے، اس لئے انسان اور انسانی کمالات سے متصف اور انسانی تقاضوں سے بھرپور ہوتا ہے تاکہ وہ تمام احکام پر خود عمل کر کے دکھا جائے اور بتا جائے کہ اللہ کے مطالبات کا پورا کرنا کوئی دشوار وناممکن چیز نہیں، موٹی سی بات ہے کہ کسی کے کام پورے طور پر وہی آسکتا ہے جو کہ اس کا مزاج شناس بھی ہو، اس کے رجحانات، احساسات اور جذبات سے واقف ہو اور فرشتے ان چیزوں سے ناواقف ہی نہیں بلکہ ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے جیسے بھوک، پیاس، حسد، نفسانی خواہش وغیرہ کہ ان کے احساس کا مادہ ہی ان میں نہیں رکھا گیا ہے، جنات بھی انسانی ضروریات کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ خود انسان ہر انسانی کیفیت کو جب تک کہ اس سے دوچار نہ ہو نہیں سمجھ سکتا، جس نے کبھی خواب نہ دیکھا ہو وہ اس کی حقیقت کیا سمجھ سکتا ہے، جس نے کوئی چیز چکھی نہ ہو اس کا مزہ کیسے جان سکتا ہے، اندھے آدمی کو کسی چیز کا حسن نہیں سمجھایا جاسکتا ہے، اس لئے نبی ہمیشہ انسان ہی بھیجے گئے اور اس حقیقت کو بار بار ان کی زبان سے کہلایا گیا اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں)، هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا (میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں، پیغمبر ہوں اور کیا ہوں)، بلکہ کفار ومشرکین کو حضرات انبیاء کی بابت یہ بڑا اعتراض رہا کہ تمہیں تو ہم خوب جانتے ہیں، ہمارے بیچ ہی تم پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے اور ہم دن رات اپنی آنکھوں سے تمہارے حالات وضرورتیں دیکھ رہے ہیں، تم ہماری مانند انسان ہی تو ہو، اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا اور قرآن نے بھی انبیاء کی زبان سے انہیں کی جیسی تاکید سے اعلان کرایا، اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (ہم تمہارے جیسے انسان ہی ہیں) اور ان کے حق میں انسانی ضرورتوں وتقاضوں کا ہونا بھی بیان کیا، وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ اَزۡوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو

بیباں اور بچے بھی دیئے) وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے، سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے)۔

بہرحال انبیاء کے انسان ہونے میں وہی مصلحت پیش نظر تھی جسے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، لیکن یاد رہے کہ ان کے انسان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں اور دوسرے انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بلکہ ان کے انسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان کے علاوہ کسی دوسری جنس سے تعلق نہیں رکھتے، فطری ضرورتیں ان کی اور عام انسانوں کی یکساں ہوتی ہیں لیکن عام انسانوں میں اور ان میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، ایسا بھی نہیں کہ وہ خدا بن جائیں جیسا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں، بلکہ بایں معنی کہ حضرات انبیاء کو جو کمالات عطا کئے جاتے ہیں عام انسان ان کو لاکھوں مجاہدات کے ذریعہ بھی نہیں حاصل کر سکتے۔

یوں تو دنیا کا بڑے سے بڑا کمال وہبی یعنی اللہ کا عطا کردہ ہوتا ہے لیکن ان کے ایک بڑے حصے کے حصول میں انسانی کوشش ومحنت کا دخل ہوتا ہے، مگر نبوت ورسالت کا منصب ہر کوشش ومحنت سے بلند وبرتر ہے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرمادے)

حضرات انبیاء خود شریعت ساز یعنی شریعت بنانے والے نہیں ہوتے، بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے، جو کچھ کہتے ہیں اللہ کی جانب سے، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے) اور کافروں نے جب کبھی ایسی بات کہی کہ جس سے سمجھا گیا کہ وہ انبیاء کو شریعت ساز خیال کرتے ہیں تو کہلا دیا گیا، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ (میں تو محض اس چیز کی اتباع کرتا ہوں جس کی میری طرف

وحی کی جاتی ہے)، مَايَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗءِ نَفْسِيْ (مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں)۔

اسی لئے نبی کے متعلق یہ عقیدہ لازم ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے حق کہتا ہے، اس سے صرف نظر کی کوئی گنجائش نہیں اور یہی وجہ ہے کہ جو براہ راست اپنے کانوں سے نبی کی بات سنے یا ایسے ذرائع سے کہ جن کی بناء پر نبی سے اس کے منقول ہونے میں شبہ نہ ہو تو اس کا یقین لازمی، عین ایمان اور انکار کفر قرار پائے گا اور چونکہ انبیاء کو وقت کا امام مطلق اور مقتدائے کامل بنا کر بھیجا جاتا ہے اس لئے وہ جسمانی وروحانی دونوں کمالات کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتے ہیں، ان کے عہد وامت میں نہ تو شکل وصورت میں ان کے جیسا کوئی ہوسکتا ہے اور نہ ہی روحانیت میں، اسی لئے عزت وآبرو کو مجروح کرنے والی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے، نہ نبوت سے پہلے ان سے چھوٹا بڑا کوئی گناہ ہوتا ہے اور نہ نبوت کے بعد، ہاں خلاف اولیٰ کا ارتکاب ہوجاتا ہے، وہ بھی اجتہاداً کہ اپنے گمان کے مطابق حق سمجھ کر ہی کرتے ہیں، مگر ان کے حق میں اسی کو بڑا سمجھا جاتا ہے، اس پر عتاب ہوتا ہے، وہ معذرت کرتے ہیں اور آخرت میں اس سے خوف کریں گے، نیز ان کی تائید اور عام انسانوں کو ان کی طرف متوجہ کرنے کیلئے انہیں معجزات دیئے جاتے ہیں، انبیاء وحی کے امین ہدایت کے علمبردار، ان کا کلام حکمت، زندگی نمونہ اور ظاہر وباطن یکساں ہوتا ہے۔

انبیاء کا تعدد

نبوت کا سلسلہ انسانوں کے وجود میں آنے کے روز اول سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر چلتا رہا اور اگرچہ قرآن مجید نے ان کی کوئی تعداد نہیں بتائی، لیکن ارشاد باری وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی کہ جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گذرا ہو)، وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (اور ہم ہر امت میں ایک رسول بھیج چکے ہیں) سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ و بے شمار ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ: ''تقریباً سوا لاکھ انبیاء اور تین سو تیرہ رسول ہوئے'' اور آپ کی تصریح کے مطابق انبیاء کی بڑی تعداد حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان یعنی بنو اسرائیل میں ہوئی اور باقی پوری دنیا کی تمام اقوام میں۔

بہر حال ان کی تعداد خواہ کتنی ہو ہم سے تمام انبیاء پر ایمان کا مطالبہ ہے اور کسی ایک کی نبوت وعظمت سے انکار کفر ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہم سے کہلایا گیا ہے قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ الآیۃ (کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور اولاد یعقوب کی طرف بھیجا گیا اور اس پر بھی جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر بھی جو اور انبیاء کو دیا گیا) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیز اس امت کے متعلق فرمایا گیا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ الآیۃ (اعتقاد رکھتے ہیں رسول

اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مومنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے)۔

رہی یہ بات کہ آخر اتنی بڑی تعداد میں انبیاء کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو علماء محققین نے اس کی متعدد وجوہ ذکر کی ہیں، اول: ماحول وحالات کا اختلاف کہ ہر عہد و زمان اور ہر قوم وجگہ کا ماحول اور حالات یکساں نہیں ہوتے، دوم: غور وفکر کا معیار بھی ہر ایک کا یکساں نہیں ہوتا، ایسے ہی تجربے بھی مختلف ہوتے ہیں، ان امور کا اختلاف یہ تقاضا کرتا ہے کہ احکام میں فرق واختلاف ہو اور عام مشاہدہ ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے قانون سازی میں اختلاف ہوتا رہتا ہے، تیسری بات یہ کہ قانون سازی میں آہستہ روی ضروری ہے، ایک دم سے تمام قوانین کا نفاذ دشوار ہوتا ہے اور روز اول سے لے کر آج تک انسانیت نہ جانے کتنی کروٹیں لے چکی ہے، ان وجوہات کی بناء پر انبیاء کافی تعداد میں بھیجے گئے اور ان کی شریعتوں میں اختلاف رہا، ایک اہم وجہ ان کی کثرت کی یہ بھی رہی ہے کہ کوئی بھی رائے اور نظریہ ہو خواہ کتنی ہی پختگی کے ساتھ اسے اختیار کیا جائے وقت کے گذرنے کے ساتھ اس پر اثر ضرور پڑتا ہے اور وہ ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا، حالات اس پر گرد وغبار ڈال دیتے ہیں، جس کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے حق میں تو اس کام کا ذمہ دار افراد امت اور علماء امت کو بنادیا گیا ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اس کے لئے انبیاء ہی بھیجے جاتے تھے، یعنی ہر نبی نئی شریعت اور نئی کتاب لے کر نہیں آتا تھا بلکہ ان کی بڑی تعداد صرف گذشتہ نبی کی شریعت کی تبلیغ اور اس کے پیرو کاروں میں پیدا ہوجانے والی اعتقادی وعملی گمراہیوں کو دور کرنے کیلئے آئی اور یہی چیز ''نبی'' و ''رسول'' کے درمیان وجہ فرق قرار پائی کہ رسول اس ذات والا صفات کو کہا گیا جو نئی

شریعت لے کر آئے جیسے حضرت نوح وابرہیم، موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام وغیرہ جن کی تعداد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''تین سو تیرہ'' بتائی ہے اور نبی وہ حضرات ہیں جو گذشتہ انبیاء کی شریعتوں کے لئے بطور مبلغ و مصلح بھیجے گئے، جن کی تعداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے، البتہ خیال رہے کہ انبیاء ورسل میں اختلاف صرف شرائع یعنی عملی احکام میں ہوتا ہے، رہے اصول یعنی اعتقادات تو ان میں کوئی اختلاف نہیں رہا، سب ہی توحید اور ایمان بالآخرۃ کے علمبردار رہے ہے، انبیاء کی اتنی بڑی تعداد میں سے صرف پچیس کا نام لے کر قرآن مجید میں تذکرہ ہے اور ان میں سے بھی چند ہی کے تفصیلی حالات مذکور ہیں، چند جلیل القدر انبیاء کے حالات ذکر کئے جا رہے ہیں۔

چند جلیل القدر انبیاء

حضرت آدم علیہ السلام:

حضرت آدم علیہ السلام نہ صرف پہلے نبی تھے بلکہ سب سے پہلے انسان اور ابوالبشر بھی تھے، انہیں سے نسل انسانی کا سلسلہ اس دنیا میں چلا، اسی لئے قرآن پاک میں ان کی پیدائش کا واقعہ خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسا کہ قرآنی آیات اور روایات میں مذکور ہے، چار دن میں زمین اور اس میں پائی جانے والی تمام چیزوں کو پیدا فرمایا اور دو دن میں آسمان اور اس کی چیزوں کو، پھر اس زمین پر جناتوں کو بسایا، مگر ان کی طبیعت میں چوں کہ شر کا مادہ غالب رکھا گیا ہے، اس لئے وہ شر اور فساد پر آمادہ ہوئے، حتیٰ کہ دنیا کی عام آبادی میں آزادی کے ساتھ کہیں رہنے سے محروم کر دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذریعہ زمین کو زینت بخشنے کا فیصلہ کیا اور اس کو اپنا خلیفہ بنانا تجویز کیا، فرشتوں کو مطلع کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ: ''ہم تو ہر خدمت کیلئے حاضر ہی ہیں اور یہ نئی زمینی مخلوق بھی سابق مخلوق کی طرح فساد ہی مچائے گی''، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''تمہاری نظر یہیں تک ہے اور میری وہاں تک کہ تمہارا ذہن بھی نہیں جا سکتا، تم اس خیال میں ہو کہ انسان کچھ بھی ہو ہم سے نہ بڑھ سکے گا، اس لئے کہ ہم میں شر نام کا نہیں اور وہ شر سے خالی نہ ہوگا، مگر ہم نے اس کو اپنی خلافت کیلئے چنا ہے، اس لئے جلد ہی اس کی صلاحیت کا مشاہدہ بھی کرا دیں گے اور تم سے اس کی عظمت بھی تسلیم کرا لیں گے، وہ اپنے کمالات کی بناء پر اس مقام تک پہنچے گا کہ مقرب سے مقرب فرشتہ بھی وہاں تک نہ جا سکے گا''، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے موقعہ پر اس شرف سے نوازا گیا ہے۔

بہر حال حکم ہوا کہ زمین کے ہر حصے سے تھوڑی تھوڑی مٹی جمع کی جائے، مٹی جمع کی

گئی، بعض روایات میں ہے کہ مجموعی طور پر ساٹھ قسم کی تھی، جس کا اثر حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں رنگ ومزاج کی صورت میں ظاہر ہوا، مٹی گوندھی گئی، پھر سکھا کر ٹھیکروں کی مانند کی گئی اور اسی سے حضرت آدم کا پتلہ بنایا گیا، کچھ وقت گذرنے کے بعد اس پتلے میں جان ڈالی گئی، پھر ان کو تمام چیزوں کے نام اور اوصاف وخواص کی تعلیم کر کے فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا، فرشتوں سے ان چیزوں کے بتانے کا سوال ہوا، وہ لاعلم تھے، معذرت پیش کی اور حضرت آدم علیہ السلام نے سب بتا دیا، تو اسی وقت ان کی برتری ثابت ہوگئی اور اس کو ان سے یوں تسلیم کرایا گیا کہ تمام فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا، سب نے کیا صرف شیطان انکار کر بیٹھا اور اڑ گیا تو اس سے سارے عہدے ومنصب چھین لئے گئے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جا کر رہنے کا حکم ہوا، ان کے دل بہلانے کو حضرت حوا پیدا کی گئیں، ان کی پیدائش حضرت آدم کی پسلیوں سے ہوئی، اس کے بعد بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا کے تمام انسان ماں وباپ کی مخصوص ملاقات کے ذریعہ ہی پیدا ہوتے رہے، حضرت آدم کو جنت میں ہر قسم کی آزادی تھی، صرف ایک درخت کے پھل کی ممانعت تھی، شیطان ان کا ہی کیا ساری نسل آدم کا دشمن ہو چکا تھا اور سب کو گمراہ کرنے کا بیڑا اٹھا چکا تھا، اس نے اس پھل کے کھانے پر حضرت آدم کو آمادہ کرنا شروع کیا، حتیٰ کہ حضرت آدم نے اسے کھا لیا، مگر یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے نہیں کہ ممانعت ہے، پھر بھی کر رہے ہیں، بلکہ ذہن میں کوئی ایسی بات رکھ کر کہ جس کی وجہ سے گنجائش سمجھ میں آتی تھی، لیکن فوراً گرفت ہوئی، زمین پر اتار دئے گئے، جنت کی نعمتیں چھن گئیں، سیکڑوں سال توبہ وآہ وزاری میں گذرے، حتیٰ کہ توبہ قبول ہوئی اور آئندہ زمین میں نسل انسانی کے بسانے کے لئے زمین میں ہی رہنے کا حکم ہوا اور اولاد کا سلسلہ چل پڑا، ہر مرتبہ میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی جنم پاتے اور دوسری مرتبہ کے لڑکے ولڑکی سے منسوب کر دیئے جاتے، حتیٰ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ان کے سامنے ایک لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔

یہ اولاد جیسے رنگ ومزاج میں مختلف ہوئی، زبان کا بھی فرق ہوتا جو آج تک چلا آرہا ہے، ۹۴۰ کی عمر میں حضرت آدم علیہ السلام کی وفات ہوئی۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام تک بہت سے انبیاء ہوئے مگر چونکہ اس وقت تک لوگ شرک وکفر اور دوسری گمراہیوں میں مبتلاء نہ تھے، نیز نسل انسانی کے ابتدائی ایام دنیا میں گذر رہے تھے اور نئی نئی ضرورتیں سامنے آتی رہتی تھیں، اس لئے انبیاء کو بذریعہ وحی اپنی طبعی ضرورتیں پورا کرنے کے وسائل اور صورتوں کی تعلیم کی جاتی، جس سے وہ دوسروں کو مطلع کرتے اور کچھ احکام بھی ہوتے، حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کے انبیاء میں حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام زیادہ مشہور ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام: حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے جلیل القدر نبی ہوئے اور چونکہ ان کے عہد میں دنیا غرق ہو کر تباہ ہوگئی تھی اور آئندہ انہیں کی اولاد سے نسل انسانی چلی، اس لئے "آدم ثانی" لقب پایا، حضرت آدم علیہ السلام کی دسویں پشت میں تھے۔

نبی بنائے جانے کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی اور مسلسل نو سو پچاس سال قوم کے سمجھانے میں مصروف رہے، پھر بھی قوم نہ مانی، صرف چند افراد ہی ایمان لائے، جن کی تعداد اسی تک منقول ہے، قوم کے نہ ماننے پر پانی کی صورت میں سخت عذاب آیا، آسمان سے بھی برسا اور زمین سے بھی ابلتا رہا، حتیٰ کہ ساری دنیا غرق ہو کر تباہ وبرباد ہوگئی، بجز آپ اور آپ کے ان احباب کے جو آپ کی تیار کردہ کشتی پر سوار تھے، اس کے بعد مزید ڈھائی سو سال زندہ رہے، اس طرح ان کی عمر کل بارہ سو چالیس سال ہوئی۔

حضرت نوح علیہ السلام عراق کے علاقے میں رہتے تھے اور اس وقت روئے زمین

پر جتنی بھی انسانی آبادی تھی سب کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اور اس وقت ساری انسانیت شرک و بت پرستی اور طرح طرح کی گمراہیوں و گناہوں میں مبتلاء تھی، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ: ''حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں جو نئی شریعت لے کر آئے''، ورنہ اس سے پیشتر حضرت آدم علیہ السلام سے ان تک ایک ہی شریعت پر عملدر آمد تھا، حضرت نوح علیہ السلام نے بے انتہا سمجھایا، سارے لوگ بہت سے مصائب مثلاً مال و اولاد کی کمی، بارش و پانی کی کمی اور اس کی وجہ سے قحط وغیرہ مشکلات میں پھنسے تھے، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ اپنی ساری گمراہیاں چھوڑ دو، ان سے توبہ کرلو تو یہ ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔

ہر ممکن طریقہ ان کے سمجھانے کا اختیار کیا، مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا، بلکہ الٹے پریشان کرتے اور تکلیفیں پہنچاتے، صرف چند آدمی ایمان لائے جن کی تعداد اسی تھی؛ چالیس مرد اور چالیس عورتیں، آخر جب ۹۵۰ سال کی مسلسل تبلیغ کے بعد بالکل مایوس ہو گئے اور اللہ کی جانب سے بتایا گیا کہ: ''اب ان میں سے کوئی ایمان نہ لائے گا'' تو عذاب کیلئے دعا کی، جس کے نتیجہ میں ایسا طوفان آیا کہ نہ اس سے پہلے و بعد میں کبھی آیا اور نہ آئے گا، زمین سے پانی ابلنا شروع ہوا اور آسمان سے برسنا، حتیٰ کہ لمبے لمبے درخت اور اونچے اونچے پہاڑ بھی ڈوب گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی انسان کیا معنیٰ کوئی جاندار بھی نہ بچ سکا، بجز ان انسانوں اور جانوروں کے جنہیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی پر سوار کرلیا تھا اور اس کے لئے بھی یہ صورت ہوئی تھی کہ عذاب کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مطلع فرما دیا کہ: ''یہ عذاب آنے والا ہے، لہٰذا ایک بڑی کشتی بناؤ جو تیس گز اونچی، پچاس گز چوڑی اور تین سو گز لمبی تھی اور اس میں تین منزلیں تھیں''، ان کی قوم کے لوگوں نے انہیں کشتی بناتے دیکھ کر بہت مذاق اڑایا کہ یہاں تو دور دور تک پانی نہیں ہے، یہ کشتی کہاں چلے گی، عذاب آنے پر انہوں نے دیکھ لیا کہ چلنے کے لئے کہاں سے پانی

آ گیا، کشتی کی بالائی منزل پر تمام اہل ایمان تھے اور باقی دو منزلوں میں تمام جانوروں کا ایک ایک جوڑا اور کھانے پینے کا سامان تھا۔

انہیں اہل ایمان اور بالخصوص حضرت نوح علیہ السلام کے تین صاحبزادے ''سام''، ''حام''، ''یافث'' سے آئندہ نسل انسانی چلی، حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بیشتر مشہور نبیوں میں ''قوم عادؑ'' کے نبی حضرت ''ہودؑ'' اور ''قوم ثمودؑ'' کے نبی حضرت ''صالحؑ'' علیہما السلام تھے، جن کا ذکر قرآن مجید میں کئی مرتبہ اور ایک درجہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام: حضرت نوح علیہ السلام کے تقریباً ہزار سال بعد مبعوث ہوئے اور ان کی گیارہویں پشت میں اور کل ۱۷۵ سال کی عمر پائی، سالہا سال دعوت و تبلیغ میں گذارے، آپ بھی عراق کے رہنے والے تھے، آپ کے زمانے میں وہاں کا بادشاہ ''نمرودؔ'' تھا، آپ کے والد اس کے ممتاز درباریوں اور بڑے مندر کے پجاریوں کے سردار تھے، آپ کی پوری قوم مشرک اور بت پرستی کا شکار تھی اور خود آپ کے والد نہ صرف یہ کہ بت تراشا کرتے تھے بلکہ بتوں کا کاروبار بھی کرتے تھے، آپ کو بچپن سے ہی ان تمام باتوں سے نفرت تھی اس لئے اسی وقت سے ان چیزوں سے دور رہتے تھے، حتیٰ کہ اللہ نے آپ کو اپنا نبی بنایا اور نہ صرف نبی بلکہ آپ کی بے مثال قربانیوں اور ہر مطالبے پر لبیک کہنے کی وجہ سے اپنا ''خلیل''، یعنی خاص دوست قرار دیا۔

نبی ہوتے ہی آپ نے بت پرستی کے خلاف تبلیغ شروع کر دی، لیکن لوگ کوئی اثر نہ لیتے تھے، حتیٰ کہ ایک دن تمام لوگ ایک مذہبی جشن میں شہر کے باہر گئے، آپ عذر ظاہر کر کے تشریف نہ لے گئے اور مندر کو خالی پا کر ایک کلہاڑی سے تمام بتوں کو توڑ ڈالا، صرف

ایک بڑے بت کو رہنے دیا اور کلہاڑی بھی اسی کی گردن پر لٹکا دی، لوگ جب واپس آئے اور یہ حال دیکھا تو چونکہ انہیں حضرت ابراہیم کے خیالات کا علم تھا، سمجھ گئے کہ انہیں کی حرکت ہے، آپ کو بلا کر پوچھا، تو آپ نے پھر ان کو ایک خاص انداز سے سمجھانا چاہا کہ سب کا بڑا جو موجود ہے اگر ان میں کچھ قوت ہے تو اسی سے پوچھ لو، لوگ بہت ناراض ہوئے اور آپ کے لئے سخت سزا تجویز کی۔

چنانچہ بہت بڑا الاؤ اکٹھا کر کے چالیس دن تک اسے خوب جلایا اور پھر دہکتے ہوئے الاؤ میں حضرت ابراہیم کو ڈال دیا، لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا، اطمینان سے آگ میں چلے گئے اور ان کے آگ میں جاتے ہی آگ ٹھنڈی ہوگئی اور لوگ آپ کو صحیح وسالم دیکھ کر حیران وپریشان رہ گئے، آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم سے مایوس ہوگئے، والد کو سمجھانے کی کوشش کی وہ بھی نہ مانے تو وطن کو چھوڑ دیا، آپ کے ساتھ آپ کے بھتیجے اور اہلیہ حضرت سارہ تھیں، آپ مصر ہوتے ہوئے فلسطین تشریف لے گئے۔

مصر سے گذرتے ہوئے بادشاہ مصر نے حضرت ہاجرہ کو بطور خادمہ پیش کیا، بعض روایات میں مذکور ہے کہ ہاجرہ شاہزادی تھیں، فلسطین کے دوران قیام ہی تقریباً سو سال کی عمر میں حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، جنہیں حالت شیر خواری میں ہی والدہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ریگستان میں چھوڑنے کا حکم ہوا اور ماں بیٹے وہیں رہ پڑے، جہاں آئندہ چل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی بدولت پورا شہر آباد ہوگیا اور آج ہر قسم کا سامان وہاں فراہم ہے، حضرت اسماعیل جب چلنے، پھرنے کے لائق ہوئے تو وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی اور ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر لاکھوں جانوروں کی قربانی کر کے مسلمان اس کی یادگار مناتے ہیں، یعنی اللہ کی جانب سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا مطالبہ ہوا اور حضرت ابراہیمؑ نے میدان منیٰ میں لے جا کر ان کو ذبح کرنے کی نیت سے ان کی گردن پر چھری بھی چلائی مگر

چونکہ مقصود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لینا تھا کہ آخر کہاں تک وہ اللہ کے لئے قربانی دے سکتے ہیں، اس لئے چھری نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا گلا نہیں کاٹا اور ان کی جگہ اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لایا ہوا جنتی مینڈھا ذبح کیا گیا، حضرت اسماعیلؑ جب جوان ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مل کر ''بیت اللہ'' کی تعمیر کی۔

اور حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، جو حضرت سارہ سے تھے اور حضرت اسماعیلؑ سے چند سال چھوٹے تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام نے فلسطین میں ''بیت المقدس'' کی تعمیر کی، حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد فلسطین کے علاقہ میں رہی اور وہیں پھیلی وپھلی اور بعد میں ''بنی اسرائیل'' و ''یہود'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

آج کے اسرائیلی انہیں کی اولاد ہیں، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد تقریباً تمام انبیاء انہیں کی اولاد میں ہوتے رہے اور ان میں بادشاہت کا سلسلہ بھی رہا، حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت سلیمانؑ جیسے پیغمبران بھی بادشاہ ہوئے اور حضرت سلیمانؑ کی جیسی بادشاہت تو کسی کو نہیں ملی کہ تمام جانداروں حتیٰ کہ ہوا وغیرہ کے بھی بادشاہ وحکمراں تھے۔

حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جزیرہ نمائے عرب کے علاقے میں رہتی رہی اور ''بنو اسماعیل'' کے نام سے اور بعد میں بہت سے قبائلی ناموں سے مشہور ہوئی، ''خاندان قریش'' انہیں کی ایک شاخ تھی، جس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق تھا اور آپ کے چاروں خلفاء اور بہت سے صحابہ کا تعلق بھی بنو اسماعیل سے تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی ہوئے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ خوب معلوم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی حضرت ''قتورہ'' تھیں، جن سے آپؑ کے چھ لڑکے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد مشہور نبیوں میں حضرت لوط، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام وغیرہ ہوئے، حضرت لوط علیہ السلام تو آپ کے حقیقی بھتیجے تھے اور باقی تمام انبیاء آپؑ کی اولاد ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہما السلام کے پوتے حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام کو جب اللہ نے مصر کا یک معزز عہدہ عطا کیا تو انہوں نے پورے خاندان کو مصر میں بلالیا، جہاں وہ لوگ شروع شروع میں عزت سے رہتے رہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد جب دوسرے لوگوں کا دور دورہ ہوا تو پردیسی ہونے کی بناء پر بنظر حقارت ان کو دیکھا جانے لگا، خاص طور سے مصر کے مشہور بادشاہ مصعب بن ولید کے زمانہ میں جس نے اپنے متعلق خدا ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور چونکہ بنی اسرائیل توحید پرست تھے، اس لئے وہ اور اس کی قوم کے لوگ ان سے اور چڑھتے تھے، حتیٰ کہ بعض پنڈتوں کی اس پیشن گوئی کی وجہ سے کہ "بنی اسرائیل کا ایک لڑکا تم سے حکومت چھین لے گا"، اس خاندان کے سارے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر ڈالنے کا حکم دے دیا اور نتیجۃً ہزاروں بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر قتل کر دئے گئے۔

اسی دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے سے تقریباً دو ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، آپ کے والد کا اسم گرامی "عمران" تھا اور والدہ کا "یولید"، کل عمر ۱۲۰ سال پائی، پیدائش مصر میں ہوئی اور وفات صحرائے سینا میں، اللہ تعالیٰ کو چونکہ آپ سے ایک اہم کام لینا تھا، اس لئے ان کی حفاظت کا خصوصی انتظام فرمایا۔

پہلے تو ماں کے پاس رہتے رہے اور جب یہ اندیشہ ہوا کہ ان کی خبر پھیل جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے والدہ کو حکم دے کر ایک لکڑی کے صندوق میں انہیں دریا کی نذر کرا دیا اور دریا

نے انہیں خاص دشمن یعنی فرعون کے محل اور اس کے ہاتھوں میں پہنچا دیا اور پھر فرعون کی بیوی "آسیہ" کی خواہش پر شاہی محل میں اور اسی کے زیر نگرانی آپ نے پرورش پائی، جوان ہونے پر ایک دن شہر کی سیر کو نکلے تو ایک مظلوم کی مدد میں ایک شخص کو ایک گھونسا مار دیا، جس سے وہ مر گیا، مجبوراً آپ کو مصر چھوڑنا پڑا، "مدین" پہنچے، وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں رہے اور ان کی صاحبزادی "صفورہ" سے شادی کی، دس سال بعد بیوی کے ساتھ لوٹے تو راستے میں نبوت سے نوازے گئے اور مصر پہنچتے ہی فرعون کے پاس جا کر دعوت دینے کا حکم ہوا۔

چنانچہ حسب حکم آپ نے اس تک دعوت پہنچائی، انانیت چھوڑ کر توحید کی دعوت دی، بنو اسرائیل پر ظلم وستم سے روکا، مگر اس نے کوئی توجہ نہ کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معجزات کا مظاہرہ کر کے اسے اپنی صداقت کا یقین دلایا، مگر اس نے اور اس کے درباریوں نے جادو قرار دے کر جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرا دیا، ملک کے بڑے سے بڑے جادوگر جمع ہوئے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کے فن کو ایسی شکست ہوئی کہ غیر اختیاری طور پر وہیں میدان مقابلہ میں اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور سجدے میں گر گئے، فرعون پھر بھی نہ مانا، ان سب کو سزا دی، فرعون کی تنبیہ کے لئے مختلف قسم کے عذاب ظاہر ہوئے مگر اس کو پھر بھی ہوش نہ آیا۔

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راتوں رات بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل کر اپنے سابق وطن کی طرف جانے کا حکم دیا، یہ لوگ چلے لیکن خشکی کے راستے سے بھٹک کر ساحل سمندر پر جا پہنچے، اللہ نے معجزہ ظاہر فرمایا سمندر پر ان کے لئے راستے بنا دیئے اور یہ پار ہو گئے، خبر لگنے پر فرعون بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑا، سمندر کے کنارے پہنچ کر بنی اسرائیل کو بے تکلف سمندر سے پار ہوتا دیکھ کر خود بھی مع رفقاء ان سمندری راستوں پر چل دیا، مگر جیسے ہی دونوں کناروں کے بیچ میں مع لشکر پہنچا پھر سمندر

کے دونوں کنارے مل گئے اور سب ڈوب گئے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل آزادی سے رہتے رہے، ان کو مصروشام کی حکومتیں ملیں اور اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات واحسانات ان پر ہوئے، مگر عملاً بڑے بدطینت اور شریر لوگ تھے، احکام خداوندی کا مذاق اڑانا، انبیاء کی مخالفت، ان کی ایذا رسانی حتیٰ کہ ان کو قتل کر دینا، بے شمار خصوصی انعامات واحسانات کی ناشکری یہی سب ان کا مشغلہ رہا، اس لئے اللہ نے بھی ان کو سخت سزائیں دیں، ظالم وجابر بادشاہ ان پر مسلط کئے، سخت احکام ان پر لازم کئے، مثلاً بدن یا کپڑے کا کوئی حصہ ناپاک ہوجائے تو پاکی کیلئے اسے کاٹنا، کوئی گناہ کہیں بھی چھپ کر کرو، صبح کو دروازے پر لکھا ہوا ملنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بہت پریشان کیا، بت پرستی شروع کر دی، انہیں کے مطالبے پر اللہ کی جانب سے جو احکام آئے ان کے ماننے سے انکار کر دیا، اس کی وجہ سے بہت ذلیل ورسوا کئے گئے۔

اس قوم کی خاص خصلت لالچ وحرص ہے، بعض افراد تو دنیا کے مالدار ترین لوگ ہیں، مگر پھر بھی حریص ہیں اور باقی پوری قوم تو تنگدست اور اس کی وجہ سے لالچی وحریص ہے ہی، اللہ نے ان کو ہمیشہ کیلئے ایسی عزت سے محروم کر دیا ہے جو دیرپا اور دور تک ہو، جو کچھ کہیں ہے عارضی اور محدود ہے۔

ان کا خاص عقیدہ یہ ہے کہ یہودی خواہ کتنا ہی گناہ کرے، بس چند دن دوزخ میں رہ کر پھر ہمیشہ جنت میں رہے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بے شمار نبی ہوئے، زیادہ مشہور حضرت یوشع، حضرت حزقیل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت الیاس، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحیٰ علیہم السلام ہوئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق بھی بنو اسرائیل سے ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً پانچ سو سال پہلے بنی اسرائیل کی ایک شاخ میں پیدا ہوئے اور پیدائش عجیب وغریب طریقے سے ہوئی کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، آپ کی والدہ حضرت مریم بنت عمران تھیں جو ''بیت المقدس'' کے خدام میں سے تھیں، اس لئے کہ ان کے والد ''عمران'' بھی بڑے بلکہ اپنے وقت کے علماء و عبادت گذاروں کے سردار تھے اور والدہ نے پیدائش سے پہلے ہی ''بیت المقدس'' کے لئے وقف کر دینے کی نذر مانی تھی، وہ ایک دن تنہائی میں غسل کر رہی تھیں کہ اللہ کے حکم سے ایک فرشتہ آیا اور اس نے بچہ ہونے کی خوشخبری دے کر آپ کے گریبان میں پھونک ڈال دی، بس یہی پھونک حمل کا ذریعہ بن گئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، آپ کی والدہ پر زنا کی تہمت لگائی گئی تو آپ نے حالت شیر خواری میں ان کی بے گناہی کی گواہی دی۔

وقت آنے پر نبی بنائے گئے اور دعوت کا کام شروع کر دیا، آپ سے پہلے بنو اسرائیل کے انبیاء اور بنی اسرائیل کے عوام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو تھے اور اس وقت تک یہی شریعت رائج تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نئی شریعت لے کر آئے تھے، سب بھڑک اٹھے، ان کے خلاف فضا بننے لگی حتیٰ کہ ان کے قتل کا منصوبہ بنا کر ان کو حکومت سے بغاوت کا الزام دیا گیا اور ان کے خلاف فیصلہ کر کے ''سولی'' کی سزا تجویز کی گئی اور اپنے گمان کے مطابق ایک دن ان کو سولی بھی دے دی گئی، اس شدید مخالفت کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام دعوت کا کام کرتے رہے۔

ان کے وقت میں طب کا بڑا زور تھا، آپ کو معجزہ اسی لائن کا دیا گیا کہ پیدائشی اندھوں کی بینائی لوٹا دیتے تھے، کوڑھ کا مرض ہاتھ پھیرنے سے ٹھیک ہوجاتا، مردہ کو زندہ کر دیتے، بہت سے لوگوں نے آپ کی بات مانی، آپ پر ایمان لائے اور آپ کے بعد بھی

آپ کے مذہب پر قائم رہے اور انہیں کی بدولت عیسائیت آج تک زندہ ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دے دی گئی تھی اور عیسائی تو ان کو اپنے تمام گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں، مگر شریعت محمدیہ نے اس کی سختی سے تردید کی ہے اور قرآن وحدیث دونوں نے بتایا ہے کہ: ''حضرت عیسیٰ کو زندہ و محفوظ آسمان پر اٹھالیا گیا اور ان کی جگہ ان سے ملتی جلتی شکل کے ایک آدمی کو سولی دی گئی، شکل کے ملنے کی وجہ سے لوگ دھوکہ میں رہے، وہ آج بھی آسمان پر ہیں اور قیامت کے قریب آسمان سے زمین پر تشریف لائیں گے، دجال سے مقابلہ کر کے اسے آپ ہی ماریں گے، شادی کریں گے، صاحب اہل وعیال ہوں گے اور احکام میں شریعت محمدیہ کے پابند ہوں گے، حتیٰ کہ عام انسانوں کی طرح آپ کی بھی وفات ہوگی''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا قرآن مجید میں اور احادیث میں مذکور ہے اور قیامت سے پہلے پھر دنیا میں تشریف لانا بے شمار احادیث میں مذکور ہے، اس میں شک وشبہ وانکار جائز نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد عیسائیوں کے نظریات میں تبدیلی آنی شروع ہوئی حتیٰ کہ بجز معدودے چند افراد کے سارے کے سارے عیسائی بہت سی گمراہیوں کا شکار ہو گئے، عقیدہ میں وہ شرک وتثلیث میں پڑ گئے اور عملاً رہبانیت یعنی دنیا سے یکسوئی وکنارہ کشی کو بڑی اہمیت دینے لگے، شرک وتثلیث میں یوں پڑ گئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور ان کو نیز ان کی والدہ اور بعض ان کی والدہ کے بجائے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ خدائی میں شریک وحصہ دار قرار دینے لگے، گمراہیاں یہاں تک ان کے اندر موجود ہیں۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

حضورؐ کی تشریف آوری کی بشارتیں:

آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مختلف نبیوں پر آسمانی کتابیں اتاریں، لیکن وہ ساری کتابیں ایک زمانے تک رہ کر ختم ہو گئیں، آج قرآن مجید کے علاوہ جو آسمانی کتابیں ہم کو ملتی ہیں صحیح وغلط جو کچھ ہیں ''تورات''، ''زبور'' اور ''انجیل'' ہیں، ان کتابوں میں موجودہ بے شمار غلط بیانیوں کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم حالات بلکہ آپؐ کے خاص خاص صحابہؓ سے متعلق بہت سے اہم واقعات کا ذکر ہے، انہیں حالات و واقعات کی بناء پر تمام یہودی وعیسائی علماء روز اول سے آپ کو نبی برحق ہی سمجھتے تھے، لیکن اپنی چودھراہٹ اور جھوٹے وقار کی حفاظت نیز یہودی وعیسائی عوام سے حاصل ہونے والے مال ودولت کی لالچ میں اس کا اعلان نہیں کرتے تھے، ان کے اس اعتراف کا ذکر قرآن مجید نے بھی کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ ــــــــ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں اخفاء کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی جو خوشخبری سنائی تھی، اس کا بھی ذکر قرآن مجید میں ہے:

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ

اور جب کہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا کہ اے

يَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ

بنی اسرائیل ! میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے سے جو توراۃ ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا، ان کی بشارت دینے والا ہوں۔

آگے دوسری آسمانی کتابوں میں مذکور چند بشارتیں ذکر کی جارہی ہیں، تورات میں ہے:

۱. ''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو''

استثناء:۱۸-۱۵

۲. ''اور خدا نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا میں ان کیلئے ان بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا''۔

استثناء:۱۸:۱۸

ان دونوں آیتوں میں خطاب بنی اسرائیل سے ہے، جو حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہما السلام کی اولاد تھے، اس لئے ان کے بھائیوں سے بظاہر بنو اسماعیل یعنی حضرت اسماعیل بن ابراہیمؑ کی اولاد ہی مراد ہوسکتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بنو اسماعیل ہی سے تھا۔

۳. ''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ ''سینا'' سے وہ ان پر جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا''

استثناء:۲:۲۳

''سینا'' جس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ''شعیر'' جس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کی نبوتوں کے بعد ''فاران'' کی پہاڑی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی نبوت کا ہی اعلان ہوا، نیز آپؐ ہی فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔

۴. ''یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ وہ نہ آئے جو بھیجا جانے والا ہے اور قومیں اس کے پاس اکٹھا ہوں گی''۔

پیدائش:۴۹:۱

اس کا مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کہ آپ کے جھنڈے تلے تمام اقوام جمع ہوئیں اور آپ کی تشریف آوری پر یہودیوں کا اقتدار ختم ہوگیا۔

۵. ''دیکھو میرا ایک بندہ جسے میں سنبھالتا، بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا، اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائیگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں''

یسیعاہ:۴۲:۴۱

اس عبارت میں 'میرا بندہ' ''عبدہ'' کا اور 'میرا برگزیدہ' ''مصطفیٰ'' کا اور 'جس کا زوال نہ ہوگا' ''خاتم النبیین'' کا ہی ترجمہ ہے۔

٦. ''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے''

یوحنا:۱۴:۱

۷. ''جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو میری گواہی دے گا''۔

یوحنا،۱۵:۲٦

ابدتک انسانوں کے ساتھ رہنے والا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والا نبی آپؐ کے علاوہ اور کون ہے؟ ان بیانات کے علاوہ اور بھی بیانات تورات وانجیل میں ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے، زبور میں منقول ہے:

۸. ''اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے، جن کا نام ''احمدؐ'' ہوگا، میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کے لئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کردی ہیں، ان کی امت امت مرحومہ ہے، میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے انبیاء پر لازم کئے گئے تھے، یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کے مانند ہوگا، اے داؤد! میں نے محمد اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں، اول: خطا ونسیان (بھول جانے) پر ان کو عذاب نہ ہوگا، جو گناہ ان سے بغیر قصد کے ہو جائے گا اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کردوں گا اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیب خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دوں گا اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہیں تو میں ان پر اس مصیبت کو رحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنادوں گا، وہ جو دعاء کریں گے میں قبول کروں گا کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں گا اور کبھی اس طرح کہ اس دعاء کو ان کی آخرت کا سامان بنادوں گا''۔

حضورؐ کی مکی زندگی قبل نبوت چالیس سال:

مکہ مکرمہ میں صدیوں سے جو باعزت اسماعیلی خاندان ''قریش'' نامی آباد تھا، اس کی

ایک انتہائی باعزت شاخ ''بنوہاشم'' کی تھی، جیسے ''قریش'' ایک شخص کا نام تھا، جس کی نسل و اولاد آئندہ چل کر ''قریش وبنوقریش'' کہلائی، اسی طرح ''ہاشم'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کا نام تھا، جن کی اولاد ''بنوہاشم'' کہلاتی تھی، ہاشم کے بیٹے ''شیبہ'' (جن کو ''عبدالمطلب'' کہا جاتا تھا) مشہور قول کے مطابق ان کے دس بیٹے تھے، جن میں سے ایک ''عبداللہ'' تھے، عبداللہ کی شادی مکہ مکرمہ کی ایک معزز خاتون ''آمنہ بنت وہب'' سے ہوئی تھی، انہیں ''بی بی آمنہ'' کے بطن سے عام الفیل ۱ سنہ (یعنی جس سال ابرہہ بادشاہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی اسی سال) ۹/ربیع الاول مطابق ۲۲/اپریل ۵۷۱ سنہ، بروز دوشنبہ، بوقت بعد طلوع صبح صادق آپؐ پیدا ہوئے۔

والد صاحب پیدائش سے چھ مہینہ پیشتر بسلسلۂ سفر تجارت مدینہ میں وفات پاچکے تھے، اس لئے آپؐ یتیم پیدا ہوئے، مگر چونکہ آپؐ کے والد دادا کو بہت محبوب تھے، اس لئے آپؐ کی ولادت سے دادا کو بہت خوشی ہوئی اور پیدائش کے ساتویں دن انہوں نے ایک دعوت عام کی، جس میں مکہ کے تمام سرداروں کو مدعو کیا، شروع میں چند دن آپؐ کے چچا ابولہب کی باندی ثوبیہ (جسے آپؐ کی ولادت کی خبر دینے پر ابولہب نے آزاد بھی کردیا) نے آپؐ کو دودھ پلایا، پھر آپؐ کو قبیلہ ''بنوسعد'' کی ''حلیمہ'' نامی ایک دایہ لے گئیں، جو یتیم ہونے کی وجہ سے آپؐ کو لے جانا پسند نہیں کررہی تھیں، مگر جب کوئی دوسرا لڑکا نہیں ملا تو مجبور ہو کر آپ ہی کو لے گئیں اور حضورؐ کے ان کے پاس پہنچتے ہی وہ خیر وبرکات ان کے گھر میں ظاہر ہوئیں کہ جلدی آپ کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں، دودھ چھڑانے کے بعد بھی والدہ سے آپؐ کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت لے لی حتیٰ کہ آپؐ کے ساتھ ایک اہم واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے گھبرا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو والدہ کے پاس پہنچادیا۔

بچپن میں انہیں دونوں دودھ پلانے والیوں نیز حضرت حلیمہ کے صاحبزادی ''شیما'' اور والد صاحب کے ترکہ میں ملنے والی باندی حضرت ''ام یمن'' نے آپؐ کو کھلایا، چھ سال کی

عمر میں والدہ کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی میں مقام "ابواء" میں والدہ صاحبہ وفات پا گئیں، اب آپ ﷺ کے دادا نے آپؐ کی پرورش کی، لیکن آٹھ سال کی عمر میں وہ بھی وفات پا گئے تو آپ کے مشفق چچا خواجہ ابو طالب نے آپ ﷺ کو پالا پوسا، آپ سے بے انتہا محبت کرتے اور ہر موقع پر ساتھ رکھتے تھے، آپ مکہ کے نیز خاندان کے بچوں کے ساتھ گھر کے جانور چرایا کرتے تھے اور جب بڑے ہوئے تو عام اہل مکہ اور خاندان کے لوگوں کی طرح آپؐ نے بھی تجارت سے دلچسپی لی، پچیس سال کے لگ بھگ تھے کہ قریش کی ایک معزز خاتون (جو بیوہ تھیں اور چند پشت اوپر ان کا خاندان آپؐ کے خاندان سے مل جاتا تھا) یعنی حضرت خدیجہ بنت خویلد نے آپ ﷺ کو اپنا مال دے کر تجارت کیلئے بھیجا، ساتھ میں اپنا ایک غلام بھی کر دیا، کافی نفع ہوا، واپسی پر غلام نے حضرت خدیجہ سے سفر کے حالات اور حضور ﷺ کی برکتیں بیان کیں، نیز تجارت کے معاملات سے حضورؐ کے اخلاق کا بھی اندازہ ہوا تو حضرت خدیجہؓ کے دل میں آپؐ سے شادی کا داعیہ پیدا ہوا، پیغام دیا، رشتہ طے ہوا اور نکاح ہو گیا۔

اس وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی، آپؐ اس کے بعد بھی تجارت کرتے رہے، آپؐ نیک اور صالح تو تھے ہی، معاملات نے لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ آپؐ سچے اور دیانتدار بھی ہیں، چنانچہ لوگ آپؐ کے پاس اپنی امانتیں رکھنے لگے۔

عمر کے پینتیسویں سال یہ واقعہ پیش آیا کہ اہل مکہ نے بیت اللہ کی عمارت جو کہ بہت بوسیدہ ہو چکی تھی، اس کی نئی تعمیر کا ارادہ کیا، چنانچہ پرانی عمارت جو خستہ ہو کر جس حال میں رہ گئی تھی وہ گرائی گئی اور نئی تعمیر کا کام شروع ہوا، آپؐ نے بھی اس میں حصہ لیا، اسی موقعہ پر ایک زبردست اختلاف لوگوں میں پیدا ہو گیا کہ "حجر اسود" کو اس کی جگہ پر کون رکھے، اختلاف اتنا شدید ہو گیا کہ جنگ کی نوبت آنے والی تھی، کچھ دانشمندوں نے اس رائے پر

صلح کرا دی کہ اگلی صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں داخل ہو، اس سے فیصلہ کرا لیا جائے، سب نے مان لیا، اتفاق کہ اگلی صبح سب سے پہلے آنے والے آپؐ تھے، سب خوش ہو گئے کہ اب تو بہت صحیح فیصلہ ہوگا، اس لئے کہ آپؐ کی دیانت پر سب کو اطمینان تھا، آپؐ نے ایک چادر منگا کر اپنے ہاتھ سے پتھر کو اس میں رکھ دیا، پھر ہر قبیلہ کے ایک ایک آدمی کو چادر اٹھانے کا حکم فرمایا، سب لے کر چلے، جب اس کی جگہ آ گئی تو آپؐ نے اپنے ہی ہاتھوں سے پتھر کو اس کی جگہ رکھ دیا، اور یوں ایک بہت بڑا فتنہ آپؐ نے ختم فرمایا۔

مکی زندگی:

نبوت کے بعد تیرہ سال:

عمر شریف کے چالیسویں سال آپؐ کو تنہائی اور گوشہ نشینی سے بہت زیادہ اُنسیت ہوتی گئی اور آپؐ مکہ کے قریب ایک پہاڑ "جبل نور" کے ایک غار "حراء" میں جا کر کئی کئی دن قیام فرمانے لگے، ساتھ میں کھانے کا سامان لیتے جاتے، ختم ہونے پھر آ کر لے جاتے اور کبھی حضرت خدیجہؓ پہنچا دیتی تھیں، حتیٰ کہ آپؐ نے اپنی عمر کے چالیس سال پورے فرما لئے اور پھر اللہ نے آپؐ کو نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا، خود آپؐ کی تصریح کے مطابق رمضان المبارک کا مہینہ تھا کہ ایک دن اسی غار میں حضرت جبرئیل آپؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے قرآن کی اولین آیات جو پارۂ عم کی سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات ہیں پڑھوائیں، نیا معاملہ آپؐ پہلے سے واقف نہ تھے، ذمہ داری بھی بڑی تھی، دل پر اثر پڑا، فوراً گھر پہنچے، حضرت خدیجہؓ سے گھبراہٹ اور پورا حال بیان کیا، انہوں نے اطمینان دلایا اور اپنے چچازاد بھائی جو کہ بڑے عیسائی عالم تھے، ان کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپؐ کو نبوت کی خوشخبری سنائی، بہرحال آپؐ رسول بنا دیئے گئے اور اہل مکہ کو دعوت دینے کا حکم دیا گیا

اورآپؐ نے اپنا کام شروع کر دیا۔

سب سے پہلے آپؐ کی اہلیہ ایمان لائیں، ہر وقت ساتھ رہنے والے آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ ایمان لائے اور آپؐ کے رفیق وجانثار دوست حضرت ابوبکرؓ ایمان لائے اور ہر ایک نے دعوت کا کام شروع کر دیا، بالخصوص حضرت ابوبکرؓ نے اور مسلمان آہستہ آہستہ بڑھتے رہے، شروع میں یہ کام پوشیدہ طور پر ہوتا تھا، تین سال بعد آپؐ کو خاص طور سے رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دینے کا حکم ملا تو ایک دن آپؐ نے سب کو ایک پہاڑی کے پاس جمع کیا، پہلے اُن سے اپنے سچے اور دیانت دار ہونے کا اقرار کرایا، پھر اپنی بات رکھی، مگر سنتے ہی سارے لوگ بھڑک اُٹھے اور ناراض ہو کر چل دیئے، بلکہ آپؐ کے خلاف منصوبے بنانے لگ گئے۔

پھر آپؐ کو عام اہل مکہ کو دعوت دینے کا حکم ملا اور دھیرے دھیرے اس میں وسعت ہی ہوتی رہی حتیٰ کہ حج کے لئے آنے والے تمام قبائل میں جا کر آپؐ نے دعوت کا کام کیا، آپؐ اپنا کام کرتے رہے اور دوسری طرف مکہ کے سرکش مشرکین نے آپؐ کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا اور آپؐ کی دعوت کی مخالفت کے ساتھ آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کو پریشان کرنے کا کام شروع کر دیا، خاص طور سے ابولہب جو آپؐ کا حقیقی چچا تھا وہ آپؐ کی دعوت کا سخت مخالف تھا، مستقل آپؐ کے پیچھے پھرتا، آپؐ کو پاگل، مجنوں، شاعر، جادوگر، سب کچھ کہا جاتا، آپؐ کے جسم پر کوڑا، نماز کی حالت میں اونٹ کی اوجھ، گلے میں چادر کا پھندا، راستے میں کانٹا، سب کچھ ڈالا جاتا اور کیا جاتا، دوسری طرف صحابہؓ کو گرم ریت پر کھینچنا، گرم انگاروں پر لٹانا، کوڑے برسانا، چٹائی میں لپیٹ کر دھواں دینا، یہ سب ہوتا، مگر دھن کے پکے کب مان سکتے تھے، نہ صرف یہ کہ ایمان لانے والے جمے رہے، بلکہ دوسرے لوگ ان کے ساتھ ہوتے رہے اور مسلمان تیزی سے بڑھتے رہے حتیٰ کہ چند سال کے عرصے میں حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے بہادران مکہ بھی اس شرف سے مشرف ہو گئے۔

اسی بیچ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی زیادہ پریشانی وتکلیف دیکھ کر ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی، تو ۵ سنہ نبوی میں ۱۲ مرد اور ۴ عورتیں حضرت عثمانؓ کی قیادت میں حبش چلے گئے، ان میں حضرت جعفرؓ بھی تھے، کفار مکہ نے حبش تک مسلمانوں کا پیچھا کیا اور ہدایا وغیرہ کے ذریعہ بادشاہ حبش کو ان مسلمانوں کے حبش سے نکال دینے پر مجبور کرنا چاہا، مگر بادشاہ منصف مزاج وعالم تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس نے مسلمانوں سے حالات معلوم کئے، حضرت جعفر نے سارے حالات سنائے اور کچھ قرآن مجید بھی، تو بادشاہ نے صاف انکار کر دیا، کچھ دنوں بعد ان مہاجرین کو ایک غلط خبر ملی کہ اب مکہ کے حالات ٹھیک ہو گئے ہیں تو یہ تمام لوگ مکہ واپس چل دیئے، قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی، تو بعض لوگ تو چھپ کر مکہ ہی چلے آئے اور کچھ واپس چلے گئے اور چونکہ کفار نے ناکامی کی وجہ سے مسلمانوں کو اور زیادہ ستانا شروع کر دیا تھا، اس لئے دوسری مرتبہ ایک بڑی جماعت نے حبش کی طرف ہجرت کی یعنی تراسی مردوں اور بیس عورتوں نے۔

کفار نے جب دیکھا کہ کسی طرح مسلمانوں کا زور ٹوٹتا ہی نہیں اور دن بدن ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مع اہل خاندان مکمل سوشل بائیکاٹ کیا، چنانچہ تین سال تک آپ کے خاندان کے لوگ ایک گھاٹی میں قید سے رہے، لوگوں سے ہر قسم کے معاملات بند تھے، حتیٰ کہ کچھ بھی کھانے پینے کو نہ ملتا، بچے بلکتے، چمڑے کے ٹکڑے تلاش کر کے پانی میں بھگو کر کھائے جاتے، نبوت کے دسویں سال یہ بائیکاٹ ختم ہوا، لیکن اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیارے چچا ابوطالب اور آپ کی چہیتی بیوی حضرت خدیجہؓ وفات پا گئیں، ان دونوں سے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تقویت تھی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا اور اس سال کا نام آپ ﷺ نے ''عام الحزن'' (غم کا سال) رکھا۔

ان تمام حالات کے باوجود آپؐ اپنا کام کرتے رہے اور دھیرے دھیرے اپنا کام

مکہ کے اطراف اور باہر سے مکہ آنے والوں تک پھیلا لیا، چنانچہ آپؐ دسویں سال ہی مکہ کے قریب ایک مشہور شہر طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے روساء کو دعوت دی، مگر وہاں کے لوگوں نے اس درجہ پریشان کیا کہ بچوں کو پیچھے لگا کر تالیاں بجوائیں، پتھر پھنکوائے، آپ ﷺ کا پورا جسم لہولہان ہو گیا اور خون کی وجہ سے جوتے تلوے سے چپک گئے اور پھر بھی آپؐ نے بددعا نہ فرمائی، واپسی میں پہلی مرتبہ کچھ جن حاضر خدمت ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مشہور قول کے مطابق بارہویں سال معراج کا واقعہ پیش آیا، جس میں راتوں رات آپ ﷺ کو آپؐ کے گھر سے بیت اللہ اور وہاں سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمان کے اوپر اللہ کے حضور میں لے جایا گیا، اس شرف سے آپؐ کے علاوہ کوئی دوسرا مشرف نہ ہوا، اسی مبارک سفر میں نماز فرض کی گئی، نبوت کے گیارہوں سال حج کے موقع پر مدینہ منورہ کے چھ آدمی مسلمان ہوئے، ان کی دعوت پر اگلے سال ۱۲ سنہ نبوی میں ۱۲/ افراد مسلمان ہوئے، جن کے ساتھ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بحیثیت معلم بھیجا گیا، اگلے سال ۱۳ سنہ نبوی میں ۷۳ مرد اور دو عورتیں مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوئے، بیعت کی اور آپؐ سے مدینہ منورہ ہجرت کی درخواست کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے گفتگو فرما کر ہجرت کی صورت میں ان پر آپڑنے والی ذمہ داریوں کو بتایا، اپنی جانب سے اطمینان دلایا اور ان سے اطمینان حاصل کیا، پھر ان بہتر مردوں میں سے بارہ کو آئندہ اسلام کی تبلیغ کرتے رہنے کا ذمہ دار بنا کر اپنی آمد و ہجرت کا وعدہ کر کے ان کو رخصت کیا، اس وقت آپؐ کی عمر ۵۳ سال کو پہنچ رہی تھی۔

ہجرت و نصرت:

اہل مدینہ سے جب ہجرت کی گفتگو ہو گئی تو ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا، ۱۳ سنہ نبوی

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں قیام اختیار فرمایا اور اہل مدینہ کے مخلصانہ ایمان اور پرخلوص تعاون نے پورے عالم میں مدینہ منورہ کو مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ و طاقتور جائے پناہ بنا دیا، چاروں طرف سے مسلمان وہاں پہنچنے لگے۔

یہاں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے کل دس سال گذارے، لیکن آپؐ کی دعوت و تبلیغ کی زندگی میں نیز اسلامی تاریخ میں ہجرت اور مدینہ کے دس سالہ قیام کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ یہاں آ کر مسلمانوں کی تاریخ نے وہ رخ اختیار کیا کہ محض چند سال کے عرصہ میں سارا جزیرۃ العرب اسلام کے زیر سایہ آ گیا اور اس طور پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے پہلے پورے جزیرۃ العرب کو مشرکوں سے خالی کرا لینے کا حکم ہو گیا اور اسلام کی شعاعیں قیصر و قصریٰ کے درباروں تک پہنچنے لگیں۔

مدینہ منورہ پہنچنے پر چونکہ باہر سے آئے ہوئے تمام حضرات بے سروسامان تھے، اس لئے سب سے پہلا کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ تمام مسلمانوں کے درمیان آپس میں بھائی چارگی قائم کی اور آنے والے مسلمانوں کو مقامی مسلمانوں کے ساتھ ان کے گھر و سرمایہ میں شریک کیا، آنے والے مسلمان تو ''مہاجر'' کہلاتے ہی تھے، یہ مقامی حضرات اپنے بے مثال ایثار کی وجہ سے ''انصار'' کہلائے۔

حضرات مہاجرین کی قربانی تو اہم تھی ہی، اس لئے کہ اہل و عیال اور خاندان نیز وطن و جائیداد اور تمام املاک چھوڑ کر پردیس میں جا کر رہ پڑنا معمولی بات نہیں، لیکن چونکہ مکہ میں ان تمام چیزوں کے ساتھ احکام کی بجا آوری تو دشوار تھی ہی اسلام و ایمان کی حفاظت ہی ایک اہم مرحلہ تھی، اس لئے کہ کفار کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹا دیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور نظر کیمیائے اثر نے ان کے دل و دماغ میں ایمان کو اس طرح رچا و بسا دیا تھا کہ چند گھڑی کا مسلمان بھی اس دولت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا تھا، پھر بھی چونکہ ایک مسلسل آزمائش تھی اور احکام شرع پر عمل کی

آزادی نہ تھی، اس لئے جہاں مناسب جگہ سمجھی گئی وہیں ترک وطن کرکے جانے کا حکم دیا گیا، پہلے حبشہ کی طرف کہ وہاں عیسائی حکومت تھی، زیادہ تعاون کی امید تھی، چنانچہ ہوا بھی یہی، لیکن وہاں کے لئے عام حکم نہیں ہوا، اس لئے مسلمان بڑی تعداد میں حبشہ نہیں پہنچے۔

پھر اہل مدینہ کے اسلام کو قبول کرنے اور ان کی پیش کش نیز ہر قسم کی ذمہ داریاں لینے پر عام اجازت ہوئی حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اجازت ملی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ مکرمہ جیسی مقدس سرزمین کو مجبوراً خیرباد کہا اور آج بھی یہی حکم ہر ایسے علاقے اور ان تمام افراد کیلئے ہے جو اس قسم کے حالات سے دوچار ہوں، فرائض تو فرائض اگر سنن ونوافل پر بھی پابندی لگا کر انہیں حرام کا درجہ دیا جانے لگے تو یہی حکم ہوگا۔

چونکہ اس وقت ایمان کی حفاظت اور احکام شرع پر عمل کیلئے ہجرت ایک ضروری چیز تھی، اس لئے ابتدائی چند سالوں میں بلکہ فتح مکہ تک ایمان کے اعتبار کیلئے اور شرعاً مسلمان قرار پانے کیلئے ہجرت شرط تھی اور اگر کوئی شخص اپنے ایمان کا اعلان کرتا اور ہجرت نہ کرتا تو وہ مسلمانوں میں شمار نہ ہوتا، ہاں یہ کہ کوئی شخص واقعی ایسے حالات میں گھرا ہو کہ کافر اسے نکلنے ہی نہ دیتے ہوں۔

مہاجرین کے ساتھ انصار کی قربانی بھی کچھ کم نہ تھی کہ محض دین ومذہب کے رشتہ کی وجہ سے اپنی جائیداد گھر واملاک میں دوسرے کو شریک بنا لینا اور اسی پر بس نہیں بلکہ اگر چند بیویاں ہیں تو ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دینا، دنیا کی تاریخ نے کسی قوم اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے حق میں نقل نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ مہاجرین وانصار دونوں جماعتوں کو نہ صرف ساری امت بلکہ خود حضرات صحابہ کرام کے درمیان بھی افضل ترین افراد شمار کیا گیا، ارشاد خداوندی ہے:

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ	اور جو لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے

اٰوَوْا وَ نَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ـــــ	اور جن لوگوں نے اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہ لوگ ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں۔
وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ـــــ	اور جو مہاجرین وانصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔

ان آیات میں حضرات مہاجرین وانصار کی خصوصی تعریف مذکور ہے، البتہ فتح مکہ کے بعد تیزی کے ساتھ پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کے پھیل جانے کی وجہ سے ہجرت کی یہ ضرورت باقی نہیں رہ گئی، لہٰذا یہ فضیلت بھی ختم ہوگئی، اس لئے فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ بعد کے صحابہ سے افضل ہیں اور ان میں بھی جس کا اسلام قدیم ہے وہ فضیلت میں آگے ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا؛ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی عام اجازت اور عام حکم تھا، اس لئے نہ صرف عام مسلمان بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہجرت فرمائی، جس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی، اسی رات کفار مکہ نے آپس میں مشورہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کو گھیر رکھا تھا کہ آج بوقت تہجد سب مل کر نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کردو، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے اور ان سب کے پاس سے گذرے، ہر ایک کے سر پر مٹی ڈالی اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا، اس مبارک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق، آپ کے محب وجانثار صحابی حضرت ابوبکرؓ تھے، چونکہ اس بات کا خیال تھا کہ کفار مکہ علم ہونے پر پیچھا کریں گے، اس لئے مکہ سے نکل کر فوراً سفر نہیں شروع فرمایا بلکہ تین دن مکہ سے باہر ایک غار ''غار ثور'' میں قیام فرمایا، جہاں تک کفار مکہ تلاش کرتے ہوئے پہنچے مگر پتھر پر پیروں کے نشان نہ پا سکے اور یہ کہ غار کے منھ پر مکڑی کا جالا

اور اندر کبوتر کے انڈے دیکھ کر غار کی طرف توجہ نہیں کی، حضرت ابوبکرؓ کے گھر والوں کو علم تھا، اس لئے کھانے پینے کی پریشانی نہ تھی، چوتھے دن مدینہ کے لئے روانہ ہوئے اور چند دن سفر میں گذار کر مدینہ منورہ پہنچے، پہلے شہر سے باہر ''قبا'' میں آباد انصاری خاندانوں میں قیام فرمایا، قبا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۸ / ربیع الاول ۱۳ سنہ نبوی کو داخل ہوئے اور چند روز وہاں قیام کیا اور یہیں سب سے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی، پھر روانہ ہو کر شہر میں داخل ہوئے راستہ میں ہی ایک خاندان ''بنوسالم'' کے محلہ میں پہلی نماز جمعہ ادا فرمائی، پھر آگے بڑھے، انصار کی جماعتیں ویسے قبا میں آکر ہی شرف زیارت حاصل کرتی رہی تھیں، مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا پورا علم تھا، اس لئے سارے اہل مدینہ حتیٰ کہ عورتوں نے بھی شاندار استقبال کیا، قبا سے شہر کے اندر تک دورویہ انصار حضرات قطار بنائے کھڑے تھے، مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں سات مہنے حضرت ابوایوب انصاری کے مکان پر قیام کیا، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی خود سے بیٹھ گئی تھی، اسی سات ماہ کے عرصے میں مدینہ منورہ کی پہلی مسجد جو آج ''مسجد نبوی'' کے نام سے مشہور ہے، پڑوس کی ایک زمین خرید کر تعمیر کی گئی اور اسی سے متصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حجرے تعمیر کئے گئے، سات مہینے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں میں منتقل ہو گئے اور انہیں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا قیام رہا۔

مدنی زندگی:

ذکر کیا جا چکا ہے کہ مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں مسلمانوں نے ایک نئی پالیسی اور ان کے نظام زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کیا، جس میں نمایاں طور پر دو چیزیں محسوس کی جا سکتی ہیں: اول تو یہ کہ مکہ مکرمہ کی زندگی میں خالص مشرکانہ ماحول میں رہنے کی وجہ سے بنیادی محنت و توجہ عقائد کی اصلاح کی طرف تھی، آیات قرآنیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات عموماً اصلاح عقیدہ، توحید و رسالت کے اثبات اور ذکر آخرت سے متعلق ہوتے اور ان میں کفر و شرک اور انکار آخرت کا رد ہوتا، مگر مدینہ منورہ میں اس کی جگہ اسلامی ماحول و معاشرہ تھا، عقائد پر محنت ہو ہی چکی تھی، اس لئے یہاں ''عملی احکام'' کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ اگر ''عملی احکام'' کی مشروعیت کی تاریخ مرتب کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا بڑا بلکہ اصل حصہ مدینہ منورہ ہی میں نافذ کیا گیا، اسی سے اندازہ لگایئے کہ فرائض میں صرف نماز مکہ مکرمہ میں فرض کی گئی تھی مگر اس کے متعلق بھی اکثر احکام مدینہ منورہ میں سامنے آئے، ۱ سنہ ھ میں ظہر، عصر، عشاء کی رکعتیں چار کی گئیں، ۲ سنہ ھ کے آغاز میں بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم ملا، روزہ و زکوٰۃ کی فرضیت ۲ سنہ ھ میں ہوئی، حج کی فرضیت ۳ یا ۶ سنہ میں ہوئی، معاملات و معاشرت کے احکام، شرعی جرائم اور ان کی سزاؤں کا بیان سب یہیں پہنچ کر ہوا۔

دوسرا نمایاں فرق یہ رہا کہ مکہ مکرمہ میں ہزار مصائب کے باوجود اور مسلمانوں کی صف میں بعض ایسے افراد کے شامل ہو جانے کے باوجود کہ سارا مکہ کیا پورا عرب ان کی ہمت و جرأت اور بہادری کا سکہ مانتا تھا، مگر پھر بھی مسلمانوں کو کفار کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں صبر کا حکم تھا، کسی صورت میں مدافعت کی اجازت نہیں تھی اور مدینہ کی زندگی میں شروع میں تو مدافعت یعنی کافروں کی جنگی تدبیروں و کارروائیوں کو ناکام بنانے کیلئے مقابلہ کی اجازت دی گئی، پھر حکم دیا گیا، پھر ترغیب دلائی گئی اور نہ صرف مدینہ میں رہ کر بلکہ باہر نکل کر اور اسلامی مملکت کی آخری حدوں تک، چنانچہ غزوۂ تبوک جو ۹ سنہ ھ میں ہوا اس میں مسلمان شام کی سرحد تک گئے اور بعد میں یہ حکم محض مدافعت ہی کیلئے نہیں رہ گیا، بلکہ جب کافروں کی جانب سے پورا اطمینان ہو گیا اور ہر طرف سے ان کی جانب سے پیش بندی کا سامان و اطمینان ہو گیا تو اقدامی صورتیں بھی اختیار کی گئیں، مدنی زندگی میں غزوات و سرایا، چھوٹے چھوٹے دستوں اور بڑے بڑے لشکروں کی صورت میں بہت سے مواقع اس قسم کے پیش

آئے۔

مدینہ پہنچ کر چونکہ وہاں پہلے سے مسلمانوں کی مخالف ایک طاقت موجود تھی، یعنی یہودی، اس لئے ان سے معاہدہ کیا گیا تاکہ امن وسکون سے رہا جاسکے، اگرچہ انہوں نے کبھی اس کا پاس نہیں کیا، شروع میں کچھ وقت ضرور خاموشی سے گزارا مگر پھر اہل مکہ اور منافقین کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازش وتدبیر میں لگ گئے، یہی نہیں بلکہ اپنے آباء و اجداد کی اتباع میں کہ انہوں نے بہت سے انبیاء کو قتل کیا تھا، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا، آپؐ پر جادو کیا، ایک مرتبہ آپؐ پر اوپر سے بڑا وزنی پتھر پھینکنے کا منصوبہ بنایا، جب ان کی اس قسم کی حرکتیں پورے طور پر کھل گئیں تو ان کے خلاف پوری کارروائی ہوئی حتیٰ کہ جنگ بھی ہوئی، مدینہ میں ان کے تین بڑے قبیلے تھے، یکے بعد دیگرے سب کو مسلمانوں نے زیر کیا اور جلاوطن کیا، بنو قینقاع کو ۲ سنہ ھ میں، بنو نضیر کو سنہ ۴ ھ میں، بنو قریظہ کو ۵ سنہ ھ میں اور آخر میں بنو نضیر کی آخری پناہ گاہ خیبر کو ۷ سنہ ھ میں زیر کیا، آخر ان کا زور بالکل ہی ٹوٹ گیا۔

ایک دوسری مخالف طاقت اندرونی تھی یعنی منافقین کہ جن میں مدینہ کے مشرکین و یہود سب شامل تھے اور جو ظاہری طور پر مسلمان اور در پردہ کافر تھے اور ظاہر میں مسلمانوں کے دوست اور اندر اندر کافروں اور یہودیوں سے سازباز میں مصروف، مسلمانوں کے بد خواہ اور دوسری اقوام کے خیر خواہ تھے، انہوں نے یہود اور مشرکین سے زیادہ اپنی زبان و حرکات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی، مسلمانوں کا اور آپؐ کا مذاق اڑایا، دل شکنی کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، مگر ان کی ظاہر داری کی وجہ سے ان کو برداشت کیا گیا اور ان کی حقیقت کو پورے طور پر ظاہر نہیں کیا گیا، اگرچہ ان کے کردار کی وجہ سے مخلص اہل ایمان ان کو فوراً پہچان لیتے تھے، اخیر میں ان کے فساد و شر کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے ان کے حق میں سختیاں ضرور اختیار کی گئیں پھر بھی دشمنِ اسلام و

مسلمان ہونے کے باوجود ان کے قتل کا حکم نہیں دیا گیا۔

سابق مخالفین یعنی کفار مکہ تو زور پر تھے ہی، بلکہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو حاصل ہونے والی پناہ اور سکون کی وجہ سے ان کو اور چڑھ پیدا ہوگئی تھی، چنانچہ مسلمانوں کو جڑ سے ختم کر دینے کی پوری کوشش کی، منافقین کو بھڑکایا، یہودیوں کو ورغلایا اور خود بھی جو بن پڑا کیا، نتیجۃً چھوٹی بڑی متعدد جنگوں کی نوبت آئی حتیٰ کہ فتح مکہ کے بعد ان کا سارا زعم اور غرور جاتا رہا اور پھر طائف وحنین کی فتح نے ان کی شکست میں آخری کیل ٹھونک دی اور اس کے بعد پھر مشرکین سر نہ اٹھا سکے۔

مدینہ کے زمانہ قیام میں کام کی سہولت، افراد کی کثرت، ماحول کی موافقت کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ اور اسلامی احکام کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں منظم اور وسیع پیمانہ پر اہم اقدامات کئے گئے، ایک زمانہ انفرادی تبلیغ کا سلسلہ رہا تھا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا، اب اسے اجتماعی صورت دے کر تبلیغ کے لئے جماعتیں بھی بھیجی جانے لگیں، بالخصوص فتح مکہ کے بعد جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں میں متعدد اکابر صحابہؓ کو آپؐ نے داعی ومبلغ کی حیثیت سے بھیجا، مثلاً حضرات علی، خالد بن ولید، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم وغیرہ کو نیز دینی زندگی کو طاقت بخشنے کیلئے مساجد کی تعمیر اور ہر قبیلہ وبستی میں ائمہ ومؤذنین کی تقرری کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا، صلح حدیبیہ کے بعد ۶ سنہ ھ میں آپؐ نے عرب کے ہر چہار طرف کے مشہور بادشاہ وسلاطین کے نام دعوتی گرامی نامے بھی ارسال فرمائے، قیصر شاہ روم، کسریٰ شاہ فارس، شاہ حبش، والی شام، والی یمن، والی مصر وغیرہ کو۔

دوسری طرف غزوۂ خندق میں کفار کی شکست کے بعد جب یہ بات سامنے آگئی کہ کفار عرب کی طاقت بڑی حد تک ٹوٹ چکی ہے اور مسلمان فتح وکامرانی میں آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں تو مدینہ سے دور دراز کی مسافت پر رہنے والے عرب قبائل کے وفود و نمائندے آپؐ کی

خدمت میں آنا شروع ہوئے، یہ وفود چند افراد پر بھی مشتمل ہوتے اور کبھی سو یا اس سے زائد افراد پر بھی، اس کی وجہ سے اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی کہ یہ وفود واپس جا کر اپنے علاقوں و قبائل میں کام کرتے رہے اور اسلام کا حلقہ بڑھتا رہا، اس کا سلسلہ بھی ۶ ھ تک ہلکا رہا، پھر کچھ زور ہوا مگر اتنا نہیں جو کہ فتح مکہ کے بعد ہوا کہ اس کے بعد تو اتنے وفود آئے کہ سنہ ۹ ھ عام الوفود (وفدوں کا سال) قرار پایا حتیٰ کہ آپؐ کی خدمت میں آنے والے وفود کی تعداد سو تک منقول ہے۔

مدینہ منورہ ہی میں اسلامی حکومت کی اولین بنیاد رکھی گئیں اور پہلی مرتبہ اسلام کے زیر سایہ نظم مملکت وحکومت قائم کیا گیا، اس لئے کہ اسلامی حکومت کے قیام کیلئے جس معاشرہ و ماحول اور جن افراد کی ضرورت تھی وہ یہیں آ کر فراہم ہوئے اور اس کی ضرورت اس لئے تھی کہ اسلام کی ہمہ گیری و جامعیت کا ظہور اور اس کے لائے ہوئے بہت سے قوانین کا نفاذ بغیر اس کے ممکن نہیں تھا، یہ اسلامی نظم مملکت، وقت کے تمدن و ضرورت نیز مملکت کی رعایا کے حالات کے عین مطابق تھا اور جس طرح آپؐ ہی دینی ضروریات کے ذمہ دار تھے ایسے ہی اس ضرورت میں بھی اصل مرجع آپؐ ہی تھے، لیکن ظاہر ہے کہ سارے انتظامات تن تنہا آپؐ نہیں سنبھال سکتے تھے، اس لئے مختلف شعبے، متعدد اکابر صحابہ کے سپرد تھے، بڑی و اہم جنگوں میں خود آپؐ ہی قیادت فرماتے بجز غزوۂ موتہ کے اس میں قیادت کا شرف صحابہ کو ہی حاصل رہا، مدینہ کے مقدمات آپ ہی دیکھتے اور دیگر مقامات کے ذمہ دار صحابہ تھے، ایسے ہی دوسرے معاملات کیلئے آپؐ نے ذمہ دار متعین فرما رکھے تھے، جیسے کہ اسفار کے موقع پر مدینہ منورہ کا والی و نگراں کسی صحابی کو بنا جاتے، افتاء کا منصب بھی اصلاً آپؐ کے پاس تھا، بعض اکابر صحابہؓ بھی یہ کام کرتے۔

سنہ ۶ ھ میں اہل مکہ سے ایک معاہدہ ہوا تھا جس کو "صلح حدیبیہ" کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے، اس معاہدہ کی مدت دس سال کی تھی اور اس کی رو سے عرب کے تمام قبائل کو مسلمانوں یا

مشرکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو جانے کی پوری اجازت تھی مگر سنہ ۸ ھ میں خود قریش نے اس کو توڑ دیا تو رمضان سنہ ۸ ھ میں آپؐ نے مکہ کا سفر فرمایا اور کفار مکہ کو زیر کیا اور مکہ پر اسلام کا پرچم لہرایا، اس کی دیر تھی کہ چاروں طرف سے لوگ اسلام پر ٹوٹ پڑے، سنہ ۹ ھ میں مسلمانوں نے ہجرت کے بعد بلکہ اسلام میں حج کی فرضیت کے بعد حج کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امیر الحج تھے، اسی میں تمام مشرکوں سے کئے گئے تمام معاہدات کے آئندہ چند مہینوں میں ختم ہو جانے کا اعلان کیا گیا اور مشرکوں کو آئندہ کیلئے حج سے روک دیا گیا۔

سنہ ۱۰ ھ میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے ایک بہت بڑے مجمع کے ساتھ جس کی تعداد سوا لاکھ تک منقول ہے؛ حج فرمایا، یہ حج چونکہ آپؐ کا آخری حج تھا اس لئے "حجۃ الوداع" (رخصتی کا حج) کہلایا، اسی کے دوران آپؐ کو اسلام کی تکمیل کی بشارت دی گئی اور آپؐ نے اپنے خطبات میں امت کو وہ اصولی ہدایات دیں جو قیامت تک ان کے کام آنے والی ہیں، سفر حج سے واپسی کے بعد مشہور قول کے مطابق سنہ ۱۱ ھ ۱۲/ ربیع الاول کو آپؐ نے وفات فرمائی، صفر کے آخری عشرہ سے ہی آپؐ کی طبیعت ناساز ہوئی، جب زیادہ گر گئی تو حضرت عائشہؓ کے مکان پر ہی مستقل قیام فرمالیا، جب تک ہمت و طاقت رہی نماز مسجد میں ادا کرتے رہے اور امامت بھی فرماتے رہے، آخر میں حضرت ابوبکر نے اس منصب کو سنبھالا، وفات سے چار دن پیشتر یعنی زندگی کی آخری جمعرات کو بعد ظہر آخری خطبہ دیا، اس وقت طبیعت کو کچھ سکون تھا، پھر گرتی و سنبھلتی رہی، وفات کے دن یعنی ۹ یا ۱۲ ربیع الاول بروز دوشنبہ کو اتنی سنبھلی تھی کہ فجر کے وقت حجرہ کا پردہ اٹھا کر مسجد میں لوگوں کو نماز ادا کرتے دیکھا اور تبسم فرمایا اور پھر تیزی سے طبیعت گرنے لگی، بار بار غشی ہونے لگی، سہ پہر کو روحِ مبارک جسم سے جدا ہو کر عالم قدس میں پہنچ گئی، تمام صحابہ کا عجیب حال تھا، مگر ابوبکر جیسا جاں نثار صبر کا پہاڑ بنا ہوا تھا، تجہیز و تکفین شب چہارشنبہ کو ہوئی، حضرات علیؓ، فضل بن عباسؓ، قثیم بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ نے غسل دیا، حضرت طلحہؓ نے

قبر کھودی اور نماز لوگوں نے باری باری بغیر جماعت کے ادا کی اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تدفین ہوئی۔ بوقت وفات ترکہ میں ایک سفید خچر، کچھ ہتھیار اور کچھ زمین چھوڑی اور یہ سب عام مسلمانوں کے حق میں صدقہ کر گئے۔ اس لئے کہ انبیاء کا چھوڑا مال میراث نہیں ہوتا کہ ان کے ورثہ کو دیا جائے۔

حلیہ شریفہ:

قد مبارک: درمیانہ تھا، نہ بہت زیادہ لمبا، نہ ہی نہایت کوتاہ، مگر جس مجمع میں آپؐ تشریف فرما ہوتے سب سے سر بلند ہوتے، رنگ: نہایت گورا، سرخ و سفید اور جاذبیت لئے ہوئے، سر: بڑا، بال: نہایت سفید، نرم و سیدھے، مگر تھوڑے سے بل دار اور کبھی مونڈھے تک ہوتے اور کبھی کانوں کی لو تک اور کبھی تھوڑے اور بڑے، بالوں میں مانگ رہتی، پیشانی: چوڑی و کشادہ و چمکتی ہوئی، ابرو: باریک لمبی کہ دونوں ایک دوسرے سے ملی معلوم ہوتی تھیں، دونوں کے بیچ میں ایک رگ تھی جو غصہ کی حالت پھول جاتی تھی، داڑھی: نہایت گھنی اور پلکیں: لمبی لمبی، سینے پر بالوں کی ایک باریک لمبی دھاری ناف تک تھی، باقی جسم بالوں سے پاک تھا، ہاں پنڈلیوں اور ہاتھ و کندھے پر بھی ہلکے ہلکے بال تھے، کان: نہ بہت لمبے نہ بہت چھوٹے، آنکھیں: سرگیں اور بڑی بڑی نیز سفیدی میں سرخی لئے ہوئے پتلیاں: نہایت سیاہ، رخسار: نرم و پر گوشت، لیکن نہ پھولے ہوئے اور نہ اندر کو دھنسے ہوئے، ناک: بلند و لمبی اور نورانی، منھ: کشادہ، لیکن بہت زیادہ نہیں، ہونٹ: نہایت خوبصورت، دندان مبارک: نہایت سفید و چمکتے ہوئے، جن کے بیچ میں کشادگی تھی، بالخصوص سامنے کے دانتوں میں، گفتگو کے وقت دانتوں سے نور نکلتا معلوم ہوتا اور بوقت تبسم بجلی چمکتی، چہرہ مبارک: نہ بہت لمبا اور نہ بالکل گول، روشن و خوبصورت، چودھویں رات کے چاند سے بھی زیادہ، گردن نہایت خوبصورت، ذرا پتلی و لمبی، دونوں مونڈھے:

پر گوشت اور ذرا فاصلے سے تھے، ہاتھ: لمبے، بدن کا ہر جوڑ قوی و مضبوط، ہتھیلی بھرے پر گوشت، ہتھیلی بہت چوڑی اور ریشم سے زیادہ نرم، بغلیں: بال سے خالی اور سینہ مبارک: کشادہ، پشت: ایسی چمکدار جیسے کہ چاندی سے ڈھالی گئی ہو، انگلیاں: لمبی اور خوشنما، پیٹ: نہایت چکنا ہوا اور نرم سینہ و پیٹ برابر، پنڈلی: ہموار، چمکدار و گول، تلوے: بیچ سے خالی تھے، پیر: بڑے بڑے، دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی جو کبوتر کے انڈے کی مانند گوشت کا ابھرا ہوا حصہ تھا، جس کے ارد گرد تل اور اوپر چند بال تھے، حاصل یہ کہ جسم کا ایک ایک حصہ نہایت معتدل تھا، کوئی عضو و حصہ و چیز ایسی نہ تھی جو دیکھنے میں خوشنما معلوم نہ ہو، کہنے والے نے سچ کہا ہے ؎

صورت تری معیار کمالات بنا کر
دانستہ مصور نے قلم توڑ دیا ہے

اخلاق و عادات:

جس طرح اسلام اپنی جامعیت کے لحاظ سے دوسرے مذاہب میں ممتاز ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تعلیمات کا عملی نمونہ ہونے کے لحاظ سے دوسرے انبیاء و رسل میں امتیاز حاصل ہے، آپؐ نے دنیا کو جن جن چیزوں کی تعلیم دی اپنے آپ کو عملاً ان سے الگ نہیں رکھا، جن عمدہ اخلاق کی تعلیم دی، بخود اپنے عمل سے برت کر دکھایا، چنانچہ قرآن نے آپؐ کے اخلاق کا یہ جامع مرقع پیش کیا ہے: "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (بیشک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں) اور خود آپؐ کا ارشاد ہے کہ: "مجھے اس لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ عمدہ اخلاق کو مکمل کر جاؤں"، اسی لئے آپؐ کی ذات گرامی عمدہ اخلاق کی تمام صورتوں کا مجسم پیکر تھی۔

رقت قلب، زہد و تقویٰ، پاکدامنی و گناہوں سے دوری، حسن معاملہ، حسن خلق، عدل و

انصاف، جودوسخا، ایثار وقربانی، محبت وشفقت، استغناء وقناعت، سچائی وامانتداری، انکساری ومساوات، برداشت وبردباری، عفوودرگذر، دشمنوں یعنی کفارومشرکین اور یہودو نصاری کے ساتھ حسن سلوک، بیمار پرسی وماتم پرسی، مہمان نوازی، سادگی، بے تکلفی، مسکین ومحتاج کی خبر گیری ودلجوئی، صبروشکر، شرم وحیاء، عزم واستقلال، بہادری ودلیری، گداگری وسوال سے نفرت، صدقہ کے قبول کرنے سے پرہیز اور صدقہ کرنے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی، ہدیہ قبول کرنا، نامناسب وبے جاتعریف کی ناپسندیدگی وغیرہ شرافت انسانی کے تمام اوصاف وکمالات جن سے دنیا کبھی آشنا رہی ہو یا نہیں اور جو دنیا کی لغت کی کتابوں میں ملتے ہوں یا نہ ملتے ہوں؛ آپؐ سب کے جامع تھے، حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر آپؐ کے اخلاق کی بابت فرمایا: ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ'' (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؛ پورا قرآن تھا)۔

ہر ایک کو سلام کرنا حتیٰ کہ بچوں کو بھی، بچوں اور چھوٹوں سے خاص طور سے انسیت رکھنا، ان سے دل لگی، ساتھیوں سے آگے نہ چلنا، ان کی طرف پیر نہ کرنا، احباب کے ساتھ گھل مل کر رہنا اور ہر طرح کی باتیں کرنا یعنی دین کی اور گھریلو وذاتی، مناسب حد میں مذاق کرنا، کسی گھر میں حتیٰ کہ اپنے گھر میں بغیر سلام کے داخل نہ ہونا، اپنے ذاتی کاموں کو اپنے ہاتھ سے کرنا؛ مثلاً کپڑوں میں جوں تلاش کرنا، جوتے گانٹھنا، پیوند لگانا، بازار سے سودا لانا وغیرہ، گھریلو کاموں میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹانا، مثلاً گھر میں جھاڑو لگانا، آٹا گوندھوانا، بکری دوہنا، چیخ کر باتیں نہ کرنا، نگاہیں نیچی رکھنا، کسی کی بات پوری توجہ سے سننا اور پورے طور پر اس کی طرف متوجہ ہونا، قدم جما کر اور رواں چلنا، یہ آپؐ کی عادات مبارکہ تھیں، نماز سے خصوصی تعلق تھا حتیٰ کہ اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بتائی، روزہ بکثرت رکھتے اور صدقہ وخیرات کا تو پوچھنا ہی کیا، دنیوی اشیاء میں خوشبو بہت پسند تھی، نیز عورتوں کی طرف رغبت بہت تھی چنانچہ ازواج مطہرات سے بہت تعلق رکھتے تھے، خدام سے

اگر کوئی کام خلاف مزاج بھی ہوجاتا یا کوئی نقصان ہوجاتا تو بھی ناراضگی وناگواری کا اظہار نہ فرماتے، پوری عمر کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، رہن سہن نہایت سادہ وبے تکلف، ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہونے کے باوجود آپؐ کا بستر: چٹائی وبوریہ، تکیہ وگدا: کھجور کی چھال بھرا ہوا اور کھانے میں اکثر تو فاقہ کی نوبت آتی اور یوں بھی زیادہ تر کھجور وپانی اور جو کی روٹیوں پر گذر بسر ہوتا مہینوں گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، آپؐ کی تنگی معیشت کو دیکھ صحابہ کرامؓ بے چین ہو اٹھتے، مگر آپؐ تھے کہ آپؐ نے اپنے لئے ''صبروشکر'' کی زندگی اختیار کر رکھی تھی، کچھ آزمائش کی صورت سامنے آتی تو شکر گذاری کرتے ورنہ صبر کرکے اللہ کی حمد وثنا میں مشغول رہتے۔

خلاصہ یہ کہ ؎

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقَّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(ترجمہ: آپ کی شایان شان وحق کے مطابق آپ کی تعریف ممکن نہیں، قصہ مختصر یہ کہ خداوند قدوس کے بعد آپ ہی سب سے بڑے وبرتر ہیں)

حضورؐ کے معجزات:

''معجزات'' لفظ ''معجزہ'' کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں ''عاجز کرنے والی چیز''، شرعاً ''معجزہ'' ان چیزوں کو کہتے ہیں ''جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی سچائی کو ظاہر کرنے کیلئے عادت کے خلاف ظاہر کرتے ہیں، اور وہ انسانوں کے بس میں نہیں ہوتیں''، عادت کے خلاف کبھی تو یوں ہوتی ہیں کہ وہ چیزیں عام انسانوں کے حق میں پائی ہی نہیں جاتی؛ جیسے ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا، منٹوں میں دور دراز کی مسافت طے کرلینا اور کبھی یوں کہ کسی کام کرنے کے لئے جو اسباب اختیار کئے جاتے ہیں ان کے بغیر ہوجاتی ہیں، جیسے بغیر آگ کے کھانا

Scanned by CamScanner

پکانا، ایسی چیزیں غیر انبیاء سے بھی کبھی ظاہر ہوتی ہیں حتیٰ کہ کافر کے ہاتھ پر بھی، اگر کافر سے ظاہر ہوں تو ''استدراج'' کہتے ہیں اور مومن ولی اللہ کے ہاتھ پر ہو تو ''کرامت'' اور مومن غیر ولی سے ہو تو ''معونت'' کہتے ہیں اور نبی سے قبل نبوت ہو تو ''اِرہاص'' کہتے ہیں اور بعد نبوت ہو تو ''معجزہ''۔

یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے ہر نبی کو معجزہ سے نوازتا ہے اور ہر ایک کو اس کے زمانے کے حالات کے مناسب معجزہ ملتا ہے؛ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ: ''آگ میں صحیح وسالم رہنا تھا''، حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ: ''پہاڑی سے حاملہ اونٹنی کا نکلنا اور فوراً بچہ جننا''، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ: ''عصا جو سانپ بن جاتا تھا اور چمکتا ہوا ہاتھ اور بہت سی چیزیں''، حضرت داؤد علیہ السلام: '' آواز اور لوہے کا ان کے ہاتھ میں موم ہو جانا''۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا: ''دنیا کی تمام مخلوقات پر حکمرانی کرنا اور پرندوں وجانوروں کی گفتگو کو سمجھنا''، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا: ''مردوں کو زندہ کرنا، پیدائشی اندھے وسفید داغ والے کو شفا دینا وغیرہ''، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات: ''بے انتہا، سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اور ایسے جو کہ آپؐ کے وفات کے بعد آج تک برقرار ہیں اور برابر ظاہر ہوتے رہتے ہیں''۔

آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ جس درجہ کا کوئی معجزہ کسی دوسرے نبی کو نہیں دیا گیا، ''قرآن'' ہے کہ آپؐ کے زمانے کے اہل عرب جن کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا اور فصاحت و بلاغت پر اور ان کا یہ ناز وغرور کچھ غلط بھی نہ تھا کہ عربی زبان کے اصل جاننے والے وہی تھے، عربی زبان کے جو اصول وقواعد بعد میں بیان کئے گئے ہیں سب انہیں کے کلام سے ماخوذ ہیں، ایسے لوگ بار بار کے اعلان، مطالبہ وچیلنج اور اپنی جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا مخالفت کے باوجود معمولی سے معمولی پیمانہ پر بھی قرآن کا کوئی جواب نہ پیش کر سکے اور اس وقت سے لے کر آج تک یہ کتاب معجزہ بنی ہوئی ہے اور قیامت تک رہے گی،

اب تک کوئی بھی انسان اس کی جیسی ایک آیت بھی نہیں بنا سکا، اور نہ آئندہ بنا سکے گا۔

اس موقع پر دوسرے چند اہم معجزات ذکر کئے جا رہے ہیں، غزوۂ خندق کے موقع پر جب صحابہؓ خندق کھود رہے تھے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کام میں لگے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اس درجہ فاقہ کی نوبت آئی کہ سب کو پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے، تاکہ کام کرتے رہیں، ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کا علم ہونے پر گھر گئے، وہاں صرف ساڑھے تین سیر جو ملے جسے ان کی بیوی نے فوراً پیس ڈالا اور انہوں نے ایک چھاٹا سا بکری کا بچہ ذبح کر کے بنا ڈالا اور گوشت کو آگ پر رکھ دینے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور چپکے سے عرض کیا کہ: ''مختصر سے کھانے کا انتظام ہو گیا ہے؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند حضرات کے ساتھ تشریف لے چلئے''، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ سن کر عام اعلان فرما دیا کہ: ''چلو فلاں کے گھر؛ دعوت ہے'' اور اُن صحابی سے فرمایا کہ: ''میرے آنے سے پہلے نہ تو پتیلی اتارنا اور نہ روٹی پکانا شروع کرنا''، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹے میں پھونک چھوڑ دی اور برکت کی دعاء کی، پتیلی کے ساتھ بھی اسی طرح معاملہ کیا، پھر فرمایا: ''روٹی پکانے کیلئے مزید ایک عورت کو بلا لو اور پتیلی میں سے سالن نکالتے رہو، مگر اتارنا مت''، پھر کھانا کھلانے کا سلسلہ شروع ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کام کیا گیا، تو اس مختصر سے کھانے سے ایک ہزار افراد نے آسودہ ہو کر کھایا اور سالن سے پتیلی بھری رہی اور روٹیاں برابر پکتی رہیں، کھانے میں برکت کے اور بھی واقعات پیش آئے، ایسے ہی صلح حدیبیہ کے موقع پر ریگستانی علاقے میں لوگوں کو پیاس لگی اور پانی صرف ایک پیالے میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا، اس سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما لیا تو ذرا سا بچ رہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پریشانی عرض کی گئی کہ بس یہی پانی ہے، اس کے علاوہ نہ پینے کو ہے اور نہ وضو کو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک

دست مبارک اس پیالے میں رکھ دیا اور رکھتے ہی آپؐ کی انگلیوں سے چشموں کی مانند پانی پھوٹ پڑا، اس پانی سے ڈیڑھ ہزار افراد نے وضو کیا اور پیا، پانی سے متعلق بھی اس قسم کا واقعہ متعدد مرتبہ پیش آیا۔

ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا اور وحی لکھا کرتا تھا، مگر مرتد ہو کر مشرکوں کے ساتھ ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ’’زمین اس شخص کو قبول نہیں کرے گی‘‘، حضرت ابوطلحہ صحابی فرماتے ہیں کہ: ’’میرا اس علاقے سے گذر ہوا جہاں وہ مرا تھا، میں نے اس کو دزمین پر پڑا دیکھا‘‘، وجہ پوچھی تو لوگوں نے بتایا کہ ’’کئی مرتبہ دفن کر چکے مگر زمین اسے قبول ہی نہیں کرتی‘‘، ام مالک صحابیہؓ ایک ڈبے میں گھی رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا کرتی تھیں، ان کے بچے جب اُن سے سالن کا سوال کرتے اور گھر میں کچھ نہ ہوتا، وہ اسے دیکھتیں تو اس میں گھی موجود ہوتا تھا، حتیٰ کہ ایک دن بالکل نچوڑ لیا تو گھی ختم ہو گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ’’میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے اطراف میں گیا، تو راستے میں جو پہاڑ یا درخت ملا، سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا‘‘، ایک دیہاتی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: ’’مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا کیسے یقین ہو‘‘؟ آپؐ نے فرمایا کہ: ’’میں اس کھجور کے درخت سے اس خوشہ کو بلاتا ہوں وہ آ کر شہادت دے گا‘‘، چنانچہ یہی ہوا، ’’وہ خوشہ آیا‘‘، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ’’اس سے لوٹ جانے کو کہا تو وہ لوٹ گیا‘‘، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھونک ولعاب سے نہ جانے کتنی تکالیف دور ہوئیں، چاند کا ٹکڑے ہو جانا، سورج کا غروب سے رک جانا، نہایت قلیل وقت میں مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے سارے آسمانوں کی سیر کر کے واپس آ جانا، وہ ستون جس پر ٹیک لگا کر آپؐ خطبہ دیتے تھے اس کو چھوڑ دینے پر اس کا بلک بلک کر رونا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چمٹانے سے سسکیاں لینا، پسینے کا بے انتہا خوشبودار ہونا، فضلات کا خوشبودار ہونا، زمین کا پاخانہ کو نگل جانا، بعض

لوگوں نے تین ہزار سے اوپر تک تعداد بتائی ہے اور بعض نے اس سے بھی زیادہ۔

حضورؐ کی پیشین گوئیاں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح بہت سی باتیں ایسی بتائیں جن کا تعلق گذشتہ زمانے سے ہے کہ وہ آپؐ سے پہلے پیش آئی تھیں، ایسے ہی آئندہ پیش آنے والی بہت سی چیزوں کو بھی خبر دی، مثلاً ایک دن خواب میں دیکھا کہ: ’’آپؐ کی امت کے لوگ بحری جہاد کر رہے ہیں‘‘، آپؐ ایک صحابیہ کے گھر میں تھے، آنکھ کھلنے پر بیان کیا، انہوں نے اس جماعت میں شامل رہنے کی دعاء کو کہا، چنانچہ آپؐ نے دعاء فرمادی، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت معاویہؓ کی امارت میں یہ واقعہ پیش آیا، ایک مرتبہ آپؐ کے سامنے فاقہ اور ساتھ ہی ڈکیتی کی شکایت کی گئی تو آپؐ نے مجلس میں موجود ایک صحابی حضرت عدیؓ سے فرمایا کہ: ’’اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک بڑھیا مقام ’’حیرہ‘‘ سے اکیلی چلے گی اور خانہ کعبہ کا طواف کرے گی اور اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ کرتی ہوگی‘‘ اور فرمایا کہ: ’’اگر تمہاری عمر لمبی ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانوں کو جا کھولو گے‘‘، نیز یہ بھی دیکھو گے کہ ’’ایک شخص زکوٰۃ کا سونا و چاندی لئے پھرے گا اور اسے کوئی زکاۃ کا مال لینے والا نہیں ملے گا‘‘، حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’پہلی چیز میں نے دیکھی، دوسرے موقع پر میں خود شریک رہا، تیسری آئندہ لوگ دیکھیں گے‘‘، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ’’وہ بھی پیش آئی کہ بے انتہا تلاش پر بھی زکاۃ کے حقدار نہ ملتے تھے‘‘۔

غزوۂ خندق سے پہلے خندق کی کھدائی میں ایک سخت چٹان نکلی، جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کدال چلا کر ریزہ ریزہ کر دیا، ہر مرتبہ ایک چمک سی ہوئی، آپؐ نے بتایا کہ: ’’میں نے اس چمک میں پہلی مرتبہ شام، دوسری مرتبہ ایران اور تیسری مرتبہ روم کے محلات دیکھے اور یہ کہ ان کی کنجیاں مجھے دے دی گئیں‘‘، یعنی یہ سارے علاقے

میرے اور میرے ماننے والوں کے ہاتھوں میں آئیں گے، چنانچہ یہی ہوا۔

حضرت سراقہ بن مالکؓ جنہوں نے ہجرت کے موقع پر آپؐ کا تعاقب کیا تھا، آپؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ: ''ایک دن تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے''، چنانچہ فتح ایران کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تلاش کر کے وہ کنگن ان کے ہاتھ میں پہنائے، ایک مرتبہ آپؐ نے قیامت سے پہلے حجاز میں ایک ایسی آگ کے ظاہر ہونے کا ذکر کیا جو سینکڑوں میل کی دوری سے دیکھی جائیگی، چنانچہ ۶۵۴ھ میں یہ آگ ظاہر ہوئی، ترکوں سے جنگ کی خبر آپؐ نے سنائی، چنانچہ یہ تاتاری جنہوں نے سارے عالم اسلام کو تہ و بالا کیا وہ ترک ہی تھے، قسطنطنیہ کی فتح کی خبر دی جو ۸۵۵ھ میں محمد فاتح کے ہاتھوں پر فتح ہوا، امت کے تہتر فرقوں میں بٹ جانے کی خبر دی، آل طلحہ جو اسلام سے پہلے بیت اللہ کے کلید بردار (کنجی رکھنے والے) تھے ان کو خبر دی کہ قیامت تک یہ شرف اسی خاندان کے افراد کو حاصل رہے گا، چنانچہ اب تک یہی خاندان بیت اللہ کا کلید بردار ہے۔

نیز قیامت آنے سے پہلے دنیا میں پیش ہونے والے بیشمار واقعات آپؐ نے بیان کئے اور قیامت کی علامات کو خاص طور سے تفصیل و اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا، یہ تمام چیزیں آپؐ کی انہیں ''پیشگوئیوں'' میں سے تھیں جن میں سے بہت سی چیزیں دنیا کے سامنے آچکی ہیں اور باقی ایک ایک کر کے سامنے آکر رہیں گی۔

حضورؐ کے اسماء گرامی:

جس ذات گرامی کے کمالات بے شمار ہیں اس کے ناموں کا بھی بڑی تعداد میں ہونا ضروری ہے، یوں تو ہر آدمی کا اصل نام ایک یا دو ہوتے ہیں، مگر اس کے اندر پائے جانے والے کمالات کی وجہ سے اس کے بہت سے القاب ہوتے ہیں اور وہ بھی نام کی ہی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی کا بھی یہی معاملہ ہے۔

آپؐ کے اصل نام دو ہیں ''احمد'' یہ نام آپؐ کی والدہ نے رکھا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی بشارت میں یہی نام ذکر فرمایا ہے، اس کے معنیٰ ہیں ''خوب تعریف کرنے والا'' اور دوسرا نام ''محمد'' ہے، یہ آپؐ کے دادا نے رکھا تھا اور یہ تورات میں مذکور ہے، اس کے معنی ہیں ''خوب تعریف کیا ہوا'' آپؐ کے اندر دونوں ہی شانیں پائی جاتی تھیں، آپؐ اللہ تعالیٰ کی خوب حمد و ثنا بیان کرنے والے تھے اور ہر زمانے میں آپؐ کی تعریف ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی، کلام پاک میں یہ دونوں ہی نام مذکور ہیں۔

آپؐ کی کنیت ''ابوالقاسم'' تھی اس لئے کہ آپؐ کے صاحبزادگان میں سب سے بڑے حضرت قاسم ہی تھے، ان تین کے علاوہ مشہور اسماء گرامی ۹۸ ہیں، یوں بعض حضرات نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سے اوپر کی تعداد ذکر کی ہے، قسطلانی میں پانچ سو، سیرت شامی میں آٹھ سو مذکور ہیں، ابن قیم نے ایک ہزار کا قول نقل کیا ہے، بعض ہندوستانی علماء نے چودہ سو کی تعداد بتائی ہے، یہ سب دراصل آپؐ کے القاب ہیں اور بعض ایسے ہیں جو آپؐ ہی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں اور بعض دوسرے انبیاء کے لئے رہے، لیکن آپؐ کو ان میں بھی کمال حاصل ہے۔

مُتَوَکِّل (اللہ پر بھروسہ کرنے والے)، مَاحِی (شرک و کفر اور شر و فساد کو مٹانے والے)، عَاقِب (تمام نبیوں کے بعد و پیچھے آنے والے)، نَبِیُّ الرَّحْمَۃ، اَمِیْن، سَیِّدُ وُلْدِ آدَم (تمام اولاد آدم کے سردار)، صَاحِبُ لِوَاءِ الْحَمْدِ (قیامت کے دن نصب کئے جانے والے مخصوص جھنڈے کے مالک جس کا نام لِوَاءُ الْحَمْد (حمد کا جھنڈا) ہوگا)، صَاحِبُ مَقَامٍ مَّحْمُوْدٍ (مقام محمود جو کہ آخرت میں سب سے بلند و بالا مقام ہوگا، اس کے مستحق و مالک)، نَبِیُّ التَّوْبَۃِ (کہ آپؐ کے ذریعہ توبہ عام کر دی گئی)، شَاهِد (تمام انبیاء و اقوام کی بابت گواہی دینے والے)، بَشِیْر (خوشخبری سنانے والے)، نَذِیْر (ڈرانے والے)، رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ (نہایت مہربان و رحم کرنے والے)، مُصْطَفٰی، مُجْتَبٰی

(منتخب وبرگزیدہ)، خَاتَمُ النَّبِيِّيْن (نبیوں کے سلسلہ کو ختم ومکمل کرنے والے)۔

حضورؐ کے خصائص:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص شان کے حامل تھے اور عام مخلوق کے درمیان ہی نہیں بلکہ ساری مخلوق کے مخصوص افراد یعنی حضرات انبیاء کے درمیان بھی، اس لئے کہ جیسے آپؐ ہی کو مقصود بنا کر سارے عالم کو پیدا کیا گیا اور تمام مخلوقات میں سب سے پہلے آپؐ کے نور کو وجود بخشا گیا جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے، اسی طرح منصب نبوت ورسالت سے اصلاً آپؐ کو ہی نوازا گیا؛ دوسروں کو یہ شرف آپؐ کے واسطے سے اور آپؐ کے طفیل میں ملا ہے، اس لئے آپؐ کے جتنے کمالات وخصائص ہوں کم ہیں، یہی وجہ ہے کہ کہنے والوں نے یہ بات کہہ کر بات ختم کردی ہے ۔

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقَّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(ترجمہ: آپ کی شایان شان وحق کے مطابق آپ کی تعریف ممکن نہیں، قصہ مختصر یہ کہ خداوند قدوس کے بعد آپ ہی سب سے بڑے وبرتر ہیں)

بہت سے علماء نے آپؐ کے خصائص کے متعلق ہی تحقیق کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں، بسا اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے اپنے بعض امتیازات بیان فرمائے ہیں، عام خصائص سے قطع نظر بعض حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے چار اہم خصائص بتائے ہیں جو ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱۔عموم وہمیشگی:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاء کی نبوتیں خاص اقوام اور خاص زمانوں کیلئے ہوتی تھیں؛ لیکن حضورؐ کی نبوت نہ کسی خاص جماعت وقوم کیلئے ہے اور نہ کسی خاص زمانہ کیلئے بلکہ تمام جہان کیلئے اور ہر زمانے کیلئے ہے۔

۲۔صحت وحفاظت:- یوں تو آج بھی اسلام کے علاوہ بعض دوسرے آسمانی مذاہب دنیا میں موجود ہیں؛ لیکن وہ مذاہب آج سے بہت پہلے اپنی صحت اور اعتماد کو کھو چکے ہیں بلکہ ماضی قریب کے انہیں مذاہب کے ماننے والے بعض محققین کے اعتراف کے مطابق اب وہ صرف انسانی ہیں، اس لئے کہ ان کی کتابیں آسمانی نہیں رہ گئی ہیں، سب انسانوں کی مرتب کردہ ہیں، موجودہ تحقیقات کے مطابق یہودیت وعیسائیت پر عمل کرنے والے اکابر اہل علم وعمل نے انہیں ترتیب دیا تھا اور پھر ان میں بھی تحریف وتبدیلی ہوتی رہی، جب کہ حضورؐ کی لائی ہوئی شریعت پورے طور پر محفوظ ہے، نہ کسی شوشے کی کمی ہوسکی ہے اور نہ اضافہ، اس لئے کہ اس شریعت کی کتاب خالص آسمانی کتاب ہے، جس کی حقانیت اور اس کے علوم ومعلومات کا انسانی صلاحیتوں سے باہر ہونا، دوست ودشمن سب کو تسلیم ہے، حضورؐ کے عہد سے لے کر آج تک قرآن مجید برابر ہزار ہا افراد کے واسطے سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے اور اس کا کوئی لفظ کیا ایک حرف ونقطہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکا، ساتھ ہی حضورؐ کے تمام اقوال اور افعال واحوال بھی محفوظ ومنقول چلے آرہے ہیں، اس لئے یہ شریعت برابر بے داغ ومحفوظ رہی ہے اور رہے گی۔

۳۔شمول وکمال:- یعنی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اور تمام انسانی ضروریات کو جامع ہونا کہ کسی مرحلہ وموقع پر شریعت سے اعراض کا سوال نہ پیدا ہوسکے، زندگی کے ہر ہر پہلو ومشکل کا علاج وحل اسلام نے پیش کیا ہے، بلکہ ہر شعبے وضرورت کے سلسلہ میں حضورؐ کی زندگی وسیرت سے ہم کو رہنمائی ملتی ہے، جو کمالات سارے انبیاء کو منقسم ہو کر ملے تھے وہ سارے آپؐ میں جمع تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام دعوت وتبلیغ کے حق میں بڑے صابر، حضرت ابراہیمؑ بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے والے اور نہایت سخی، حضرت داؤد علیہ السلام نعمتوں پر بڑے شکر بجالانے والے، حضرات زکریا، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام دنیا سے مستغنی اور خواہشات پر

قابو رکھنے والے، حضرت موسیٰ بہادر وطاقت ور، حضرت ہارونؑ نرم ورقیق القلب اور حضورؐ ان سب کا مجمع، اس لئے ہر پہلو کی رہنمائی آپؐ سے ملی ہے۔

۴- خاتم نبوات ہونا:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت نے ہزاروں سال سے جاری نبوت کے مبارک سلسلہ پر مہر لگادی، اس لئے کہ انسانیت اب اپنے کمال کو پہنچ گئی، اس کے وہ دن گذر گئے کہ جن میں ایسے حالات سامنے آئیں جن کے مقابلے میں موجودہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہو، لہٰذا آپؐ کو آخری نبی بنا کر آپؐ کی نبوت کو آخری نبوت قرار دیا گیا اور قرآنی آیات اور نبوی روایات کی صورت میں آئندہ پیش آنے والی تمام مشکلات ومسائل کا حل پیش کیا گیا، قرآن نے اعلان کیا ہے: ''مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ '' (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں؛ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں) اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''میرا حال اور گذشتہ نبیوں کا حال ایسے سمجھو جیسے کہ کسی شخص نے ایک عمارت نہایت خوبصورت اور جاذب نظر بنائی؛ مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی، ہر آنے والا اور دیکھنے والا تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ آخر یہ ایک اینٹ کیوں نہ لگائی گئی تو میں وہی آخری اینٹ ہوں اور انبیاء کا خاتم ہوں''، وجہ یہ ہے کہ انبیاء کی آمد یا تو اس وجہ سے ہوتی رہی کہ کوئی نبی ورسول نہیں آیا، یا اس وجہ سے کہ پچھلی شریعت میں ردوبدل کردی گئی، یا یہ کہ پچھلی شریعت ضرورتوں کی کفایت کرنے والی نہ تھی مگر حضورؐ کے بعد ان میں سے کسی بات کا بھی سوال نہیں اور ان آخری صدیوں کی علمی وصنعتی ترقیوں کی وجہ سے شبہ نہ ہو کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت انسانیت کمال عقل کو نہیں پہنچی تھی بلکہ اب پہنچی ہے، اس لئے کہ موجودہ ترقی محض واقفیت ومعلومات کی زیادتی اور آلات عمل کی ترقیات کا نتیجہ ہے، ورنہ عقل وفکر کی بنیاد ومعیار وہی ہے جو اس عہد میں تھی اور جسے سامنے رکھ کر انسانیت کو شریعت محمدیہ سے یہ کہہ کر سرفراز کیا گیا ہے کہ لو بس اب یہ آخری رہنمائی ہے، اس کے بعد

کسی نئی رہنمائی کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ حالات کے پیش آنے پر اسی سے حل نکال سکو گے۔

حضورؐ کی اولاد:

مشہور قول کے مطابق حضورؐ کی اولاد کی تعداد سات تھی، تین بیٹے اور چار بیٹیاں، ان میں صرف ایک بیٹے آپؐ کی باندی حضرت ماریہؓ سے تھے اور باقی سب کی والدہ حضرت خدیجہؓ اور ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ کے علاوہ سب کی وفات آپؐ کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔

بیٹے:

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ حضورؐ کے تین بیٹے تھے، قاسم، عبداللہ، ابراہیم، حضرت قاسم سب سے بڑے تھے یعنی تمام اولاد میں، انہیں کے نام پر آپؐ کی کنیت ''ابوالقاسم'' رہی، بچہ ہی تھے کہ وفات پاگئے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: ''اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ سواری پر بیٹھنے لگ گئے تھے''، ان سے چھوٹی حضرت زینب، پھر رقیہ، پھر ام کلثوم، پھر حضرت فاطمہ اور ان کے بعد عبداللہ تھے، انہیں کا لقب ''طیب وطاہر'' بھی تھا، یہ بھی بچپن میں وفات پاگئے، حضرت قاسم سے لے کر حضرت عبداللہ تک سب کی ولادت مکہ میں ہوئی اور ان دونوں کی وفات بھی وہیں ہوئی۔

تیسرے بیٹے جو تمام اولاد میں سب سے چھوٹے تھے، حضرت ابراہیم ہیں، مدینہ منورہ میں ہجرت کے آٹھویں سال پیدا ہوئے اور دودھ چھڑانے سے پہلے وفات پاگئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات پر بڑا رنج ہوا۔ رضی اللہ عنہم

بیٹیاں:

حضورؐ کی بیٹیاں چار تھیں: زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمہ، زینب سب سے بڑی اور فاطمہ سب سے چھوٹی تھیں، چاروں کی والدہ حضرت خدیجہؓ تھیں اور چاروں مکہ مکرمہ میں

پیدا ہوئیں اور چاروں کی وفات مدینہ منورہ میں شادی ہوجانے کے بعد ہوئی، حضرت فاطمہؓ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور باقی تین کی حضورؐ کی وفات سے پہلے، چونکہ حضرت فاطمہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت چہیتی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رشتہ اور حضرات حسنینؓ کی وجہ سے ان کی شہرت بھی زیادہ ہوئی، اس لئے بہت سے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی ایک بیٹی تھیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، تاریخ وسیرت کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں آپؐ کی چار بیٹیوں کا ذکر آیا ہے۔رضی اللہ عنہن۔

حضرت زینب:

حضرت زینب حضورؐ کی بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئیں اور بڑے ہونے پر خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع سے نکاح ہوا جو قریش کی شاخ بنوعبد مناف سے تعلق رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشوں کا حضورؐ کے مخالف ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، اس لئے دعوت حق کان میں پڑتے ہی لبیک کہی اور اسلام کو اختیار کیا، شوہر کافر ہی رہے حتیٰ کہ اس کی وجہ سے حضورؐ کے ساتھ ہجرت بھی نہ کرسکیں بلکہ غزوۂ بدر کے موقع پر ابو العاص کفار مکہ کی رعایت میں خود بھی مسلمانوں سے لڑنے آئے اور گرفتار ہوئے، جب فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کا مسئلہ آیا تو حضرت زینبؓ نے مکہ مکرمہ سے ان کے فدیہ میں حضرت خدیجہؓ کا دیا ہوا ایک ہار بھیجا، حضورؐ پر اس کا بہت اثر ہوا اور صحابہؓ سے مشورہ کر کے ابوالعاص کو آزاد کردیا؛ لیکن یہ شرط لگادی کہ جاتے ہی حضرت زینب کو بھیج دیں، انہوں نے مکہ پہنچ کر شرط کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ساتھ ان کو روانہ کردیا، راستے میں کافروں نے حملہ کیا، ایک نیزہ کی چوٹ کی وجہ سے حضرت زینبؓ اونٹ سے گر پڑیں، اتنی دیر میں کنانہ ہوشیار ہوگیا تھا، اس نے للکار کر مقابلہ شروع کیا تو باز آگئے مگر ابوسفیان نے کہا چپکے سے لے جاؤ، اس میں ہماری بدنامی ہوگی، چنانچہ یہی کیا گیا، راستے میں حضرت

زیدؓ نے ان کو آکر لے لیا۔

۶ھ میں ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ مع مال واسباب دوبارہ گرفتار ہوئے، حضرت زینب نے امان دے کر ان کو بچایا اور ان کی سفارش کی وجہ سے ان کا مال واسباب بھی واپس کردیا گیا، مکہ جا کر انہوں نے لوگوں کی امانتیں واپس کیں اور پھر اسلام لاکر مدینہ ہجرت کرآئے اور حضرت زینبؓ سے دوبارہ ان کا نکاح کردیا گیا، ان کا کمال اخلاق تھا کہ شرک اور حضورؐ کی مخالفت کے باوجود مکہ کی طویل رفاقت میں حضرت زینبؓ کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی، اسی لئے حضرت زینبؓ بھی ان سے بے انتہا محبت کرتی تھیں، لیکن اس کے بعد حضرت زینبؓ زیادہ دنوں باحیات نہ رہیں، ۸ھ میں انتقال فرماگئیں، حضرت ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور ام عطیہؓ نے غسل دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی یادگار چھوڑی، صاحبزادے جن کا نام ''علی'' تھا ایک قول کے مطابق جوان ہوکر غزوۂ یرموک میں شہید ہوئے، فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹ پر یہی بیٹھے ہوئے تھے۔

صاحبزادی ''امامہ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی بلوغ کو پہنچ گئی تھیں، حضورؐ کو ان سے بڑی محبت تھی، بعض اوقات نماز کی حالت میں بھی ان کو اپنے کندھے پر بٹھائے رکھتے اور سجدے میں جاتے تو اتار دیتے تھے، ایک مرتبہ آپؐ کے پاس سونے کا ایک ہار آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ: ''یہ ہار میں اپنے گھر والوں میں جو سب سے زیادہ مجھ کو محبوب ہوگا اسے دوں گا'' اور حضرت ''امامہؓ'' کی گردن میں اسے ڈال دیا، نکاح حضورؐ کی وفات کے بعد ہوا، چوں کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال حضورؐ کی وفات کے چند ہی ماہ بعد ہوگیا تھا، اس لئے حضرت علیؓ نے انہیں سے نکاح کرلیا تھا اور ۴۰ھ میں جب واقعہ شہادت پیش آیا تو اپنے چچازاد بھائی نوفل کے صاحبزادے مغیرہ کو ان سے نکاح کی وصیت کرگئے، چنانچہ

انہوں نے حسب وصیت نکاح کرلیا، اگرچہ حضرت معاویہؓ بھی ان سے نکاح کی خواہش رکھتے تھے، وفات حضرت مغیرہؓ کے گھر میں ہوئی، اولاد کے متعلق اختلاف ہے۔

حضرت رقیہؓ:

حضرت رقیہؓ: حضورؐ کی دوسری بیٹی ہیں جو کہ حضرت زینبؓ سے چھوٹی تھیں، ۳۳ سنہ قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، دو نکاح ہوئے، پہلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے پیشتر ابولہب کے لڑکے عتبہ کے ساتھ، جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کا اعلان کرنے کے بعد باپ کے کہنے کی وجہ سے طلاق دے دی، رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی، پھر دوسرا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوا، حضرت عثمانؓ حبش کی جانب ہجرت کے دونوں سفر میں شامل رہے، ان کے ساتھ حضرت رقیہؓ بھی تھیں، ہجرت کے موقع پر دونوں کی رفاقت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''حضرت ابراہیمؑ ولوطؑ کے بعد یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیوی کو لے کر ہجرت کی ہے''، مدینہ کی ہجرت کی خبر ملتے ہی مکہ آگئے اور پھر حضورؐ کی اجازت سے دونوں ہی حضرات مدینہ تشریف لے گئے۔

۲ سنہ ھ میں عین معرکۂ بدر کے دنوں میں جس دن فتح کی خبر مدینہ پہنچی اسی دن وفات ہوئی، علالت کا سلسلہ معرکہ بدر کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کے پہلے سے جاری تھا اور علالت کا باعث عجیب قسم کے دانے تھے، ان کی علالت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو ان کی تیمارداری کیلئے روک دیا تھا، غزوہ سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات کا علم ہوا، اس حادثہ کا آپؐ پر اور باقی بہنوں پر بڑا اثر ہوا، حبش کے زمانہ قیام میں ایک صاحبزادہ کی ولادت ہوئی تھی جن کا نام عبداللہ تھا، جو ۴ سنہ ھ میں چھ سال کی عمر میں وفات پا گئے، جس کا سبب یہ ہوا کہ ایک مرغ نے چہرے پر چونچ مار کر ایسی چوٹ پہنچائی کہ وہ جان لیوا بن گئی۔

حضرت ام کلثومؓ:

حضرت ام کلثوم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری بیٹی تھیں، ان کا پہلا نکاح ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوا تھا، اس نے بھی اپنے بھائی کے ساتھ اپنے باپ کے کہنے کی وجہ سے ان کو طلاق دے دی تھی، رخصتی ان کی بھی نہیں ہوئی تھی، اس لئے کہ عمر کم تھی۔

۳ سنہ ھ میں حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ سے نکاح ہوا اور ان سے نکاح ہونے کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو ''ذوالنورین'' کا لقب دیا گیا، نکاح کے چھ سال بعد شعبان ۹ سنہ ھ ان کی بھی وفات ہوگئی، ان کی وفات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا سخت صدمہ پہنچا، اس لئے کہ چار بیٹیوں میں سے تین یکے بعد دیگرے وفات پا چکی تھیں۔

حضرت فاطمہؓ:

حضرت فاطمہؓ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی اور تمام بیٹیوں میں سب سے چھوٹی بیٹی تھیں، نام فاطمہؓ اور لقب زہراء و بتول تھا، ولادت ۱ سنہ نبوی یا اس سے کچھ پہلے ہوئی، ذی الحجہ ۲ سنہ ھ میں حضرت علیؓ سے نکاح ہوا، اگرچہ ان سے نکاح کی درخواست حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے پیش کی تھی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا، پھر حضرت علیؓ نے اس خواہش کا اظہار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کی رضامندی معلوم کر کے نکاح کر دیا، مہر پانچ سو درہم کی مالیت قرار پائی جو ایک زرہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک یمنی چادر کی صورت میں پیش کیا گیا، شادی کے بعد حضرت فاطمہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہو کر دوسرے مکان میں منتقل ہوگئیں، اس سے پہلے خود حضرت علیؓ بھی حضورؐ کے ساتھ ہی رہتے تھے، گھر علاحدہ ہونے کی وجہ سے کچھ ضروری گھریلو

سامان بھی درکار تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور جہیز بان کی چار پائی، چمڑے کا گدا جس میں کھجور کی چھال و پتیاں بھری تھیں، ایک چھاگل، دو مٹی کے گھڑے، ایک مشک اور دو چکیاں عنایت کیں، ان کی شادی کو دس سال بھی نہ ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، حضرت فاطمہ ؓ کو حضورؐ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، اس لئے کہ ہر دو کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت تھی اور دوسری بیٹیوں کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، کہیں سفر میں جانا ہوتا تو سب سے آخری اور آنے پر سب سے پہلی ملاقات حضرت فاطمہ ؓ سے ہی فرمایا کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد ۳ رمضان ۱۱ھ بروز منگل آپ بھی وفات پا گئیں اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وفات سے پیشتر جو دو باتیں ان سے فرما گئے تھے وہ دونوں پوری ہوگئیں کہ اپنے مرض وفات میں آپؐ نے ایک دن حضرت فاطمہ ؓ کو بلا کر دو باتیں فرمائیں ایک تو یہ کہ میں اسی مرض میں وفات پا جاؤں گا تو وہ رونے لگیں اور یہی ہوا، دوسری یہ کہ میری وفات کے بعد گھر والوں میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے ملو گی تو ہنس پڑیں اور یہی ہوا بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے لوگوں میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی، مشہور قول کے مطابق ''دار عقیل'' میں ان کو دفن کیا گیا اور سب سے پہلے پردہ میں رکھ کر آپ کا ہی جنازہ لے جایا گیا، اس لئے کہ شرم وحیا کی زیادتی کی وجہ سے خود انہوں نے اس کی وصیت کی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں حضورؐ سے سب سے زیادہ ملتی جلتی حضرت فاطمہ ؓ ہی تھیں، بڑی سمجھ دار و ذہین تھیں، حضورؐ نے ان کی زندگی میں حضرت علی ؓ کو کسی دوسرے نکاح کی اجازت نہیں دی، وفات کے بعد حضرت علی ؓ نے دوسرے نکاح کئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اور چہیتی بیٹی ہونے کے باوجود انتہائی زاہدانہ و پر مشقت زندگی گزاری، گھر کا سارا کام خود اپنے ہی دست مبارک سے انجام دیتی تھیں،

حضرت علی ؓ کے کہنے سے ایک مرتبہ بڑی ہمت کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خادم کا سوال کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لاڈلی کو پریشانیوں کے دور کرنے کا دوسرا ہی نہایت عجیب حل بتایا، فرمایا کہ: ''دن بھر کے کام کے بعد تھکن مٹانے کیلئے رات کو سوتے وقت ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو''۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حد درجہ محبت ہی کی وجہ سے ان کے حق میں زیادہ زینت اور بناؤ سنگار کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت علی ؓ نے ان کو ایک سونے کا ہار دیا تو معلوم ہونے پر آپؐ نے فرمایا: ''لوگوں سے کہلانا چاہتی ہو کہ رسول کی بیٹی آگ کا ہار پہنتی ہے''، بڑی راست باز و سچی تھیں، حد درجہ حیادار تھیں، آپ پڑھ چکے ہیں کہ حیا کی زیادتی کی وجہ سے جنازہ کو پردہ میں رکھ کر لے جانے کی وصیت کی تھی، ان کی خوبیوں اور حضورؐ سے رشتہ و محبت کے تعلق کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی افضل ترین عورتوں میں ذکر فرمایا ہے، بلکہ جنت کی تمام عورتوں کا سردار بتایا ہے۔

اولاد حضرت فاطمہ ؓ:

حضرت فاطمہ ؓ کی اولاد میں تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں، صاحبزادیوں میں ایک زینب اور دوسری ام کلثوم، حضرت حسین ؓ کی شہادت کے موقع پر دونوں بہنیں ساتھ تھیں، حضرت ام کلثوم سے حضرت عمر ؓ نے نکاح فرمایا تھا، محض اس خیال سے کہ آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے فائدہ اٹھا سکیں۔

صاحبزادگان میں سب سے بڑے حضرت حسن ؓ، پھر حضرت حسین ؓ اور تیسرے نمبر پر حضرت محسن ؓ تھے، حضرت محسن کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا، باقی دونوں حضرات نے بڑے ہو کر وہ شہرت حاصل کی کہ آج ایک ایک مسلم بچہ ان دونوں حضرات کے نام و عظمت سے واقف ہے اور انہیں دونوں سے حضرت فاطمہ ؓ اور ان کے واسطے سے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی نسل کا سلسلہ آگے بڑھا اور آج تک جاری ہے، حضرت حسنؓ کی ولادت رمضان ۳ سنہ ھ میں ہوئی، علم وفضل کا تو پوچھنا ہی کیا، آپ سے تیرہ حدیثیں مروی ہیں، مشہور ہے کہ صورت وسیرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھے، حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہیں کو خلیفہ بنایا گیا، لیکن حالات کے نامناسب ہونے کی وجہ سے چھ ہی مہینے بعد آپ نے خلافت حضرت معاویہؓ کے سپرد کر کے سالہا سال کے اختلاف کو ختم کر دیا اور یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ شمار کیا گیا، صفر ۴۹ سنہ ھ یا ۵۰ سنہ ھ میں حضرت معاویہؓ کے دور امارت میں زہر کے اثر سے مدینہ منورہ میں وفات پائی اور وہیں اپنی والدہ کے پاس دفن کئے گئے، احادیث میں منقول ہے کہ: ''امام مہدی جو قیامت سے پہلے دنیا کی اصلاح کیلئے پیدا ہوں گے وہ حضرت حسنؓ کی اولاد میں ہوں گے''۔

حضرت فاطمہؓ کے دوسرے نامور صاحبزادے حضرت حسینؓ تھے، جنہوں نے حق کی خاطر جان قربان کر دینے کی وجہ سے اپنے بڑے بھائی سے زیادہ شہرت حاصل کی، آپ کی ولادت شعبان ۴ سنہ ھ میں ہوئی، جسم کے بعض حصوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھے اور بمقابلہ حضرت حسنؓ کے اپنے والدین کو زیادہ محبوب تھے، علم و فضل میں بھی یکتا تھے، حضرت حسن کی صلح کو اگرچہ اچھا نہیں سمجھا تھا، مگر حضرت معاویہؓ کی خلافت کو تسلیم کیا، حتیٰ کہ ان کی وفات ہوگئی اور یزید کا معاملہ آیا تو آپؓ نے اس کے لئے بیعت نہ کی، دوسری طرف کوفہ کے جھوٹے مدعیان محبت وتعلق نے آپ کو بار بار کوفہ بلایا، احباب واعزہ کی مخالفت کے باوجود آپ نے سفر کیا اور یہ سفر کربلا کے میدان میں آپ اور آپ کے تمام مرد رفقاء کی شہادت پر ختم ہوا، جس میں آپ کے دو صاحبزدگان بھی شہید ہوئے، صرف ایک صاحبزادے باحیات بچے، جن سے آپ کا خاندان آگے چلا، یہ واقعہ بروز جمعہ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ سنہ ھ کا ہے، نہایت عابد وزاہد، کثرت سے حج کرنے والے اور غرباء کا خیال کرنے والے تھے، آپ سے بھی متعدد روایات مروی ہیں۔

انبیاء کی ازدواجی زندگی

جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے جسم وصحت کے لحاظ سے صحیح وسالم بنایا ہو اس کے لئے مکمل انسانی زندگی گذارنے کی خاطر ان فطری تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے؛ جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھے ہیں، خاص طور سے ان لوگوں کیلئے جو اس دنیا میں انسانی زندگی کیلئے نمونہ بن کر آئے ہوں، اس لئے کہ انسان عادۃً اور عام طور سے ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے بلکہ ان کے پورا کرنے پر مجبور ہے، ورنہ عام حالات میں اس کے لئے جینا مشکل ہو جاتا ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے انسان ہونے اور پورے طور پر صحت مند اور تمام بشری فطری تقاضوں کو پورا کرنے والا ہونے میں یہی حکمت ہے جسے بہت سے گمراہ سمجھ نہ سکے اور وہ حضرات انبیاء کے انسان ہونے کی بناء پر ان سے برگشتہ ہوگئے، حالانکہ یہ چیز تو اور زیادہ ان کی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہ ہے کہ وہ پورے طور پر اس کے ہو کر رہیں اور اپنے شب وروز، شادی وغم، رنج وراحت، صحت وبیماری، فقر وتونگری ہر حال میں اس کے احکام کے پابند رہیں، نہ تو وقت کا کوئی لمحہ طاعت سے خالی ہو اور نہ کوئی عمل حدود عبادت سے باہر ہو اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی اس کو کر کے دکھانے والا نہ ہو، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کس طرح زندگی کے تمام حالات واوقات کو عبادت واطاعت کا پابند بنایا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کو انسانی جماعت میں سے بنا کر اور ان سے پوری پوری انسانی زندگی گذروا کر یہی سبق پڑھایا ہے، اس لئے عموماً انبیاء کرام کے حالات میں عیالی زندگی کا ذکر ملتا ہے، مشہور انبیاء میں سے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی اور بعض کہتے ہیں کہ: ''انہوں نے بھی کی البتہ بیوی سے قرب نہیں اختیار کیا'' اور اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی شادی

نہیں فرمائی مگر جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ’’قیامت سے پہلے جب وہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو شادی فرمائیں گے‘‘، حاصل یہ کہ شادی تمام انبیاء کی سنت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنت ہے، جس کے متعلق آپ نے یہاں تک فرمادیا کہ:
’’جو میری سنت سے بھاگے؛ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں‘‘۔

بہر حال انبیاء کرام نے نبوت کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ بشریت کے تمام تقاضوں کو پورا کیا، لیکن اس طرح کہ کسی تقاضے کا پورا کرنا، شہوت ونفس پرستی کی وجہ سے نہیں، بلکہ کھانے پینے اور دیگر معاشی حالات میں صبر وشکر سے کام لیا اور دوسری خواہشات کو پورا کرنے میں بھی حکم خداوندی کو سامنے رکھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک ہزار عورتیں تھیں؛ بیویاں وباندیاں ملاکر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی چار بیویاں تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ کے حکم سے چند شادیاں فرمائیں اور ان تقاضوں کو پورا کرنے نیز بیویوں کے حقوق ادا کرنے کے سلسلہ میں امت کے سامنے ایک نمونہ پیش فرمایا۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل کہ آپ کے اس عمل میں شہوانی جذبہ کارفرمانہ تھا یہ ہے کہ: ’’آپؐ کی تمام بیویوں میں سے صرف حضرت عائشہؓ بوقت نکاح کنواری تھیں، جن کا نکاح خود ان کے والد محترم حضرت ابوبکرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت کی وجہ سے حضرت خدیجہؓ کا انتقال کے بعد کردیا تھا اور وہ بھی نکاح کے وقت بہت کم عمر تھیں، حتیٰ کہ مدینہ منورہ پہنچ کر رخصتی کے بعد تک گڑیاں کھیلتی تھیں، باقی تمام ازواج مطہرات آپؐ کے نکاح میں آنے سے پہلے ایک ایک دودو شادیاں کرچکی تھیں‘‘، مزید یہ کہ سب سے پہلی شادی آپؐ نے چالیس سالہ حضرت خدیجہؓ سے کی تھی اور باقی بھی عمر میں کچھ زیادہ کم نہ تھیں اور بجز تین کے سارے نکاح مدینہ پہنچ کر ہوئے اور بوقت ہجرت آپؐ کی عمر شریف ۵۳ سال تھی، مکہ میں سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا اور دوسرا ان کے

انتقال کے بعد حضرت سودہؓ سے جو خود بیوہ تھیں اور تیسرا حضرت عائشہ سے جو کہ بچی تھیں۔

علماء نے آپؐ کے متعدد نکاح فرمانے کی ایک بڑی واہم وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ:
’’نبی ورسول کی زندگی، اندر وباہر سب جگہ کی نمونہ ہوتی ہے، گھریلو زندگی کے طور وطریق؛ اولاد اور بیویاں ہی بیان کرسکتی ہیں اور ہر ایک کے سامنے تمام حالات کا آنا ضروری نہیں، پھر یہ کہ ہر ایک کسی واقعہ کو یاد کرنے وبیان کرنے میں بھی یکساں نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت تھی کہ جیسے آپ کے بیرونی کردار کو دیکھنے اور بیان ونقل کرنے والے بہت سے تھے اندرونی کردار کو دیکھنے والے بھی متعدد ہوتے‘‘، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ ان حضرات ازواج مطہرات نے کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھریلو حالات امت کے سامنے پیش فرمائے اور نہ صرف یہ بلکہ امت کی نہ جانے کتنی علمی وعملی مشکلات حل فرمائیں، علم ومعرفت میں ہر ایک کا بڑا درجہ تھا، حتیٰ کہ بعض محققین علماء نے سب کو مجتہدین میں سے شمار کیا ہے اور بالخصوص حضرت خدیجہؓ وحضرت عائشہؓ کے کارنامے، آپ ان کے حالات میں پڑھیں گے۔

ازواج مطہرات
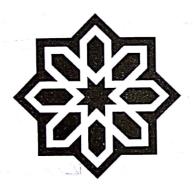
کل ۱۷ عورتوں سے آپؐ کے خصوصی تعلقات رہے، ان میں سے دو تو باندیاں تھیں جن کو "مقوقس بادشاہ مصر" نے بطور ہدیہ آپؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا، ایک "ماریہ"، دوسری "سیرین"، حضرت ابراہیم حضرت ماریہ کے بطن سے ہی تھے، ایک صاحبہ نے اپنے آپ کو آپؐ کیلئے بطور ہبہ پیش کیا تھا اور آپؐ کے حق میں اس طور پر ان کو قبول کر لینا جائز تھا، مگر آپؐ نے انہیں اپنی خدمت میں نہیں رکھا، ایک صاحبہ کیلئے آپؐ نے پیغام نکاح بھیجا تھا تو ان کے والد نے معذرت کر دی تھی، باقی تیرہ عورتوں سے آپؐ نے نکاح فرمایا تھا، جس میں سے دو یعنی حضرت عمرہ اور حضرت امیمہ بنت نعمان کو کچھ وجوہات کی بناء پر صحبت سے پہلے طلاق دے دی تھی، گیارہ باقاعدہ برابر آپؐ کے نکاح میں رہیں اور "امہات المومنین" (تمام مومنوں کی ماں) کے لقب سے یاد کی گئیں، تین یعنی خدیجہؓ، سودہؓ و عائشہؓ سے آپؐ نے قبل ہجرت نکاح فرمایا تھا اور باقی سے ہجرت کے بعد، حضرت خدیجہؓ تو تن تنہا نکاح میں رہیں، ان کے بعد حضرت سودہؓ بھی تنہا رہیں؛ اس لئے کہ حضرت عائشہؓ چھوٹی تھیں، مدینہ منورہ پہنچ کر یکے بعد دیگرے نکاح ہوتے رہے، بوقت وفات ان میں سے ۹ باحیات تھیں، دو یعنی حضرت خدیجہؓ قبل ہجرت اور حضرت زینب بنت خزیمہؓ آپؐ کی وفات سے پہلے وفات پا گئی تھیں، آپؐ کے بعد سب سے پہلے حضرت زینب بنت جحشؓ کا انتقال ۲۰ سنہ ھ اور سب سے آخر میں حضرت ام سلمہؓ کا ۶۳ سنہ ھ میں ہوا، بجز ام حبیبہؓ کے تقریباً سب کا مہر پانچ سو درہم کے آس پاس تھا۔

حضرت خدیجہؓ:

نام: خدیجہ، کنیت: ام ہند، لقب: طاہرہ، والد کا نام: خویلد، والدہ: فاطمہ بنت زائدہ،

سلسلہ نسب: پانچویں پشت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے، کل عمر: تقریباً ساڑھے پینسٹھ سال، ولادت: حضورؐ سے تقریباً ۱۵ سال پیشتر، عمر بوقت نکاح: چالیس سال، کل مدت رفاقت ۲۵ سال، ۱۵ سال قبل نبوت، ۱۰ سال بعد نبوت، وفات: رمضان ۱۰ سنہ نبوی میں، قبر: مقام حجون میں، مہر بیس نوجوان اونٹنیاں یا پانچ سو درہم۔

حضورؐ سے پہلے دو نکاح کئے، پہلا نکاح: ابو ہالہ ابن زُرارہ سے؛ جن سے دو لڑکے: ہالہ اور ہند پیدا ہوئے، دوسرا نکاح: عتیق بن عائد مخزومی سے ہوا؛ جن سے ایک لڑکی ہند ہوئی، پینتیس سال کی عمر تھی کہ قریش کی ایک جنگ میں والد اور دوسرے شوہر کام آ گئے تو خود والد صاحب کی تجارت کو سنبھالا اور اعزہ کے ذریعہ اس کو باقی رکھا، حضورؐ سے پورے تعارف اور قرب کا ذریعہ بھی یہی تجارت بنی کہ آپؐ کی امانتداری کو سن کر اپنے ایک غلام کے ساتھ آپؐ کو مال دے کر بھیجا، معاملات کی صفائی کے ساتھ غلام نے حالات سفر سنائے تو حد درجہ متاثر ہوئیں، اس سے پہلے خاندانی شرافت و ذاتی نجابت اور دولت کی وجہ سے بڑے بڑے لوگ نکاح کی خواہش کر چکے تھے؛ مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود پیغام دیا، بالآخر حضورؐ کے چچا حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد کے زیر سرپرستی نکاح ہو گیا۔

آپ کے خاندانی و ذاتی اوصاف و کمالات نے آپ کو وہ مقام دیا کہ آپ دنیا کی افضل ترین عورتوں میں شمار کی گئیں، نہایت عقل مند اور حضورؐ کے حقوق و آرام کا بے انتہا خیال کرنے والی تھیں، نبوت سے پیشتر جب حضورؐ نے غار حراء میں قیام کا سلسلہ شروع کیا تو بڑے شوق سے کئی کئی دن کا توشہ تیار کر کے آپؐ کو دیتیں اور کبھی خود بھی پہنچا آتی تھیں، آپؐ کی نبوت کی سب سے پہلے تصدیق کی اور نئے حالات کی وجہ سے حضورؐ پر جو گھبراہٹ سی طاری تھی انہوں نے ہی اپنی تسلیوں کے ذریعہ اس کو دور کیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وقت کے بڑے عیسائی عالم "ورقہ بن نوفل" جو کہ آپ کے چچا زاد بھائی بھی تھے، ان کے پاس لے

گئیں تو انہوں نے آپؐ کو نبوت کی بشارت دی اور چونکہ ہر اعتبار سے مکہ میں ان کا اثر تھا اس لئے کفار مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے میں ان کا بھی لحاظ کرتے تھے، اگرچہ پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے جس پر آپ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلاتی تھیں۔

۷؁ میں جب حضورؐ کا مع خاندان سوشل بائیکاٹ ہوتو حضرت خدیجہؓ بھی ساتھ تھیں اوران کا ہی اثر ورسوخ تھا کہ کبھی کبھی کھانا پہنچ جاتا تھا، حتیٰ کہ ۱۰؁ نبوی میں انتقال ہوگیا اور اسی سال تین دن پہلے آپؐ کے دوسرے غم گسار ابوطالب بھی انتقال کر چکے تھے، اسی لئے حضورؐ نے اس سال کو ''عام الحزن'' (غم کا سال) قرار دیا، اس حادثہ کے بعد کفار مکہ آپؐ کو زائد سے زائد تکلیف پہنچانے لگے۔

حضرت خدیجہؓ آپؐ کی سب سے پہلی بیوی پوری مدت رفاقت میں تن تنہا آپؐ کی شریک حیات، ایک کے علاوہ باقی اولاد کی ماں، سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے والی بلکہ آپؐ کی نبوت سے پہلے بت پرستی کو چھوڑ چکی تھیں، حضورؐ کو ان سے بے انتہا محبت تھی حتیٰ کہ ہجرت کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کو ہدایا بھیجا کرتے تھے، اکثر ان کا ذکر کرتے، حضورؐ کے واسطے سے جنت میں ایک مخصوص گھر کی خوشخبری اور اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچایا گیا، انہیں وجوہات کی بناء پر حضرت عائشہؓ بھی نہایت عاقلہ وفاضلہ وچہیتی ہونے کے باوجود حضرت خدیجہؓ پر رشک کیا کرتی تھیں، آپؐ سے کوئی روایت مروی نہیں ہے۔

حضرت سودہؓ:

نام: سودہ، والد: زمعہ، والدہ: شموس، قریش کی شاخ بنو عامر سے تعلق تھا، پہلا نکاح: چچا زاد بھائی سکران بن عمرو سے ہوا اور انہیں کے ساتھ اسلام کے اولین دنوں میں مسلمان ہوئیں، شوہر کے ساتھ حبش کی ہجرت کی، وہاں سے واپسی پر مکہ مکرمہ میں شوہر کا انتقال ہوگیا، ان سے ایک صاحبزادے تھے جو جوان ہوکر کسی جنگ میں شہید ہوئے، ادھر حضرت خدیجہؓ کا انتقال

ہوگیا، حضورؐ پر ان کی وفات کا بڑا اثر تھا، اس کو محسوس کر کے بعض حضرات نے آپؐ سے گفتگو کر کے ان سے نکاح کے معاملات طے کئے اور رمضان ۱۰؁ نبوی میں ہی حضورؐ سے نکاح ہوگیا، نکاح ان کے والد نے پڑھایا، ہجرت کے ابتدائی زمانہ تک تن تنہا حضورؐ کے گھر میں رہیں، اس لئے کہ حضرت عائشہؓ سے اگرچہ نکاح ہوگیا تھا مگر وہ ابھی صغیر السن تھیں، حضورؐ جب باطمینان مدینہ پہنچ گئے تو حضرت زیدؓ کے ذریعہ ان کو بلوایا، پھر حضورؐ کے ساتھ رہیں، حتیٰ کہ حضورؐ کی وفات ہوگئی، اخیر میں اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو دے دیا تھا، حجۃ الوداع میں حضورؐ کے ساتھ تھیں اور حضورؐ کی اطاعت میں اتنی سرشار کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے اپنی ازواج مطہرات کو اپنے بعد گھروں میں ہی رہنے کی ہدایت وتاکید فرمائی تھی تو یہ حضورؐ کی وفات کے بعد حج وعمرہ کیلئے بھی نہیں نکلیں، عمر کافی پائی، بوقت نکاح بعض حضرات نے ۵۵ سال کی عمر لکھی ہے، وفات میں اختلاف ہے، بعض نے ۵۵ - ۵۴ھ میں بتائی ہے اور بعض نے حضرت عمر کے اخیر دور خلافت یعنی ۲۲ھ میں۔

بڑی بلند قامت و بھاری جسم کی تھیں، نہایت سخی تھیں، جو کچھ آتا خرچ کر دیتیں اور کھال کے کام کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی اسے اپنے کام میں لاتیں، بلکہ اسے بھی صدقہ وخیرات میں ختم کرڈالتیں، بڑی صاحب کمالات تھیں، حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں: ''کاش ان کے جسم میں میری روح ہوتی''، مزاج کی کچھ تیز لیکن ساتھ ہی بڑی ظریفہ تھیں، کبھی کبھی ایسی چال چلتیں کہ حضورؐ چال کو دیکھ کر مسکرا پڑتے تھے، دجال سے بہت ڈرتی تھیں، کتب حدیث میں آپ سے پانچ روایات منقول ہیں۔

حضرت عائشہؓ:

نام: عائشہ، کنیت: ام عبداللہ، لقب: صدیقہ وحمیراء، والدہ: زینب ام رومان، قبیلہ غنم بن مالک سے تعلق رکھنے والی تھیں، والد: ابوبکر صدیق، قریش کی مشہور شاخ بنو تیم سے

تعلق رکھتے تھے، نبوت کے چوتھے یا پانچویں سال بماہ شوال پیدا ہوئیں، حضرت خدیجہؓ
کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ سے کچھ پہلے یا بعد حضورؐ سے نکاح ہوا، مدینہ منورہ پہنچ کر
ہجرت کے پہلے یا دوسرے سال بعمر نو یا دس سال رخصتی ہوئی اور ابھی اٹھارہ سال کی ہی تھیں
کہ حضورؐ کی وفات ہوگئی، اس کے بعد کافی دنوں باحیات رہ علم ودین کی خدمت کی، حتیٰ کہ
رمضان ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں بعمر ۶۷ سال وفات پاکر مدینہ کے مشہور قبرستان بقیع میں
مدفون ہوئیں۔

حضرت عائشہؓ کے فضائل وکمالات پر امت متفق ہے، بعض علماء نے اہم خصائص
یوں بیان کئے ہیں: (۱) ان کے علاوہ کوئی دوسری بیوی ایسی نہ تھیں جنہوں نے حضورؐ سے
پہلے کم از کم ایک نکاح نہ کیا ہو (۲) انہیں آنکھ کھولتے ہی گھر میں ایمان وتوحید کا چرچا ملا
(۳) انہیں کے والدین مہاجرین اولین میں سے تھے (۴) آپ کے بستر پر ہوتے ہوئے
بھی حضورؐ پر وحی آیا کرتی تھی (۵) کچھ منافقوں نے شرارۃً آپ پر ایک تہمت لگائی تھی،
اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ کے بے گناہ ہونے کا اعلان فرمایا جو رہتی دنیا تک باقی
رہے گا (۶) حضورؐ کی وفات انہیں کے حجرہ اور انہیں کی گود میں ہوئی اور حضورؐ اسی میں مدفون
بھی ہوئے، وفات سے کچھ پہلے ان کی کوچی ہوئی مسواک استعمال کی (۷) انہیں کی
بدولت امت کو وضو کی جگہ تیمم کی اجازت ملی (۸) حضرت جبرئیلؑ نے ان کو سلام پیش کیا
(۹) صحابہؓ میں حضرت ابوہریرہؓ کے بعد سب سے زیادہ روایات انہیں سے منقول ہیں،
جن کی تعداد دو ہزار دو سو دس بتائی جاتی ہے (۱۰) نہ صرف صحابیات اور حضورؐ کی ازواج
مطہرات میں سے تھیں بلکہ امت کے ممتاز علماء میں اور عورتوں میں آپؓ کے درجہ کا کوئی
فقیہ وعالم نہیں ہوا، کوئی علمی مشکل ایسی نہ تھی جسے صحابہؓ حل نہ کرسکیں اور آپ سے رجوع
کریں تو آپ حل نہ کردیں اور کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ: ''اپنا نصف
دین ان سے حاصل کرو'' (۱۱) نہ صرف علم دین بلکہ شعر وطب میں بھی بڑی مہارت تھی اور

عرب کے انساب وواقعات کا بھی بہت علم تھا، حضرت عروہ نے ان کو سب سے بڑا عالم
قرآن اور حضرت معاویہؓ نے ان کو بڑا پرزور خطیب ومعاملہ فہم قرار دیا، عرب کے مشہور
خطیب حضرت احنف بن قیسؓ نے خطابت میں خلفاء اربعہ پر فوقیت دی ہے (۱۲) ان
سے صحابہ وتابعین نے بڑا استفادہ کیا، دوسو افراد کی خصوصی تربیت فرمائی، جن میں سے
متعدد حضرات وخواتین نے بڑا اونچا مقام حاصل کیا، مدینہ منورہ کے مشہور مفتی قاسم بن
محمد آپ کے بھتیجے آپ کے ہی فیض یافتہ تھے۔

حضورؐ سے نکاح عجیب وغریب انداز سے ہوا، محلے کی بچیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں
کہ دایہ آکر لے گئی، حضرت ابوبکرؓ نے نکاح پڑھایا اور وہ بھی ماہ شوال میں، جب کہ عرب
اس ماہ میں نکاح نہیں کیا کرتے تھے، ہجرت کے بعد رخصتی بھی اسی ماہ میں اور اس طرح
ہوئی کہ مدینہ منورہ پہنچ کر سخت بیمار ہوئیں، صحت یاب ہونے پر والدہ نے رخصتی کی فکر کی،
جھولا جھول رہی تھیں کہ والدہ نے بلایا اور بنایا، سنوارا اور حضورؐ کی خدمت میں پہنچادی
گئیں، حضورؐ سے محبت ظاہر ہے کہ کتنی تھی، بہت سے اسفار وغزوات میں ساتھ رہیں، غزوۂ
احد میں میدان جنگ میں پھر پھر کر زخمیوں کو پانی پلانے کا کام کیا، حضرت عثمانؓ کی
شہادت کے بعد بعض غلط فہمیوں اور کچھ شریروں کی وجہ سے ۳۶ھ میں حضرت علیؓ سے
جنگ کی نوبت آئی؛ جسے ''جنگ جَمل'' کہا گیا، مگر ان کو شکست ہوئی اور بعد میں اپنی غلطی کا
احساس بھی ہوا، جس پر ہمیشہ ندامت رہی۔

خوش رو وصاحب جمال تھیں، رنگ سرخ وسفید تھا، نہایت قانع، سخی، خوددار ودلیر تھیں،
ایک ایک لاکھ دینار ایک دن میں خیرات کردیا، تہجد ودیگر نوافل کی نہایت پابند، ہر سال حج
کرتی تھیں، بے شمار غلام آزاد کئے۔

حضرت حفصہؓ:

نام: حفصہ، والدہ: زینب بنت مظعون جو کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ

کی بہن تھیں، والد حضرت عمر بن خطابؓ، بعثت نبوی سے پانچ سال پیشتر پیدا ہوئیں، تقریباً بیس سال کی عمر میں ہجرت کے تیسرے سال بماہ شعبان حضوؐر سے نکاح ہوا اور حضرت امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں شعبان ۴۵ھ میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی، پہلا نکاح: حضرت خنیس بن حذافہ سے ہوا، جنہوں نے حبشہ کی بھی ہجرت کی تھی، والدین اور شوہر کے ساتھ مسلمان ہوئیں، شوہر کے ساتھ مدینہ ہجرت کی، جہاں ۲ھ غزوۂ بدر کے موقع پر وہ سخت زخمی ہوئے حتیٰ کہ اسی کے اثر سے وفات ہوگئی، عدت کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ و حضرت ابوبکرؓ وغیرہ سے ان کو اپنی زوجیت میں قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی؛ مگر سب نے انکار کیا حتیٰ کہ حضوؐر نے نکاح فرمایا۔

نماز وروزہ کی بڑی شائق تھیں، دجال سے بہت ڈرتی تھیں، مزاج میں ذرا تیزی تھی حتیٰ کہ کبھی حضوؐر کے بالمقابل بھی اس کا اظہار ہو جاتا، حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو تنبیہ فرمائی، چونکہ حضرت عائشہؓ کے والد ابوبکر صدیقؓ اور ان کے والد عمر فاروقؓ دونوں حضوؐر کے نہایت مقرب تھے، اس لئے یہ دونوں بہت محبوب تھیں اور باہم مل کر رہتی تھیں، کوئی اولاد نہیں ہوئی، ان سے چھ روایتیں منقول ہیں۔

حضرت زینب بنت خزیمہؓ:

نام: زینب، کنیت: ام المساکین، اس لئے کہ فقراء ومساکین کو بڑی فیاضی سے کھانا کھلاتی تھیں، والد: خزیمہ بن عبداللہ، خاندان قریش کی شاخ بنو ہلال بن عامر سے تعلق تھا، حضوؐر سے پہلے تین نکاح ہوئے، پہلا: طفیل سے اور دوسرا: حضرت عبیدہؓ سے، یہ دونوں حضوؐر کے بڑے چچا کے لڑکے تھے، عبیدہؓ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے، تیسرا نکاح: حضوؐر کے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ سے ہوا، جنہوں نے غزوۂ اُحد میں شہادت پائی، پھر اسی سال تقریباً تیس سال کی عمر میں حضوؐر سے نکاح ہوا اور نکاح کے بہت کم عرصہ

بعد حضوؐر کے سامنے ہی وفات ہوگئی، حضوؐر نے نماز جنازہ پڑھائی، تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔

حضرت ام سلمہؓ:

نام: ہند، کنیت ام سلمہ، والد کا نام: ابوامیہ سہیل بن مغیرہ، والدہ: عاتکہ بنت عامر جو کہ قریش کی شاخ بنوفراس سے تعلق رکھتی تھیں، والد کا خاندان: بنومخزوم قریش سے تعلق تھا، والد بڑے صاحب ثروت اور فیاض تھے، ۴ھ یا ۵ھ میں بعمر ۲۴، ۲۵ سال حضوؐر سے نکاح ہوا، وفات ۵۹ھ یا ۶۰ھ یا اور بعد میں بعمر تقریباً ۸۵ سال مدینہ منورہ میں ہوئی، پہلا نکاح: چچازاد بھائی عبداللہ بن عبدالاسد سے ہوا جو حضوؐر کی پھوپھی برہ کے صاحبزادے تھے اور آپؐ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے، اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے، انہیں کے ساتھ یہ بھی اسلام لائیں، دونوں نے حبش کی پھر مدینہ کی ہجرت کی، وہیں غزوۂ احد میں زخم کے اثر سے شوہر نے شہادت پائی، صحابیات میں مدینہ ہجرت کرنے والی سب سے پہلی عورت تھیں اور نہایت پر مشقت سفر رہا، شوہر کے ساتھ اہل خاندان نے جانے نہیں دیا، جس جگہ سے شوہر سے الگ ہوئی تھیں، ایک سال تک مسلسل اس جگہ آکر روزانہ پھوٹ پھوٹ کر روتیں، آخر گھر والوں نے سفارش سے یا متاثر ہو کر اجازت دیدی تو تن تنہا بچہ سلمہ کو لے کر چل دیں، راستے میں عثمان بن طلحہ بیت اللہ کا کلید بردار ملا جس نے ترس کھا کر ان کو قبا کی آبادی تک پہنچا دیا اور پھر وہ تنہا ہی مدینہ میں داخل ہوئیں، ان سے دو لڑکے: حضرت سلمہ اور حضرت عمر تھے اور دو لڑکیاں: حضرت درہ اور حضرت زینب، شوہر کی شہادت کا بڑا اثر لیا، حضوؐر نے تشریف لا کر تسلی دی اور اچھے بدل کیلئے دعا کی تلقین کی، عدت گذر جانے پر حضرت ابوبکرؓ نے پیغام دیا، مگر انکار کر دیا، پھر حضرت عمرؓ آپؐ کا پیغام لے کر پہنچے، ام سلمہؓ نے اپنے چند اعذار کا ذکر کیا کہ بہت غیور ہوں اور آپ کی متعدد بیویاں ہیں، عیال دار بھی ہوں مگر حضوؐر نے ان سب کے باوجود اپنی خواہش کا اظہار کیا تو صاحبزادے

حضرت سلمہؓ نے نکاح پڑھا دیا۔

حضورؐ کو ان سے اور خود ان کو حضورؐ سے بے انتہا محبت تھی، ازواج مطہرات تک جب کوئی بات پہنچانی ہوتی تو حضورؐ ان کو ہی وکیل بناتے تھے، حضورؐ کے آرام کا بے حد خیال رکھتی تھیں حتیٰ کہ اپنے غلام سفینہ کو آزاد کرتے وقت حضورؐ کی حیات تک آپؐ کی خدمت کی شرط لگائی اور انہوں نے بھی اتنی خدمت کی کہ خود آپؐ کے غلام کہلائے۔

ان کی دانشمندی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے حکم خداوندی کی وجہ سے اس انداز پر صلح کی تھی کہ مسلمان اس کے ظاہری معاملہ سے بہت متاثر تھے، حضورؐ نے صلح کے بعد سب سے احرام اتارنے اور سر منڈانے کو فرمایا مگر کسی نے حرکت نہ کی، اس سے آپؐ کو سخت رنج ہوا، حضرت ام سلمہ ساتھ تھیں ان کے سامنے جب آپؐ کی یہ پریشانی آئی تو عرض کیا کہ آپؐ اپنی قربانی کر ڈالئے اور احرام اتار دیجئے، آپؐ کا یہ کرنا تھا کہ سب حرکت میں آ گئے، بعض علماء نے آپ کی اس برموقع رائے کو بایں الفاظ سراہا ہے کہ صنف نازک کی پوری تاریخ اصابت رائے کی ایسی عظیم الشان مثال نہیں پیش کر سکتی، غزوۂ خیبر اور حجۃ الوداع میں بھی آپؐ کے ساتھ تھیں، نہایت خوبصورت تھیں، علم و عقل میں حضرت عائشہؓ کے بعد انہیں کا مرتبہ تھا، چار سو کے قریب ان سے احادیث مروی ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ و ابن عباسؓ جیسے فضلاء صحابہؓ ان سے استفادہ کرتے، تابعین کی بھی ایک بڑی تعداد نے کسب فیض کیا، مختلف مسائل میں صحابہ نے ان کے توجہ دلانے پر رجوع کیا، قرآن مجید بہت اچھا اور حضورؐ کے طرز پر پڑھتی تھیں، خود زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں؛ مگر فیاض تھیں۔

حضرت زینب بنت جحشؓ:

نام: زینب، کنیت ام الحکم، والدہ: حضورؐ کی حقیقی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب، والد: جحش بن رُباب، قریش کی شاخ بنو اسد بن خزیمہ سے تعلق تھا، پیدائش بعثت سے تقریباً بیس

سال پہلے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ۵ سنہ ھ میں بعمر ۳۶، ۳۷ سال ہوا، انتقال: ۲۰ سنہ ھ میں بعمر ۵۳ سال۔

اولین اسلام لانے والوں میں سے تھیں، حضورؐ نے اپنے چہیتے خادم و غلام حضرت زید بن حارثہؓ سے نکاح کر دیا تھا، کہاں زید غلام اور کہاں یہ عرب کے سردار قبیلہ کی اہم ترین شاخ کی خاتون؛ مگر انسانیت کو سبق پڑھانا تھا کہ عزت و شرف کا معیار دین و تقویٰ ہے، نیز اس لئے بھی ایسا کیا کہ حضرت زید انہیں قرآن سکھاتے رہیں ــــ مگر زوجین میں تعلقات صحیح نہ رہ سکے، حتیٰ کہ حضرت زید نے طلاق کا ارادہ کیا، حضورؐ منع فرماتے رہے، مگر بالآخر طلاق ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور عجیب و غریب طریقہ پر، نہ نکاح کی مجلس ہوئی، نہ ایجاب و قبول، بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو آپؐ کی زوجیت میں دے دیئے جانے کی اطلاع بذریعہ وحی دی گئی اور وہ بھی اس حال میں کہ حضورؐ نے ان کے پاس خود حضرت زیدؓ کے ذریعہ پیغام نکاح بھجوایا، انہوں نے کہا کہ استخارہ کے بغیر میں کوئی کام نہیں کرتی، یہ ادھر استخارہ کی نیت سے نماز کو کھڑی ہوئی، ادھر وحی آ گئی، اس نکاح کی ایک دوسری خصوصیت یہ رہی کہ حضورؐ نے اس کا ولیمہ نہایت اہتمام سے کیا، روٹی اور سالن کا انتظام فرمایا اور تین سو آدمیوں نے کھانا کھایا، ایک تیسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ دور جاہلیت کی ایک بڑی رسم ٹوٹ گئی اور وہ یہ کہ عرب اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح نہیں کرتے تھے اور حضورؐ نے حضرت زید کو اپنا لے پالک بنا رکھا تھا، مگر حضورؐ کے اس نکاح سے یہ رسم بد ٹوٹ گئی ــــ انہیں وجوہات کی بناء پر ازواج مطہرات میں یہ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ کرتی تھیں اور حضرت عائشہؓ بھی اس کی معترف تھیں، حضورؐ بھی ان کا بہت خیال فرماتے تھے، بڑی فیاض تھیں، چنانچہ حضورؐ بوقت وفات جو یہ فرما گئے تھے کہ: ’’تم میں سے سب سے پہلے میرے پاس وہ آئے گا جس کے ہاتھ سب سے زیادہ لمبے ہوں گے‘‘ اس کا حقیقی مطلب ان کے وفات پر ظاہر ہوا کہ ’’زیادہ خرچ

کرنے والے ہاتھ مراد تھے" ورنہ اس سے پہلے ہاتھ ناپے جاتے تھے، اپنا کفن خود تیار کر لیا تھا، حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن کی گئیں۔

کوتاہ قامت، لیکن خوبصورت وموزوں جسم کی تھیں، صالح اور نماز وروزہ سے شغف رکھنے والی تھیں، مزاج میں تیزی تھی، مگر جب کبھی تیزی پیدا ہوتی تو فوراً ندامت ہوتی تھی، جو کچھ جہاں وجس ذریعہ سے ملتا سب صدقہ کر ڈالتیں حتیٰ کہ ان کے انتقال پر مدینہ کے فقراء ومساکین پر بڑا اثر پڑا، ان سے گیارہ احادیث منقول ہیں۔

حضرت جویریہؓ:

اصل نام: بَرَّہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر "جویریہ" رکھا، والد کا نام: حارث بن ابی ضرار، جو عرب کے مشہور قبیلہ بنو مُصطَلِق کے سردار تھے، شعبان ۵ سنہ ھ میں بعمر تقریباً بیس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا، ۵۶ سنہ ھ میں بعمر ۶۵ یا ۷۰ سال انتقال ہوا۔

پہلا نکاح: قبیلہ کے ایک شخص مسافع بن صفوان سے ہوا، پورا خاندان اسلام دشمن تھا، چنانچہ مسلمانوں پر حملے کا نظم بنایا، اطلاع ملنے پر حضورؐ تشریف لے گئے، اس قبیلہ کی آبادی کے قریب ایک مقام "مریسیع" پر پڑاؤ کیا، مگر یہ سب بھاگ گئے، مقامی لوگ لڑ پڑے تو مارے گئے اور کچھ گرفتار ہوئے، یہ بھی گرفتار ہو کر آئیں اور ایک صحابی ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں، انہوں نے ان سے اپنی آزادی کی بات کی، کچھ رقم پر معاملہ طے کیا، حضورؐ سے مدد چاہی، حضورؐ نے فرمایا: "میں اس سے بہتر چیز بتاتا ہوں"، چنانچہ رقم ادا کر کے ان سے نکاح کر لیا، صحابہؓ نے احترام میں ان کے خاندان کے تمام افراد کو آزاد کر دیا اور خود ان کے والد جو ڈاکہ کے ذریعہ مسلمانوں کو پریشان کرتے رہتے تھے انہوں نے بھی اپنی حرکت چھوڑ دی۔

نہایت خوبصورت وموزوں جسم کی تھیں، زاہدانہ وعابدانہ زندگی گذارتی تھیں، صبح

سے لے کر دوپہر تک نماز کی جگہ بیٹھی رہتی تھیں، چند احادیث مروی ہیں، مروان نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں مدفون ہوئیں۔

حضرت اُم حبیبہؓ:

نام: رملہ، کنیت: ام حبیبہ، والدہ: صفیہ بنت ابو العاص، حضرت عثمان کی حقیقی پھوپھی، والد: قریش کے مشہور سردار ابوسفیان بن حرب، یعنی آپ حضرت معاویہؓ کی حقیقی بہن تھیں کل عمر: ۷۳ سال ہوئی، بعثت سے تقریباً ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں، ۶ سنہ ھ میں بعمر ۳۶، ۳۷ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا، وفات ۴۴ سنہ ھ میں ہوئی، بالقیع میں مدفون ہوئیں۔

شوہر کے ساتھ ابتداء میں اسلام لائیں، شوہر کا نام: عبداللہ بن جحش تھا، شوہر کے ساتھ حبش کی ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی، مگر وہ وہاں عیسائی ہو گیا اور اسی حال میں مر گیا، حضورؐ نے نجاشی کے ذریعہ پیغام بھیجا، انہوں نے منظور کر لیا تو تمام مہاجرین کو بلا کر خود نکاح پڑھایا اور اپنی جیب خاص سے تمام ازواج مطہرات کے برخلاف ان کو چار ہزار درہم مہر کے طور پر دیئے، اس نکاح کے بعد ان کے والد کی مخالفت کا زور ٹوٹ گیا، پہلے شوہر سے ایک لڑکا عبداللہ اور ایک لڑکی حبیبہ تھی، بڑی خوبصورت تھیں، مزاجاً نیک تھیں، حضورؐ واسلام سے بے انتہا تعلق رکھنے والی حتیٰ کہ شادی کے بعد ایک مرتبہ ابوسفیانؓ حالت شرک میں ان سے ملنے کیلئے مدینہ آئے تو حضورؐ کے بستر پر نہ بیٹھنے دیا یہ کہہ کر کہ: "آپ مشرک ہیں"، ان سے ۱۶۵ احادیث مروی ہیں۔

حضرت صفیہؓ:

نام: زینب، لقب: صفیہ، مال غنیمت کے طور پر حضورؐ کے حصہ میں آئیں اور حضورؐ کے حصہ میں آنے والا مال "صفیہ" کہلاتا تھا، والدہ: برہ بنت سموئیل، سموئیل: بنو قریظہ کا

سردار تھا، والد: حی بن اخطب جو کہ بنو نضیر کا سردار تھا، یعنی خاندان یہود سے تعلق تھا اور نسبی سلسلہ حضرت ہارون علیہ السلام سے ملتا تھا، داھیال، ننھیال اور جدامجد ہر اعتبار سے نہایت معزز تھیں، ہجرت کے تقریباً دس سال پہلے پیدا ہوئیں اور ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں جمادی الآخر ۷ ھ میں حضورؐ سے نکاح ہوا اور رمضان ۵۰ ھ میں بعمر تقریباً ۶۰ سال انتقال ہوا۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر گرفتار ہو کر بطور مال غنیمت حضرت دحیہ کے حصہ میں آئیں، ان کے شرف کی بناء پر بعض حضرات نے حضورؐ سے ان کے قبول کر لینے کی درخواست کی تھی آپؐ نے حضرت دحیہ کو دوسری باندی دے کر بدل لیا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا، حضورؐ سے پہلے دو نکاح ہوئے تھے، پہلا: بنو قریظہ کے ایک شخص سلام بن مُشکَم سے؛ جس نے طلاق دے دی تو خیبر کے ایک سردار کنانہ ابن ابی الحقیق سے نکاح ہوا جو غزوۂ خیبر میں مارا گیا، اسی موقع سے ان کے باپ و بھائی بھی مارے گئے، انہوں نے بہت پہلے خواب دیکھا تھا کہ: ''چاند اپنی جگہ سے ہٹ کر ان کی گود میں آ گیا''، شوہر سے ذکر کیا تو اس نے چہرہ پر طمانچہ مارا، جس کا اثر اخیر تک رہا، حضورؐ سے پوچھنے پر وجہ بتائی، شوہر نے چاند کی تعبیر آپؐ سے کی تھی۔

کافی مالدار تھیں، ایک لاکھ کا ترکہ چھوڑا، کوتاہ قد مگر حسین تھیں، ان کی خاندانی شرافت واعزاز نے تمام ازواج پر ان کو ممتاز کر رکھا تھا، حتیٰ کہ ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا کہ: ''ان کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؛ نبی کی بیٹی، نبی کی بھتیجی اور نبی کی بیوی'' (حضرت ہارونؑ کی اولاد، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھتیجی اور حضورؐ کی بیوی)۔

دیگر ازواج مطہرات کی طرح یہ بھی علم کا مرکز تھیں، بڑی سمجھ دار اور ذہین تھیں اور بے انتہا بردبار و صابر حتیٰ کہ خیبر کے موقع پر شوہر کی لاش کے پاس سے گذریں اور چوں بھی نہ کی، حضورؐ سے بے محبت کرتی تھیں حتیٰ کہ آپؐ کے مرض وفات میں حسرت سے فرمایا:

''کاش یہ بیماری مجھ کو ہوتی''، آپؐ بھی بہت خیال فرماتے تھے، اگر کبھی کوئی کچھ کہہ دیتا تو بہت ناراض ہوتے تھے، ایک مرتبہ حضرت زینب نے ان کو ''یہودیہ'' کہہ دیا تو دو مہینے سے زائد تعلقات منقطع رکھے، فیاضی تو تمام ازواج میں تھی، یہ بھی کم نہ تھیں اور دولت مند ہونے کی وجہ سے حضرت فاطمہ اور دوسری ازواج کو بھی نوازتی تھیں، کھانا بہت عمدہ پکاتی تھیں، دوسرے گھروں کی باری ہونے کی صورت میں تحفۃً بھیجا کرتی تھیں۔

حضرت میمونہؓ:

نام: میمونہ، والدہ: ہند بنت عوف، حمیر سے تعلق رکھتی تھیں، والد: حارث بن حزن، جو قریش کی شاخ بنو ہلال بن عامر سے تعلق رکھتے تھے، ذی قعدہ ۷ ھ میں بعمر ۳۶ سال حضورؐ سے نکاح ہوا اور ۵۱ ہجری میں بعمر ۸۰ سال بمقام سرف کہ جہاں نکاح ہوا تھا وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دو نکاح ہوئے، پہلا: حویطب بن عبد العزیٰ یا مسعود بن عمرو ثقفی سے اور دوسرا: ابورہم بن عبد العزیٰ سے، جنہوں نے ۷ ہجری میں وفات پائی تو اسی سال حضورؐ سے نکاح ہو گیا، عمرہ کے سفر میں جاتے ہوئے نکاح اور واپسی میں رخصتی ہوئی، ان سے نکاح کے بعد پھر کوئی اور نکاح آپؐ نے نہیں کیا، نہایت متقی و صلہ رحمی کرنے والی تھیں، حضورؐ کی اتباع کی بہت کوشش کرتی تھیں، لوگوں کو مسائل بتاتی تھیں، ان سے ۴۶ احادیث مروی ہیں۔

حضورؐ کے والدین:

والد:

ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا اسم گرامی: عبد اللہ تھا، ان کی

والدہ کا نام: فاطمہ تھا، جو قریش کی شاخ بنو مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں، حضرت عبداللہ کو شرافت ونجابت ورثہ میں ملی تھی، نہایت پاک دامن تھے، حتیٰ کہ ایک عورت نے ان کو گرا نقدر عطیہ کی پیش کش کے ساتھ گناہ کی دعوت دی، جسے انہوں نے ٹھکرا دیا، ان کے ساتھ یہ اہم واقعہ پیش آیا کہ ان کے والد نے نذر مانی تھی کہ: ''اللہ نے مجھے دس لڑکے دیے تو ایک کو قربانی کے طور پر ذبح کر دوں گا''، جب دس لڑکے ہو گئے تو انہوں نے قرعہ ڈالا کہ جس کا نام نکلے اسے ذبح کر دیں، اتفاق سے نام عبداللہ کا نکلا اور وہ اس پر راضی بھی ہو گئے، چنانچہ عبدالمطلب نے اس کا ارادہ کرلیا، مگر ابوطالب اور خواجہ عبداللہ کی ننھیال کے لوگوں نے اصرار کے ساتھ روکا، تو یہ طے ہوا کہ ایک کاہنہ سے اس کا حل معلوم کیا جائے، اس نے کہا: ''عبداللہ کے نام کے ساتھ اونٹوں کا قرعہ نکالو، بار بار نکالتے رہو اور اونٹوں کی تعداد بڑھاتے رہو، جس تعداد پر اونٹوں کا نام آجائے، اسی تعداد کے مطابق اونٹوں کو ذبح کر دو اور عبداللہ کو چھوڑ دو''، چنانچہ اونٹوں کی تعداد دس سے لے کر سو تک پہنچی، سو پر اونٹوں کا نام نکلا اور عبداللہ کی جگہ سو اونٹ ذبح کیے گئے۔

جوان ہونے پر آپ نے بھی دوسرے اہل خاندان کی طرح تجارت کا مشغلہ بنایا، پچیس سال کچھ کم عمر تھی کہ آپ کا نکاح ہوا، اس کے بعد آپ سفر تجارت پر چلے گئے، واپسی میں مدینہ منورہ قیام کیا، وہاں اعزہ بھی تھے اور کھجوروں کا سودا بھی کرنا تھا، اچانک بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے اور وہیں مدفون ہوئے، بوقت انتقال عمر پچیس سال تھی، مشہور قول کے مطابق حضورؐ اس وقت والدہ محترمہ کے پیٹ میں تھے اور ان کے انتقال کے چند ماہ بعد پیدا ہوئے۔

والدہ:

والدہ محترمہ کا نام: آمنہ تھا، ان کے والد کا نام: وہب اور والدہ کا نام: برّہ تھا، دونوں کا تعلق قریش سے تھا، یہ بھی بڑی صالح و پاک دامن عورت تھیں، نکاح کے پہلے ہفتے میں

ہی حمل سے ہو گئی تھیں اور پیدائش سے پہلے خواب میں ان کو بتایا گیا تھا کہ پیدا ہونے والے بچے کا نام: ''احمد'' رکھنا اور بھی خواب انہوں نے دیکھے تھے، پانچ سال کی عمر کے بعد جب حضورؐ ان کے پاس آگئے تو چھ سال کی عمر میں آپ کو لے کر مدینہ گئیں کہ اعزہ سے مل آئیں، ساتھ میں اُمّ ایمن تھیں، مدینہ میں ایک ماہ کے قیام کے بعد واپسی ہوئی، واپسی میں ''ابواء'' نامی مقام پر اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفن کی گئیں۔

حضورؐ کے قریبی اعزہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھا، جو مکہ میں آباد ہوا تھا اور پھر بہت دور تک پھیل گیا، انہیں کی اولاد کی ایک مشہور شاخ ''بنو ہاشم'' نامی تھی، بنو اسماعیل میں ''قریش'' اور ان میں ''بنو ہاشم'' سب سے زیادہ معزز سمجھے جاتے تھے اور بالخصوص بنو ہاشم کے سردار جو حضورؐ کے سلسلہ نسب میں شامل ہیں اور جو صرف بنو ہاشم کے ہی نہیں بلکہ سارے قریش و اہل مکہ کے سردار مانے جاتے تھے، یہاں حضورؐ کے قریبی اعزہ کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

حضورؐ کے پردادا:

نام: عمرو اور لقب: ہاشم تھا، انہیں کی طرف اس شاخ کی نسبت کی جاتی تھی، خاندان میں بڑے معزز اور سخی و مہمان نواز تھے، حج کے موقع پر حاجیوں کی بڑی خدمت کرتے تھے، آپ پورے قریش کے سردار تھے، ایک مرتبہ تجارت کیلئے سفر پر تھے، مدینہ منورہ میں علیل ہو کر انتقال فرما گئے، آپ کا نکاح مدینہ منورہ کے ایک مشہور خاندان ''بنو نجار'' کی ایک خاتون سے ہوا تھا۔

حضورؐ کے دادا:

عبدالمطلب: ان کا اصل نام: عامر اور لقب شیبہ تھا، لیکن عبدالمطلب کے نام سے

مشہور ہوئے، بچپن میں ہی والد کے انتقال کر جانے کی وجہ سے والدہ کے پاس مدینہ میں رہتے تھے، جہاں سے ایک مرتبہ آپ کے چچا مطلب آپ کو مکہ لے آئے، آپ بھی بڑے ہونے پر والد کی طرح بیت اللہ کے منتظم اور حاجیوں کے نگراں قرار پائے، خاندان وقبیلہ کی سرداری بھی ملی، آپ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ "زمزم" کا کنواں جو بالکل پٹ گیا تھا، آپ نے اسے صاف کرا کر لائق استعمال بنایا، بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

عبدالمطلب کی اولاد:

عبدالمطلب کے دس اور بعض حضرات کے قول کے مطابق گیارہ یا بارہ یا تیرہ لڑکے تھے: (۱) ابوطالب عبدمناف (۲) حمزہ (۳) عباس (۴) عبداللہ (۵) ابولہب عبدالعزیٰ (۶) زبیر (۷) عبدالکعبہ (۸) حارث (۹) ضرار (۱۰) قثم (۱۱) مغیرہ (۱۲) عیداق، مصعب (۱۳) حجل، ان میں سب سے بڑے حارث اور سب سے چھوٹے عباس تھے۔

مسلمان صرف دو ہوئے: حضرت حمزہ اور حضرت عباس، البتہ ابوطالب اور حارث نیز زبیر کی اولاد مسلمان ہوئی، ابولہب تو مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب حضورؐ نے تمام رشتہ داروں کو جمع کر کے اسلام کی دعوت پیش کی تو اسی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سختی سے جواب دیا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف پہنچانا مستقل مشغلہ بنالیا، جہاں حضورؐ دعوت کے لئے تشریف لے جاتے یہ پیچھے پیچھے جاتا اور مجنوں بتا کر لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے روکتا، اس کے ایک لڑکے "معتب" نے اسلام قبول کرلیا تھا، عبدالمطلب کے یہ لڑکے اور لڑکیاں کئی ماؤں سے تھیں۔

ابوطالب:

آپؐ کے چچاؤں میں سب سے زیادہ مشہور تھے، عبدالمطلب کی وفات کے بعد یہی ان کے جانشین ہوئے، دادا کی وفات کے بعد آٹھ سال کی عمر سے لے کر نبوت ملنے کے دس سال بعد تک حضورؐ کے مربی رہے، آپؐ کی پرورش کی، شادی کرائی اور جب آپؐ نے

دعوت کا کام اور کفار نے آپؐ کو ایذاء پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی سرپرستی ہی سے حضورؐ کو سکون ملتا، کفار ان کے مرتبہ کی وجہ سے ان سے دبتے تھے اور حضورؐ کو دعوت کے کام سے روکنے کیلئے ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ آپؐ کو سمجھائیں، ان کو حضورؐ سے اور خود حضورؐ کو ان سے بہت محبت تھی، حضورؐ کی تعریف میں انہوں نے بہت سے اشعار کہے، مگر اکثر حضرات کے قول کے مطابق اسلام نہیں لائے، ابوطالب اور حضرت عبداللہ ایک ہی ماں سے تھے اور حضورؐ کی پھوپھی "اروی" بھی انہیں ماں سے تھیں۔

حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت عقیل، تینوں ان کے ہی صاحبزادے تھے، یہ خود اور ان کی اولادیں اسلام سے مشرف تھیں، حضرت علیؓ آپؐ کے داماد بھی تھے، حضورؐ کی چہیتی چچازاد بہن "ام ہانی" انہیں کی صاحبزادی تھیں، دوسری صاحبزادی کا نام: جمانہ تھا، دونوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، ایک صاحبزادے طالب نام کے تھے جن کی وجہ سے آپ کو "ابوطالب" کہا جاتا تھا، وہ اسلام نہیں لائے تھے۔

حضرت حمزہؓ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم جولی اور دودھ شریک بھائی، نہایت بہادر، بڑے شکاری تھے بلکہ شکار ہی ان کا مشغلہ تھا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا کام شروع کیا تو بھی وہ شکار میں ہی مصروف رہتے تھے، ایک دن شکار سے واپسی پر ابوجہل کے متعلق معلوم ہوا کہ: "حضورؐ کو تکلیف پہنچائی ہے" تو سیدھے اس کے پاس پہنچے اور اپنی کمان سے اس کو مارا اور کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا اور اسی جوش میں اسلام کا کلمہ بھی پڑھ لیا، آپ کی بہادری کی وجہ سے آپ کے مسلمان ہونے پر حضورؐ اور صحابہؓ بہت خوش ہوئے، مدینہ منورہ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا تو آپ نے بھی ہجرت کی اور دوسری اسلامی جنگ غزوۂ احد میں شریک ہوکر شہید ہوئے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ کے غلام وحشی نے آپ کو مارا اور ناک، کان، زبان کاٹ لی اور پیٹ چیر کر کلیجہ نکال لیا جسے ہندہ نے چبایا، آپ کی بیوی ام المومنین

حضرت میمونہ کی بہن تھیں، آپ عمر میں حضورؐ سے تقریباً دو سال بڑے تھے، آپ کی ایک صاحبزادی امامہ نامی تھیں، آپ کے ایک صاحبزادے عمارہ نامی تھے، اسی لئے آپ کی کنیت ابوعمارہ تھی، حضرت حمزہؓ اور حضورؐ کی پھوپھی صفیہ دونوں ایک ماں سے تھے، اسی لئے دونوں میں بہت محبت تھی۔

حضرت عباسؓ:

تمام بھائیوں میں چھوٹے تھے، اکثر اوقات حضورؐ کے ساتھ رہتے حتیٰ کہ اسلام نہ لانے کے باوجود بہت سے تبلیغی اسفار میں بھی ساتھ رہتے تھے، غزوۂ بدر میں کفار کے لشکر کے ساتھ مدینہ آئے، گرفتار ہوئے، پھر رہا ہو کر مکہ گئے اور اس کے بعد مسلمان ہو گئے، فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے ہجرت کی، عمر کافی پائی، سنہ ۲۳ھ یا سنہ ۳۴ھ میں وفات پائی۔

ان سے بہت سی احادیث مروی ہیں، بیت اللہ شریف پر غلاف چڑھانے کا رواج آپ ہی کی بدولت پڑا کہ آپ بچپن میں کھو گئے تھے تو والدہ نے نذر مانی تھی کہ مل گئے تو بیت اللہ پر غلاف چڑھاؤں گی، چنانچہ ملنے پر غلاف چڑھایا گیا اور پھر آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، آپ کے دس صاحبزادے تھے، جن میں سب سے بڑے فضل تھے، اسی لئے آپ کی کنیت ''ابوالفضل'' تھی، لیکن ان میں حضرت عبداللہؓ نے بڑی شہرت حاصل کی، فقیہ و محدث تو تھے ہی، تفسیر میں تمام صحابہؓ کے امام مانے گئے، خاندان خوب پھیلا و بڑھا اور صدیوں اسلامی حکومت کی قیادت و امارت کی اور اپنے کارناموں کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا۔

حضورؐ کے نانا:

آپؐ کی والدہ کے والد ماجد کا اسم گرامی: وہب اور ان کے والد کا نام عبدمناف تھا اور عبدمناف کے والد زہرہ تھے، یہ زہرہ اور حضورؐ کے پردادا ہاشم کے دادا قصیٰ دونوں حقیقی بھائی تھے، ان کے والد کا نام: کلاب تھا اور اتفاق یہ کہ ''قصی'' اور ''زہرہ'' دونوں کے وہ

لڑکے جو آپؐ کے سلسلہ نسب میں شامل ہیں دونوں کا نام ''عبدمناف'' تھا۔

دادیاں و نانیاں:

آپؐ کی حقیقی دادی فاطمہ بنت عمرو اور پردادی سلمیٰ بنت عمرو تھیں اور حقیقی نانی برہ بنت عبدالعزیٰ اور نانا وہب کی والدہ کا نام عاتکہ تھا، رقیقہ نامی آپ کی ایک خالہ بھی تھیں جن کی صاحبزادی امیمہ تھیں؛ اسلام لائیں۔

پھوپھیاں:

صفیہ، عاتکہ، برہ، اروی، امیمہ، بیضاء، ان میں سے صرف حضرت صفیہ اسلام لائیں بڑی بہادر و جاں باز تھیں، حضورؐ اور اپنے بھائی حضرت حمزہؓ سے بہت محبت کرتی تھیں، آپ کے صاحبزادے حضرت زبیر بن العوامؓ عشرہ مبشرہ میں سے اور مشہور صحابہ میں سے ہیں، مشہور فقیہ صحابی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ انہیں زبیر کے صاحبزادے تھے، حضرت زبیر کے بڑے فضائل روایات میں منقول ہیں، بعض لوگ اروی اور عاتکہ کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ مسلمان ہو گئی تھیں، البتہ ان سب کی اولاد نے اسلام قبول کیا، ام المومنین زینب بنت جحش، امیمہ کی لڑکی تھیں اور ام المومنین ام سلمہ کے پہلے شوہر ابوسلمہ ''برہ'' کے صاحبزادہ تھے اور حضرت ام سلمہ کے باپ شریک بھائی عبداللہ بن ابی امیہ ''عاتکہ'' کے، حضرت عثمان کے ماموں ''عامر بن کُریز'' ''بیضاء'' کے لڑکے تھے اور اروی کے صاحبزادے ''طلیب'' اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی اعزہ کے مختصر حالات ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا، آپؐ کے اعزہ میں بہت سے لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن ابولہب کی مانند مخالف بھی کوئی نہیں تھا بلکہ سب آپ کی مدد کرتے اور مصیبت میں ساتھ دیتے حتیٰ کہ تین سالہ معاشرتی بائیکاٹ میں پورے طور پر شریک رہے، آپؐ کے دادا کی تمام اولادیں بھی اور پردادا کی بھی، اس لئے اللہ اور اس کے رسولؐ نے پورے خاندان کا بڑا خیال کیا اور مال غنیمت میں ان کے

لئے خصوصی حصہ رکھا گیا، یوں تو حضورؐ کی وفات تک دھیرے دھیرے قریش کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے تھے، اس لئے خاندان کا بھی کوئی زندہ فرد کافر نہیں رہ گیا۔

اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ مشہور آپ کے دو چچا، حمزہ، عباس، پھوپھی صفیہ اور ان کی اولادیں، نیز ابوطالب وحارث کے صاحبزادگان ہیں، اور سب کے کمالات و فضائل بے شمار ہیں۔

رضاعی قرابت دار

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عورتوں کا دودھ پیا تھا (۱) والدہ ماجدہ (۲) ابولہب کی باندی ''ثوبیہ'' (۳) حضرت حلیمہ سعدیہ (۴) قبیلہ بنوسعد کی ایک عورت۔

آپؐ نے ابتدائی سات دن والدہ ماجدہ کا دودھ پیا، اس کے بعد چند دنوں ''ثوبیہ'' کا جو ابولہب کی باندی تھیں، جنہیں ابولہب نے حضورؐ کی ولادت کی خوشی میں آزاد کر دیا تھا، حضورؐ کے علاوہ حضرت حمزہؓ اور آپؐ کے دو پھوپھی زاد بھائیوں حضرت عبداللہ بن جحش وابو سلمہ بن عبدالاسد نے بھی ان کا دودھ پیا تھا، حضورؐ ان کا بہت خیال فرماتے تھے، مدینہ منورہ سے ان کیلئے تحائف بھیجا کرتے تھے، فتح مکہ سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے لڑکے ''مسروح'' کا بھی جو حضورؐ کے ساتھ دودھ پینے میں شریک تھے، ان دونوں کے اسلام کی بابت اختلاف ہے۔

حضرت حلیمہ کا تعلق ''بنوسعد بن بکر'' سے تھا، ان کے والد کا نام: ابوذیب اور شوہر کا نام: حارث بن عبدالعزیٰ تھا، شیر خواری کا اصل زمانہ آپؐ نے حضرت حلیمہ کے پاس گذارا اور اصلاً انہیں کا دودھ آپؐ نے پیا، رضاعی بھائی کا نام: عبداللہ تھا، دو رضاعی بہنیں تھیں، ایک: اُنَیسہ، دوسری: جُذَامہ جو ''شیماء'' کے لقب سے مشہور تھیں، حضرت حلیمہ نے آپؐ کے چچازاد بھائی ''ابوسفیان بن حارث'' کو بھی دودھ پلایا تھا اور ''بنوسعد'' کی ایک دوسری عورت، انہیں دنوں حضرت حمزہ کو دودھ پلاتی تھی، اس عورت نے بھی ایک دن آپؐ کو دودھ پلایا، اس خاندان کے مسلمان ہونے کی بابت اختلاف ہے، ''جذامہ'' آپ کو بچپن میں بہلا یا دکھلایا کرتی تھیں۔

ضروری متعلقین

باندیاں:

آپؐ کی باندیوں کی تعداد ۹،۱۱اوراس سے زائد بھی آئی ہے، چند مشہور یہ ہیں: ''ماریہ'' جوآپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ تھیں اور جن کو ''مقوقس شاہ اسکندریہ'' نے آپؐ کے لئے ہدیہ میں پیش کیا تھا، ''ام ایمن'' جوآپؐ کواپنے والد سے ترکہ میں ملی تھیں اور حبشی النسل تھیں، یہ بچپن سے آپؐ کی نگہداشت وخدمت کرتی رہی تھیں، آپؐ کی والدہ نے جب مدینہ کا سفر کیا اوراسی موقع پروفات فرماگئیں تو یہی ساتھ تھیں اور اس کے بعد یہی آپؐ کی دیکھ بھال کرتی رہیں، حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح ہوا تھا اور حضرت زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ انہیں کے بطن سے تھے اور حضورؐ کے خادم ''ایمن'' جن کا ذکرآگے آرہاہے انہیں کے لڑکے تھے، لیکن حضرت زید سے نہیں بلکہ پہلے شوہر سے تھے، ان کا اصل نام ''برکت'' تھا۔

غلام:

آپؐ کے غلاموں کی تعداد تیس تک آئی ہے، جن میں سرفہرست حضرت زید بن حارثہؓ تھے، جنہیں حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا اور بچپن سے ہی حضورؐ کی خدمت کرتے رہے، حضورؐ کوان سے بے انتہا محبت تھی، حتیٰ کہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ کا ان سے نکاح کیا، ان کا ایک نکاح حضرت ام ایمن سے ہوا، جن کے بطن سے حضرت اسامہؓ تھے، جن سے حضورؐ حضرات حسنینؓ کی مانند محبت فرماتے تھے، نیز مشہور غلاموں میں حضرت ثوبان اور حضرت سفینہ تھے۔

یہ تمام غلام وباندی آپؐ نے آزادکررکھے تھے، مگرسب آپؐ کی خدمت میں ہی رہے۔

خدام:

حضرت انس: ذاتی وخانگی ضروریات کیلئے، حضرت عبداللہ بن مسعود: مسواک ونعلین کے ذمہ دار، حضرت عقبہ بن عامر جہنی: خچر کے ذمہ دار، حضرت اسلع بن شریک: اونٹنی کے ذمہ دار، حضرت بلال: مؤذن اور مصارف واخراجات کے اور معیقیب بن ابی فاطمہ: انگوٹھی کے ذمہ دار، ایمن: وضوواستنجاء کیلئے پانی کے ذمہ دار، نیزابوذرغفاری، حضرت سعد، حضرت ذومخمر (بھتیجہ شاہ حبش) حضرت ربیعہ بھی خدام خاص میں سے تھے۔

نیز بعض عورتیں بھی خدمت کرتی تھیں، مثلاً حضرت حارثہ کی دوصاحبزادیاں: ہندہ و اسماء۔

کھلائیاں:

بچپن میں آپؐ کی نگہداشت کرنے والی اورکھلانے والی عورتوں میں آپؐ کودودھ پلانے والی عورتوں کے علاوہ حضرت حلیمہ کی لڑکی جذامہ اور حضرت ام یمن بھی تھیں۔

کاتبان:

جوحضرات وحی یا خطوط وغیرہ لکھتے: حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت عبداللہ بن ارقم، حضرت ابی بن کعب، حضرت ثاقب بن قیس، حضرت خالد بن سعید، حضرت حنظلہ بن ربیع، حضرت زید بن ثابت، حضرت معاویہ، حضرت شرجیل بن حسنہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن رواحہ، خالد بن ولید، عمرو بن

عاص رضی اللہ عنہم

شعراء وخطباء:

حضرت کعب بن زہیر، عبداللہ بن رواحہ، حسان بن ثابت، حضرت الجشہ رضی اللہ عنہم یہ شعراء تھے اور خطیب حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ تھے۔

حضورؐ کے محافظ:

ایک زمانہ تک حضورؐ اپنے لئے پہرے دار رکھتے تھے، مگر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کا اعلان فرمادیا تو ختم کردیا، ان محافظین میں حضرت سعد بن معاذ بدر میں، حضرت محمد بن مسلمہ احد میں اور حضرت زبیر خندق میں محافظ رہے اور بعض دوسرے حضرات دوسرے مواقع پر۔

استعمالی اشیاء:

ہتھیار:

۹ تلواریں تھیں، ہرایک کے الگ الگ نام تھے، ''ماثورہ'' والد سے ملی تھی، ''ذوالفقار'' جنگ بدر میں ملی تھی اور سب سے پہلی تلوار جو آپ نے زیب تن کی ''قضیب'' نامی تھی، سات زرہیں تھیں، ان کے بھی الگ الگ نام تھے۔

نیزے: پانچ تھے، کمانیں چھ، ترکش دو، خود دو، ڈھالیں دو، چھڑیاں تین، آنکس ایک، خیمہ ایک، جھنڈے ایک بڑا کالا باقی سفید جو وقتاً فوقتاً بنتے رہتے تھے۔

کپڑے:

مختلف قسم کے کرتے وجبے چند عدد، ٹوپیاں تین یا چار عدد، عمامہ ایک عدد، دو کپڑے

جمعہ کیلئے مخصوص تھے، ایک رومال اور ایک موزہ، بعض کپڑے کبھی کبھی استعمال میں لاتے تھے، عام اہتمام سادے کپڑوں کا تھا، پائجامہ کا خریدنا مشہور ہے اور پہننا بھی منقول ہے، یوں لنگی ہی پہنا کرتے تھے، چادریں سادہ وپھول دار ودھاری دار مختلف قسم کی ہوتی تھیں، کمبل سفید ایک، لحاف ایک، بستر چمڑے کا کھجور کی کھال بھرا ایک، ایسے ہی ایک تکیہ بھی تھا، دو موٹی چادریں بھی تھیں جن کو ''کھیس'' کہتے ہیں۔

جانور:

گھوڑے: دس سے لےکر ۱۵ تک کی تعداد آئی ہے؛ ہرایک کے نام الگ الگ تھے، خچر: چار عدد جن میں ''دلدل'' سب سے زیادہ مشہور تھا، گدھے: ۲ عدد، اونٹنیاں: بیس سے لےکر ۴۵ تک تعداد منقول ہے، سانڈنیاں: تین، عموماً حضورؐ سفر میں انہیں کو استعمال فرمایا کرتے تھے، قصواء، عضباء، جدعاء۔

بکرے اور بکریاں: سو کی تعداد میں تھے، جب بچے پیدا ہوتے تو ایک کو ذبح کر لیتے، سو سے زائد نہ ہونے دیتے، ایک بکری محض آپؐ کے دودھ کیلئے مخصوص تھی، مرغ: ایک تھا سفید رنگ کا۔

اہم برتن:

پتھر کا بڑا پیالہ وضو کیلئے، لکڑی کا بڑا پیالہ: آٹا گوندھنے کیلئے، پیتل کا بڑا کونڈا: غسل کیلئے، لکڑی کا پیالہ: جس میں کبھی کبھی رات کو پیشاب کرلیا کرتے تھے، شیشہ کا ایک پیالہ، چند اور پیالے متفرق ضرورتوں کیلئے، چارپائی: ایک عدد۔

دیگر ضروری سامان:

سرمہ دانی، قینچی، کنگھا، آئینہ، انگوٹھی وغیرہ۔

حضورؐ کے صحابہؓ

"صاحب" ساتھ رہنے والے کو کہتے ہیں، ایمان لاکر نبی کے ساتھ رہنے والے کو "صاحب" و "صحابی" کہا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی اثر رکھا ہے، جس سے وہ دوسری چیز کو متاثر کرتی ہے، گرم چیزیں ٹھنڈی، ٹھنڈی گرم، بے بو کی بو والی، بدبودار خوشبو والی، خوشبودار بدبو والی، اسی بناء پر ہوتی ہیں، خصوصاً دواؤں اور تیلوں میں یہ چیز بہت زیادہ محسوس کی جاتی ہے، ایک دو مختلف چیزیں ملا کر تیار کی جاتی ہے، ان میں سے ہر ایک کی تاثیر الگ الگ ہوتی ہے، مگر ان کے مجموعہ کی تاثیر کچھ دوسری ہو جاتی ہے، تل کو جس چیز کے پھول میں بسا دیں اس کے اندر اسی کی خوشبو آ جاتی ہے۔

انسانی صحبت میں بھی اسی قسم کا اثر ہے کہ ایک انسان اپنے پاس والے سے ضرور متاثر ہوتا ہے، اچھا برے سے اور برا اچھے سے، جس کا جی چاہے اپنے ماحول و معاشرہ میں دیکھ لے، حضورؐ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: "اچھا ہم نشیں مشک بیچنے والے کی طرح ہے کہ اس سے فائدہ ضرور ہوگا، خواہ مشک خرید و خواہ وہ ہدیہ میں دے اور خواہ اس کی خوشبو ہی ناک میں پہنچتی رہے اور برا ہم نشیں بھٹی انگیٹھی کو دہکانے و جلانے والے کی طرح ہے کہ چنگاریاں اڑ اڑ کر تم پہنچیں گی ورنہ دھواں تو بہرحال آئے گا ہی"۔

جب دنیا کی تمام چیزوں اور تمام انسانوں کا یہ حال ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرات انبیاءؑ کی صحبت اپنے اندر اثر نہ رکھے بلکہ ان کی صحبت تو اور زیادہ اثر رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی صحبت میں رہنے والے، ان کی لائی ہوئی شریعت کے سب سے زیادہ پابند اور ان کے اخلاق کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، اسی لئے اپنی امت کے افضل ترین افراد شمار

ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا بھی یہی معاملہ ہے کہ آپؐ کے فیض صحبت کی وجہ سے ان کا ہر فرد، مرد و عورت، چھوٹا و بڑا، نیا و پرانا، عمل و خلاص کے اعلیٰ مراتب پر فائز اور صحیح علم و عقیدہ رکھنے والا تھا اور چونکہ آپؐ سردار انبیاء تھے اس لئے آپؐ کے صحابہ بھی دوسرے انبیاء کے صحابہ پر فضیلت رکھتے تھے، اسی لئے تمام اہل سنت و جماعت مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ انبیاء کے بعد سب سے بڑا مرتبہ حضرات صحابہ کرام کا ہے، دنیا کا بڑے سے بڑا ولی ان میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کے مرتبے کو بھی نہیں پہنچ سکتا، ان میں جو اخلاص کے ساتھ ایمان لایا اس نے کبھی اسلام سے منہ نہیں موڑا اور جنہوں نے بظاہر منہ موڑا وہ پہلے ہی سے مخلص نہ تھے، جو اہل اخلاص تھے انہوں نے کبھی راہ حق اور نبی کی سنت سے اعراض نہیں کیا اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہوئی بھی تو یا تو فوراً ان کو احساس ہوا اور حضورؐ کی خدمت میں آ کر گناہ کا اظہار کر کے باصرار خود کو سزا دلوائی اور یا اس غلطی میں بھی اخلاص شامل رہا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ: "حضرات صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کے متعلق ہم کو بحث و کھود کرید نہ کرنی چاہئے"، موقع پڑے تو بطور واقعہ سرسری طور پر ضروری حالات ذکر کر دینے چاہئیں، امام احمد بن حنبلؒ کا مقولہ ہے کہ: "اہل سنت و جماعت مسلمانوں کا شعار ہے کہ صحابہ کے اوصاف و کمالات کو ذکر کیا جائے اور اس کے آگے زبان بند رکھی جائے"، امام مالک کا فرمان ہے کہ: "صحابہ پر ناگواری کا اظہار کرنے والا کافر ہے"۔

حضرات صحابہؓ نے حضورؐ سے اپنی محبت اور آپؐ کے لئے جاں نثاری کا وہ معیار پیش کیا کہ دنیا میں کسی شخص کے احباب بلکہ عشق و معاشقہ کی تاریخ میں بھی اس کی مثالیں نہیں مل سکتیں اور اگر دو ایک افراد کے حالات میں محبت کے پیچھے عظیم قربانی کا ذکر مل جائے تو مل جائے لیکن پوری کی پوری جماعت ایک حال پر ہو اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اپنی جان دے دینا گوارا کیا، مگر حضورؐ کے پائے مبارک میں ایک کانٹے کا چبھنا پسند نہیں کیا، خود کو

سانپ سے کٹوالیا، مگر حضوؐر کی تکلیف گوارا نہیں کی، آپؐ کا لعاب، آپؐ کے وضو کا پانی، آپؐ کے بدن کا بال، کسی چیز کو ضائع نہ ہونے دیا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کے موقع پر حضرت عمر جیسا ذی ہوش بھی اپنے حواس کھو بیٹھا۔

حضرات صحابہ نے عقیدہ اور علم وعمل کی جو امانت حضوؐر سے حاصل کی تھی اور قرآنی احکام اور نبوی ارشادات کی بنا پر دوسروں تک اس کے پہنچانے کی جو ذمہ داری اوڑھی تھی اس کو پورے طور پر ادا کیا، اطراف عالم میں پھیل کر اس امانت کو ایک ایک آدمی تک بلکہ بعد والوں تک پہنچایا اور اس طور پر کہ آپؐ کا کوئی قول، کوئی فعل آپؐ کے سامنے کیا جانے والا کوئی کام آپؐ کے جسمانی اوصاف میں سے کوئی بھی چیز نقل سے باقی نہیں رہی، اسی کو بعد والے ''احادیث نبویہ'' کے نام سے ایک دوسرے تک پہنچاتے اور پڑھتے اور پڑھاتے رہے اور حق بھی یہ ہے کہ صحابہ نے اس کام کو اتنے عظیم الشان پیمانے پر نہ کیا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین کی جو صحیح تصویر پیش کر گئے تھے وہ لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی تھی اور قرآن جو آخری اور کامل ومکمل آسمانی کتاب ہے نہ تو اس کا سمجھنا ممکن ہوتا اور نہ اس پر عمل کرنا۔

حضرات صحابہ نے آپؐ کی دعوت کو قبول کرنے کے پہلے دن سے خود کو اس کی تبلیغ اور اس کے راستے میں مجاہدات کیلئے اور مشقتوں کو برداشت کرنے کیلئے وقف کر دیا تھا، مکی زندگی تو انتہائی پر مشقت گذری، دہکتے ہوئے انگاروں تک پر لٹائے گئے اور مدینہ پہنچے تو ایک تو وطن وگھر بار سب کو چھوڑ کر جانا ہوا، دوسرے وہاں غزوات وسرایا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انتہائی جوانمردی کے ساتھ اپنی قلت وبے سروسامانی کے باوجود بڑے بڑے معرکے کئے اور حضوؐر کی وفات کے بعد جب فتوحات اور اسلامی لشکر کشی کے سلسلہ میں بے انتہا وسعت ہوئی تو اس وقت بھی اپنے کردار کو برقرار رکھا اور بے مثال جنگی کارنامے انجام دیئے، جنگل وصحراء، سمندر وپہاڑ کچھ بھی ان کی دسترس سے نہ بچا، حتیٰ کہ تاریخ کی آنکھوں نے وہ بھی دیکھا جو نہ تو پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ شاید دیکھ سکے گی، ان جواں مردوں نے ایک

دن ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا میں اپنے گھوڑے اتار دئیے اور دشمن پر فتح حاصل کی۔

تبلیغ واشاعت اسلام کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی صحابہ کرامؓ ادھر اُدھر جاتے آتے رہتے تھے، آپؐ کے بعد یہ سلسلہ بھی کافی ترقی کر گیا، چنانچہ ممتاز اہل علم صحابہ نے مختلف علاقوں میں پھیل کر اپنی اپنی درسگاہیں قائم کیں اور حضوؐر کے علم کی نشر واشاعت کی، اسی لئے صحابہ کرامؓ کے ساتھ جہاں تک اسلام کی شعاعیں پہنچیں ساتھ ہی ساتھ علم وعمل کی کرنیں بھی پہنچتی رہیں اور اسلام ومسلمانوں کے ماتحت آنے والا کوئی علاقہ بھی عملی شوق اور علمی چرچوں سے خالی نہیں رہا، بالخصوص چاروں خلفاء، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ابوہریرہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ نے اس میں نمایاں حصہ لیا، کتب حدیث میں جن صحابہ سے روایات منقول ہیں ان کی تعداد ساڑھے سات ہزار تک منقول ہے۔

مکہ مکرمہ میں تو صحابہ بہت تھوڑے تھے، غزوۂ بدر میں جنگ میں شریک صحابہ کی تعداد تین سو تیرہ تھی جو دھیرے دھیرے تیزی سے بڑھتی رہی حتیٰ کہ چھ سال بعد فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار افراد لشکر کشی میں شریک تھے، پھر دو سال بعد حجۃ الوداع وتبوک کے موقع پر ایک لاکھ اور اس سے زائد ہو گئے تھے۔

جماعت کے اعتبار سے حضرات صحابہ کے دو حصے تھے، مہاجرین، انصار، مہاجرین وہ صحابہ جو اللہ کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ آکر آباد ہو گئے تھے، انصار وہ مدنی صحاب جو ان حضرات کا ہر قسم کا تعاون کرتے تھے، مہاجرین وانصار کا رتبہ تمام صحابہ میں افضل ہے اور ان میں بھی اہل حدیبیہ کا اور اہل حدیبیہ میں سے اہل بدر کا اور اہل بدر میں چاروں خلفاء کا، یعنی حضرات ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی جو یکے بعد دیگرے حضوؐر کے جانشین ہوئے اور ان کو ''خلفاء راشدین'' کہا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ چاروں اپنے ہر معاملہ وفیصلہ میں رشد

وہدایت کو ہی اختیار کرتے تھے، بعض صحابہ کو حضورؐ نے نام زد کر کے جنت میں جانے کی بشارت سنائی، ایک موقع پر ایک ہی مجلس میں دس حضرات کو یہ خوشخبری دی، ان کو "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے، جن میں چاروں خلفاء، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبیداللہ، حضرت عبیدہ بن جراح، حضرت سعید بن زید رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔

آئندہ صفحات میں ان میں سے بعض حضرات کے حالات ذکر کئے جا رہے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ:

اسلام سے پہلے کا نام: عبدالکعبہ، اسلام کے بعد کا نام: عبداللہ، کنیت ابوبکر، لقب: صدیق، (نہایت سچے، ہر بات کی تصدیق کرنے والے)، عتیق (عذاب آخرت سے آزاد و محفوظ)، والد: عثمان ابوقحافہ جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے تھے، آپؓ کا تعلق قریش کی شاخ "بنو تمیم" سے تھا، آٹھویں پشت پر آپ کا نسب حضورؐ سے مل جاتا ہے۔

کل عمر: ۶۳ سال، ولادت: حضورؐ سے دو سال چند ماہ بعد اور حضورؐ کی وفات کے دو سال تین ماہ، نو دن بعد، ۷ جمادی الآخر ۱۳ سنہ ھ، بروز دوشنبہ بوقت مابین مغرب وعشاء وفات۔

ایک تو قریشی ہونا شرافت وعزت کے لئے کافی تھا، مزید یہ کہ آپس کے قتل کا جو خون بہا ادا کیا جاتا تھا اس کی امانت ونگرانی خاندانی عہدہ تھا، بچپن سے نہایت سلیم الفطرت، پاک دامن، نیک خو خوش اخلاق، نیز نرم دل و بردبار تھے، اسی لئے شرفاء مکہ میں شمار ہوتے تھے، مزید اہل عرب کے نسب کے سب سے بڑے عالم، فن شعر گوئی میں ماہر اور نہایت فصیح وبلیغ تھے، یہ اعزاز قبل اسلام ان کو حاصل تھے، ذریعہ معاش: عام اہل مکہ کی مانند تجارت تھا، رنگ: سفید، جسم: لاغر، رخساروں پر گوشت کم، پیشانی: ابھری ہوئی، عمر ڈھل

جانے سے بال سفید اور مہندی و نیل کے خضاب سے رنگے ہوئے۔

اپنی خاندانی عزت وذاتی شرافت کی بناء پر بچپن سے حضورؐ کے مخلص دوست اور آپ کی محبت ورفاقت میں آگے آگے، اسی لئے اسلام قبول کرنے میں تمام مردوں پر سبقت لے گئے اور اپنے اوصاف نیز حضورؐ سے بے انتہا محبت اور حضورؐ کیلئے نیز اسلام کیلئے بے مثال قربانی کی بناء پر تمام انبیاء کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل قرار پائے، ہجرت کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ آپ ہی تھے، ہر غزوہ میں آپؐ کے دست راست اور ہر مشورہ میں آپؐ کے مشیر خاص ہوتے، آپؐ کی زندگی میں آپؐ کے وزیر اور بعد میں جانشین ہوئے، مکہ کے زمانہ قیام میں حضورؐ صبح وشام ان کے گھر مشورہ کیلئے تشریف لے جاتے اور مرض الوفات میں اپنی جگہ امامت کے فریضہ کی انجام دہی کا اہل ان کو ہی سمجھا اور فتح مکہ کے بعد پہلے حج میں ان کو ہی "امیر الحج" بنا کر بھیجا۔

ان کے اسلام اور ان کی خصوصی تبلیغ وجد وجہد کی بناء پر ابتداء میں ہی قریش کے متعدد معزز حضرات نے اسلام قبول کیا، بوقت اسلام ان کے پاس سامان تجارت کے علاوہ چالیس ہزار درہم تھے، سب اسلام کی راہ میں خرچ کر ڈالے حتیٰ کہ غزوۂ تبوک میں بچا کھچا سامان بھی لا کر پیش کر دیا، ان کی انہیں قربانیوں کی بناء پر حضورؐ نے فرمایا: "جان ومال کی قربانی کے لحاظ سے ابوبکر سے زیادہ کسی کا مجھ پر احسان نہیں، اور بجز ابوبکر کے ہر ایک کے احسان کا بدلہ دے دیا، ابوبکر کا بدلہ اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے"۔

مکہ میں حضورؐ کے تبلیغی اسفار میں ساتھ رہتے، مکہ میں بارہا آپؐ کو کفار کے نرغہ سے نکالا، بلکہ آپؐ کی حفاظت وحمایت میں خود اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا، جب حضورؐ کا مع خاندان بائیکاٹ ہوا تو یہ بھی ساتھ ہو گئے، ہجرت کے پورے سفر کا انتظام کیا، سواری، غار ثور میں تین دن قیام، اس کی صفائی، کھانے پینے کا نظم، پورے راستے آپؐ کی حفاظت و دیکھ بھال، کبھی آپؐ کے آگے آگے چلنا کہ کہیں سامنے سے کوئی دشمن نہ آ جائے، کبھی پیچھے

پیچھے چلنا، یہ سب ہی کرتے رہے۔

جماعت صحابہ میں صدیق اکبرؓ سب سے زیادہ اسرار شریعت اور احکام شرعیہ کی روح سے واقف اور اللہ کے رسول کے منشا کو جاننے والے تھے، تمام اسلامی علوم میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا، قرآن پاک کے فہم و تدبر میں ایسی دقیق نظر پائی تھی کہ ان کی نگاہ ان نکات تک بآسانی پہنچ جاتی تھی جن کی طرف عام صحابہ کا ذہن بھی منتقل نہ ہو سکتا تھا، لیکن احادیث کے نقل کرنے میں نہایت محتاط تھے، اسی لئے ان سے بہت تھوڑی تعداد میں روایات منقول ہیں۔

نہایت سادہ و متواضع، محلہ والوں کا کام کرتے، ان کے جانور چراتے اور دوہتے، نماز کی حالت میں ایسے خشوع و خضوع سے کھڑے ہوتے کہ خشک لکڑی کی مانند معلوم ہوتے اور رقت اتنی طاری ہوتی تھی کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی، آخرت کی بڑی فکر تھی، پرندوں کو دیکھ دیکھ کر ان پر رشک کرتے، ان کے انہیں تمام کمالات کی بناء پر حضورؐ کو سب سے زیادہ انہیں پر اعتماد تھا، وفات سے پہلے ان کو نماز کا امام بنایا، صحابہ نے اس سے حضورؐ کا منشا سمجھ لیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد ان کو اپنا بڑا امیر چن لیا، آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ و جانشین اور اسلامی مملکت و حکومت کے اولین سربراہ ہوئے، دو سال تین ماہ نو دن خلافت کے فرائض انجام دے کر وفات پائی اور حضورؐ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

خلافت سے پہلے تجارت کے ذریعہ خرچ پورا ہوتا تھا، خلیفہ ہونے کے بعد صحابہ نے مشورہ کر کے بیت المال سے آپ کی تنخواہ متعین کر دی، بوقت وفات بیت المال سے جو سامان آپ کو ملا تھا سب کو واپس کر دینے کی وصیت کی حتیٰ کہ تنخواہ کی رقم بھی ایک باغ بیچ کر واپس کرنے کی ہدایت کی، جس لباس میں وفات ہوئی اسی میں کفن دینے کی وصیت کی۔

قرآن و حدیث میں ان کے بے شمار فضائل مذکور ہیں، حتیٰ کہ علماء نے کہا ہے

کہ: "قرآن مجید میں صاف صاف اگر کسی کی صحابیت کا تذکرہ ہے تو وہ ابوبکر ہیں، اس لئے جو ان کو صحابی نہ مانے وہ کافر ہے"۔

حضرت ابوبکرؓ کے تین صاحبزدگان اور تین صاحبزادیاں تھیں، اللہ نے سب کو شرف اسلام سے نوازا اور سب نامی گرامی ہوئے، حضرت عائشہؓ حضورؐ کی محبوب ترین بیوی تھیں، حضرت اسماء حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر کی بیوی تھیں، مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن زبیر انہیں کے لڑکے تھے، مدینہ کے مشہور فقیہ اور حضرات صحابہ کی موجودگی میں افتاء کا کام کرنے والے حضرت قاسم بن محمد آپ کے صاحبزادے محمد بن ابی بکر کے فرزند تھے، باقی دو صاحبزدگان حضرت عبداللہ و حضرت عبدالرحمٰن تھے اور تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم تھیں جو وفات کے وقت پیٹ میں تھیں۔

حضرت عمرؓ:

نام: عمر، کنیت: ابوحفص، لقب: فاروق اعظم، والدہ: ابوجہل کی قریبی عزیزہ بہن یا بھتیجی، والد: خطاب، قریش کی شاخ "بنوعدی" سے تعلق تھا، نویں پشت میں حضورؐ سے نسب مل جاتا ہے، کل عمر ۶۳ سال، ولادت حضورؐ کی ولادت کے تیرہ سال بعد اور وفات بھی اسی طرح یعنی دس برس چھ ماہ پانچ دن خلافت کر کے بتاریخ یکم محرم ۲۴ھ بروز یکشنبہ وفات پائی۔

رنگ: آپ کا سفید مائل بہ سرخی، رخساروں پر کم گوشت، قد مبارک دراز کہ ہر مجمع میں ممتاز نظر آتے، بڑے بہادر و طاقتور اور جری تھے، شروع سے ہی ان اوصاف میں مشہور تھے، مکہ کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے، اہل مکہ کی جانب سے سفارت کا کام یہی کرتے تھے، اسی لئے حضورؐ نے ان کے اسلام کی دعا فرمائی تھی، تھوڑے بہت پڑھے لکھے لیکن علمی ذوق والے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں بھی امام مانے گئے، بچپن نہایت مشقت و تنگی اور

بکریاں چرا کر گذارا۔

نبوت کے چھٹے سال ستائیس برس کی عمر میں اسلام لائے اور وہ بھی عجیب طریقہ پر کہ حضورؐ کے قتل کے ارادے سے نکلے، بہن بہنوئی کے اسلام کو سن کر پہلے انہیں ٹھکانے لگانے پہنچے مگر ہدایت خداوندی نے انہیں وہیں پکڑ لیا اور وہاں سے سیدھے ننگی تلوار لئے حضورؐ کی خدمت میں آ گئے، تمام مسلمان اتنے خوش ہوئے کہ ان کے نعرۂ تکبیر سے مکہ گونج گیا اور احادیث میں آیا ہے کہ: ''آسمان پر فرشتوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو''، ان کے مسلمان ہونے سے بڑی تقویت پہنچی، سارے مکہ کی اسلام دشمنی کے باوجود انہوں نے فوراً بیت اللہ کے پاس پہنچ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور حضورؐ نے اعلان کے ساتھ کعبے میں نماز پڑھی، اسلام کی خاطر دوسروں کی طرح انہوں نے بھی تکالیف برداشت کیں، حتیٰ کہ مدینہ ہجرت کی اور پورے اعلان و چیلنج کے ساتھ، کافروں و منافقوں کے حق میں نہایت سخت تھے، مدینہ پہنچ کر حضورؐ کے مشیر خاص رہے، حضرت ابوبکر دایاں ہاتھ تھے تو یہ بایاں ہاتھ، ہر موقع پر پیش پیش، تمام غزوات میں شریک رہے، حتیٰ کہ غزوۂ بدر میں اپنے حقیقی ماموں کو قتل کیا، کسی موقع پر حضورؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا، فتح مکہ کے بعد ایک مرتبہ عمرہ کیلئے تشریف لے گئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ: ''اے بھائی! اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا''۔

منافقین سے بہت نفرت فرماتے تھے، ایک مرتبہ ایک منافق حضورؐ کے فیصلہ کے بعد معاملہ ان کے پاس لے گیا تو اسے قتل کر دیا، منافق کے سردار کی حضورؐ نے نماز جنازہ پڑھنی چاہی تو حضورؐ کو روکا، کافروں کے حق میں بھی سخت تھے، بدر میں ان کی رائے یہ تھی کہ تمام قیدیوں کو قتل کر دیا جائے، حضورؐ کی وفات کا بے انتہا اثر پڑا تھا، حتیٰ کہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے، حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں ان کے دست راست رہے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کے فضائل وکمالات کی بناء پر اپنے بعد انہیں کو خلیفہ نامزد کیا۔

آپ کا دور خلافت اسلامی مملکت وحکومت کا نہایت زریں دور تھا، مسلمانوں کے غلبہ واقتدار اور فتوحات کے سلسلہ میں جو وعدے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئے تھے یا احادیث میں جو پیشینگوئیاں مذکور تھیں سب آپ کے دور خلافت میں پوری ہوئیں۔

مزاج مبارک میں سختی تھی، غصہ جلد آتا تھا، مگر اپنے لئے نہیں اور جہاں کسی نے اللہ کا نام لیا غصہ جاتا رہتا تھا، لوگ خلافت کے بعد آپ کی سختی سے ڈرتے تھے، آپ نے اس بات کو محسوس کیا تو تسلی دی اور اپنے مزاج کو بیان کیا، تواضع اتنی کہ جس کی حد نہیں، منبر کی تیسری سیڑھی جہاں حضرت ابوبکرؓ پیر رکھتے تھے، وہاں بیٹھتے تھے، اپنے لئے خلیفۂ رسول کے بجائے ''امیر المومنین'' کا لقب پسند کیا، بیت المال سے اپنا وظیفہ سب سے کم متعین کیا، حتیٰ کہ قرض لینے کی نوبت آتی، جو سرکاری مہمانوں پر خرچ کرتے، اپنی ضروریات کیلئے نہیں لیتے تھے، بوقت وفات ۸۰ ہزار کا قرض تھا جسے مختلف صورتوں سے ادا کرنے کی وصیت کر گئے، نہایت سادہ کھانا کھاتے، نہایت موٹے اور کھردرے کپڑے پہنتے اور ان میں بھی پیوند لگاتے رہتے حتیٰ کہ بعض مرتبہ سترہ پیوند تک شمار کئے گئے اور وہ بھی چمڑے و ٹاٹ کے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر شام گئے تو پیوند لگا لباس پہن کر، حتیٰ کہ صحابہؓ نے ان کی عظمت کے پیش نظر مشورہ کر کے حضرت عائشہؓ وحفصہؓ کو بھیجا، حضرت عائشہؓ نے ان سے بڑے اچھے انداز سے بات کی مگر جواب میں انہوں نے سب کو رلا دیا، ہمیشہ مال غنیمت کی تقسیم میں اپنے آپ کو اور اہل وعیال کو پیچھے رکھا، حتیٰ کہ اپنی اہلیہ کو محض اس وجہ سے مشک تولنے سے منع کر دیا کہ ہاتھ میں لگے گا تو تمہارا حصہ زیادہ ہو جائے گا، نماز کا نہایت اہتمام حتیٰ کہ وفات سے پہلے زخم کی وجہ سے بیہوشی کی حالت میں بھی نماز کا ذکر ہوتے ہی توجہ ہو جاتی، تہجد کا بڑا اہتمام تھا، پورے گھر کو اٹھاتے تھے، تراویح کا سلسلہ تو حضورؐ کے زمانے سے تھا، مگر موجودہ صورت اہتمام سے انہوں نے ہی رائج کی، اخیر عمر میں مستقل روزے رکھا کرتے تھے، خلافت کے پہلے سال کے بعد ہر سال حج کیا اور چند

عمرے بھی، قرآن مجید کی تلاوت کے نہایت حریص تھے اور قرآن کے الفاظ ومعانی دونوں کی اشاعت کیلئے نہایت فکرمند، اس کیلئے بہت سے انتظامات کئے، بڑے بڑے صحابہؓ کو مختلف علاقوں میں بھیجا، علم دین میں خود بھی بڑا پایہ رکھتے تھے، علوم دینیہ کی نشر واشاعت کی بڑی فکر وتاکید کی، خود بھی مختلف صورتوں سے اس کام کو کرتے رہتے تھے، البتہ حضوؐر کی احادیث سے زیادہ قرآنی احکام کے بیان کو پسند فرماتے تھے، اہل علم کو نہایت محبوب بلکہ سب سے آگے رکھتے تھے، ان کے بارے میں تمام صحابہ کے درمیان سب سے زیادہ علم والا ہونے کا اشارہ احادیث میں موجود ہے، حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ: ''علم کے دس حصوں میں سے نو حصہ ان کو ملا ہے''، اس لئے ان کے عہد میں حکومت کی وسعت کے ساتھ علم کی بھی بہت اشاعت ہوئی، بڑے عقل مند، صحیح رائے رکھنے والے تھے، متعدد معاملات میں آپ کی رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی اور حکم خداوندی آیا مثلاً منافقوں کی نماز جنازہ، ازواج مطہرات کا پردہ، بدر کے قیدیوں کا معاملہ وغیرہ۔

جرأت وبہادری کی وجہ سے نہایت حق گو تھے، حضوؐر فرمایا کرتے تھے کہ: ''عمر کی زبان پر تو حق ہی بولتا ہے''، اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی بصیرت وفراست بلکہ نور ایمانی دیا تھا، بہت سی کرامات ومکاشفات منقول ہیں، دریائے نیل کی خشکی محض ایک پرزے سے دور ہوگئی، ایک موقع پر دشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے اسلامی لشکر کو مدینہ سے بوقت خطبہ ہدایت دے کر بچایا اور وہاں آپ کی آواز کو تمام لوگوں نے سنا، اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ: ''اگر آخرت میں نہ کچھ ملے، نہ کچھ کہا جائے تو بڑی بات ہے''، بہت سی آیات وروایات میں ان کی فضیلت آئی ہے، حضرات صحابہؓ اور اس کے بعد امت کا اتفاق رہا ہے کہ: ''حضوؐر کے صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ کے بعد سب سے افضل یہی تھے''۔

وفات بصورت شہادت ہوئی، ایک مجوسی غلام کو اس کے خلاف ایک فیصلہ کی وجہ سے

آپ سے کدورت ہوگئی، ۲۷ ذی الحجہ کو فجر کے وقت تکبیر تحریمہ کہتے ہی اس نے زہر آلود خنجر مار دیا اور کاری زخم لگا، امامت نہ کرسکے، دوسرے صاحب نے امامت کی، پھر تین دن تک کمزوری وبے ہوشی کا سلسلہ رہا حتیٰ کہ یکم محرم ۲۴ھ کو آپ رحلت فرماگئے، صحابہؓ کو بڑا رنج وصدمہ ہوا، حضرت صہیب نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں روضۂ نبوی میں دفن کئے گئے۔

آپ نے کئی نکاح کئے، بوقت خلافت ایک بیوی تھیں، ان کو بھی اس خیال سے کہ کہیں غلط سفارش کریں، طلاق دے دی، پھر ۱۷ھ میں حضرت فاطمہؓ کی صاحبزادی ام کلثوم سے محض اس خیال سے نکاح کیا کہ قیامت میں حضوؐر سے رشتہ کی نسبت نفع پہنچائے گی اور اسی عظمت کی بناء پر چالیس ہزار درہم مہر دیا، ایک صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہ تھیں اور پانچ صاحبزادے: حضرت عبداللہ جو اکابر صحابہ میں شمار کئے گئے، عبیداللہ، عبدالرحمٰن، بجیر اور عاصم، یہ عاصم وہی ہیں جو مشہور اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نانا تھے۔

حضرت عثمانؓ:

نام: عثمان، لقب: ذوالنورین (حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں سے نکاح کی وجہ سے)، والد: عفان، قریش کی مشہور شاخ بنو امیہ سے تعلق تھا، پانچویں پشت پر نسب حضوؐر سے مل جاتا ہے، والدہ: حضوؐر کی پھوپی زاد بہن اروی، گویا حضوؐر سے قریبی قرابت رکھتے تھے، عمر تقریباً بیاسی سال، حضور اکرم ﷺ کے تقریباً چھ سال بعد ولادت ہوئی اور بصورت شہادت ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو۔

قد: متوسط، رنگ: سفید مائل بہ زردی، چہرہ مبارک پر چیچک کے چند داغ، سینہ کشادہ تھا، خاندان بنو ہاشم کے بعد قریش میں سب سے زیادہ باعزت تھا، قریش کا مشہور عہدۂ

علمبرداری اسی خاندان کو حاصل تھا، حضرت ابوسفیان اور معاویہ کا تعلق اسی خاندان سے تھا، خود ان کی بھی اسلام سے پہلے بڑی عزت تھی، شرفاء مکہ میں سے اور بچپن سے نہایت حیادار تھے اور سخی وفیاض، اسلام نے ان اوصاف کو اور بڑھا دیا، حضرت ابوبکرؓ کے احباب خاص میں سے تھے، چنانچہ انہیں کی تبلیغ پر بالکل شروع میں مسلمان ہوئے اور باوجود اپنی دولت وعزت کے سخت تکالیف کا سامنا کیا، حتیٰ کہ حبش کی ہجرت کی اور مدینہ کی ہجرت سے قبل مکہ واپس آئے اور پھر مدینہ تشریف لے گئے، حضورؐ کی دو صاحبزادیاں نکاح میں رہیں، پہلی حضرت رقیہؓ جن سے اسلام لاتے ہی نکاح ہوا اور حبش و مدینہ کی ہجرت میں وہ ساتھ رہیں، غزوۂ بدر کے موقع پر ان کی وفات ہوگئی تو تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے حضورؐ نے ان کا نکاح کردیا، یہ ۹ سنہ ھ میں وفات پاگئیں، حضورؐ نے ان کے انتقال پر فرمایا کہ: ''اگر میری سو لڑکیاں ہوتیں تو عثمان سے نکاح کردیتا'' اور دوسرے نکاح بھی کئے، بوقت انتقال حضرت ''نائلہ'' زوجیت میں تھیں، اولاد میں سترہ لڑکے و لڑکیاں تھیں۔

قبل اسلام بھی بت پرستی و شراب نوشی سے دور رہے، اللہ نے چونکہ دولت سے نوازا تھا، اس لئے مالی خدمات بہت کیں، مدینہ منورہ میں صرف ایک کنواں میٹھے پانی کا تھا جو ایک یہودی کی ملکیت تھا، حضورؐ کی اپیل پر اسے خرید کر وقف کیا اور بالخصوص غزوۂ تبوک جو نہایت اہم غزوہ و معرکہ تھا اس میں بہت بڑی مدد کی حتیٰ کہ ہزاروں ہزار کی تعداد والے لشکر کے آدھے یا تہائی حصے کے اخراجات اپنے ذمہ لئے، مزید برآں ایک ہزار اونٹ، ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار دیئے، بجز غزوۂ بدر کے تمام غزوات میں شریک رہے، اس لئے کہ اس موقع پر حضورؐ نے حضرت رقیہؓ کی خدمت کیلئے روک دیا تھا، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورؐ نے انہیں کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا تھا اور شہادت کی خبر اڑ گئی تھی تو بیعت رضوان لی گئی تھی، جس کا مقصد محض ان کے قتل کا بدلہ لینا تھا۔

وحی کی کتابت فرمایا کرتے تھے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نجی خطوط بھی لکھتے تھے، نماز کا

بڑا اہتمام تھا، تہجد بڑی پابندی سے اور رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر پوری رات پڑھتے رہتے تھے، ہر روز تہجد میں ایک قرآن ختم کرتے تھے، مستقل روزے رکھتے تھے، صدقہ وخیرات کی تو کوئی حد ہی نہ تھی، ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا ان کے ایک ہزار اونٹ غلہ لے کر آئے تھے سب کو صدقہ کردیا، بکثرت حج و عمرہ کئے، اعزہ واقارب کا بہت خیال فرماتے تھے اور اپنی دولت سے ان کو بہت فائدہ پہنچاتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں نیز اپنے دور خلافت میں بھی مسجد نبوی کی توسیع کی۔

حضرت عمرؓ کے بعد ۲۴ سنہ ھ میں خلیفہ ہوئے اور بارہ دن کم بارہ سال خلافت کے فرائض انجام دے کر ذی الحجہ ۳۵ سنہ ھ میں سفر آخرت فرمایا، ان بارہ سالوں میں سے چھ سال تو بہت اچھے گذرے البتہ چھ سال انتشار و خلفشار میں گذرے اور اس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس محبوب کو ایسی تکلیف پہنچی کہ پھر یہ انتشار و خلفشار ختم نہ ہوسکا، بالخصوص مسلمانوں کی باہمی رنجش اور قتل وخون، لوگوں نے ان کے خلاف غلط و بے بنیاد اعتراضات اٹھا کر انتشار پیدا کیا حتیٰ کہ مدینہ پر چڑھائی کردی اور ان کو بالکل محصور کردیا، حضرت عثمانؓ نے ہر ممکن کوشش، معاملات کو حل کرنے اور لوگوں کو سمجھانے کیلئے کی حتیٰ کہ باوجود اتنی لمبی چوڑی حکومت کے سربراہ اور تمام صحابہ میں محبوب و معزز ہونے نیز صحابہ و مخلصین کی جانب سے شریروں سے جنگ کرنے کی پیش کش کے جنگ کی اجازت نہ دی، مخلصین صحابہ نے حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی، ایک دن جمعہ کو مسجد میں نماز کے وقت پتھر مار مار کر بے ہوش کردیا گیا، پانی تک بند کردیا گیا، آنے جانے سے روک دیا گیا، چونکہ حضرت عثمان کو حضورؐ کی زبان سے شہادت کی خبر مل چکی تھی، اس لئے انہوں نے یہ صبر و استقامت اختیار کر رکھی تھی، آخر ایک دن شرپسند گھر کے دروازے پر تو بس چلا نہیں، دوسرے مکانوں سے اور پشت کی طرف سے چڑھ چڑھ کر حملہ آور ہوئے، مدافعت کرنے

والے ناکام رہے اور ایک شخص ''کنانہ بن بشیر'' نے عین تلاوت کی حالت میں سر پر وار کیا، جس سے سر پھٹ گیا، پھر ایک دوسرے شخص نے سینے پر سوار ہو کر کئی وار کئے اور ایک تیسرے شخص ''سودان بن حمران'' نے شہید کر دیا، یہ واقعہ جمعہ ۱۸ ذی الحجہ کو پیش آیا، اس دن آپ روزے سے تھے اور بہت اچھا لباس پہنے تھے، صبح کو بیس غلام بھی آزاد کئے تھے، چوں کہ شہر پر باغیوں کا قبضہ تھا، اس لئے تجہیز و تکفین آسان نہ تھی، دو دن تک لاش گھر میں پڑی رہی، تیسرے دن چند آدمیوں نے ہمت کر کے تدفین کا ارادہ کیا اور انہوں نے چپکے سے نماز جنازہ پڑھ کر مدینہ کے مشہور قبرستان ''جنت البقیع'' سے متصل ایک مقام میں دفن کیا۔

قرآن وحدیث دونوں میں آپ کے بے انتہا فضائل مذکور ہیں، صحابہ بھی آپ کو حضرت عمر کے بعد سب زیادہ عزت دیتے تھے، حضورؐ نے فرمایا کہ: ''ان سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں''، حضرت عثمانؓ بھی بڑے صاحب علم تھے، مسائل دینیہ اور قرآن و حدیث کا بڑا علم رکھتے تھے، احادیث کی کتابوں میں بہت سی روایات منقول ہیں۔

حضرت علی:

نام: علی، لقب: اسد اللہ (اللہ کے شیر)، کنیت: ابوالحسن وابوتراب، والدہ: فاطمہ بنت اسد بن ہاشم یعنی حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کے بھائی کی بیٹی اور والد: حضورؐ کے چہیتے اور سب سے زیادہ شفقت کرنے والے چچا ''ابوطالب'' جو مسلمان نہیں ہوئے تھے البتہ وہ مسلمان ہو گئی تھیں، کل عمر: تقریباً ۶۳ سال، پیدائش: حضورؐ کی نبوت سے تقریباً دس سال پہلے، وفات: ۱۸ رمضان ۴۰ سنہ ھ کو۔

بچپن سے ہی حضورؐ کے ساتھ اور آپ کے زیر تربیت وزیر پرورش رہے، اس لئے کہ والد ابوطالب تنگدست تھے، اسی لئے حضورؐ کو ان سے مانند اولاد محبت تھی اور بالآخر داماد بنا

کر معنوی بیٹا بنا ہی لیا، بچپن سے حضورؐ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سیرت واخلاق کا کیا پوچھنا، اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے، بلکہ بچوں میں سب سے پہلے، دس سال یا اس سے کم عمر میں اسلام لائے اور سفر وحضرت میں آپؐ کی رفاقت میں رہتے، بوقت ہجرت حضورؐ آپ کو ہی اپنے بستر پر لٹا کر گھر سے نکلے تھے، آپ بعد میں مدینہ پہنچے، ۲ سنہ ھ میں حضورؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپ کا نکاح ہوا، حضرت فاطمہؓ کی حیات میں آپ نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔

آپ کے فضائل بہت ہیں، تمام غزوات میں شریک رہے اور نمایاں کارنامے انجام دیئے، غزوۂ تبوک میں شریک نہیں تھے بلکہ حضورؐ کے نائب کے طور پر مدینہ میں ہی مقیم رہے، ۹ سنہ ھ میں جب مسلمانوں نے پہلا حج کیا تو حضرت علیؓ بھی ایک اہم ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے حج کو تشریف لے گئے، حضورؐ کو غسل دینے والوں میں آپؓ بھی تھے، حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور خلافت میں ان حضرات کا پورا تعاون کرنے والے اور بحیثیت وزیر کام کرنے والے تھے، بالخصوص حضرت عثمانؓ کی حفاظت میں پورا حصہ لیا، ہر ایک کی بے انتہا عظمت کرتے تھے۔

نہایت طاقت ور اور دوٹوک فیصلہ کرنے والے تھے، حضورؐ نے فرمایا کہ: ''صحابہ میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں''، دیگر خلفاء راشدین کی طرح زبردست علم رکھنے والے تھے، بلکہ باقی تین حضرات کے مقابلے میں علم کی نشر واشاعت میں آپ کا زیادہ حصہ رہا، قرآن پاک کی تفسیر اور فقہی مسائل خاص طور سے آپ سے بہت زیادہ منقول ہیں، صوفیاء نے صحابہ کے مجمع میں آپ کو تصوف کا خاص مرکز قرار دیا ہے، دنیا سے نہایت متنفر ومتوحش تھے، معمولی لباس وکھانا پینا پسند فرماتے تھے اور بڑا رعب وہیبت رکھتے تھے، لیکن خوش طبع تھے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ۳۵ ھ میں آپ مسند خلافت پر بیٹھے اور تین دن

کم پانچ سال کی مدت تک اس اہم ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے بتاریخ ۱۸ رمضان ۴۰ھ شہید ہوئے، شہادت کا واقعہ یوں پیش آیا کہ عبدالرحمن بن ملجم نامی ایک شخص نے بوقت فجر مسجد کو جاتے ہوئے راستے میں آپ کی پیشانی مبارک پر تلوار ماری جس سے آپ خون سے نہا گئے اور وہیں گر پڑے، حضرت حسنؓ پیچھے تھے فوراً ہی لوگ جمع ہو گئے، آپ کو گھر لایا گیا، صبح کو آپ زخمی ہوئے تھے اور شب میں وفات پا گئے، دن جمعہ کا تھا، آپ نے اپنے سامنے عبدالرحمن کو قتل نہیں ہونے دیا بلکہ فرمایا کہ: "اگر میں زندہ رہ گیا تو سمجھ لوں گا، ورنہ تم اسے قتل کر دینا"۔

آپ کی شہادت پر خلافت راشدہ کا مبارک سلسلہ ختم ہو گیا، جیسا کہ حضورؐ نے خبر بھی دی تھی کہ: "خلافت تیس سال تک رہے گی" اور یہ مدت آپ کی شہادت پر پوری ہو گئی، حضورؐ نے ہی اپنے ارشادات میں حضرات عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی شہادت کی بھی خبر دی تھی، چنانچہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق تینوں حضرات شہید ہوئے۔

آپ سے پہلے ہونے والے تینوں خلفاء راشدین آپ کی اور خود آپ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے جیسا کہ ہر ایک کا حق تھا، نیز آپ کے دور خلافت میں اگرچہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ سے جنگ کی نوبت آئی لیکن آپ ان دونوں کی اور یہ دونوں آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے، جنگوں کی نوبت محض غلط فہمیوں اور کچھ شریروں کی وجہ سے آئی، ورنہ ان حضرات کے دلوں میں کسی کی طرف سے نفرت و دشمنی نہ تھی جیسا کہ دنیا والوں کی جنگوں میں ہوا کرتا ہے، اس لئے کسی کے حق میں گستاخی جائز نہیں ہے۔

قد مبارک: پستہ، جسم: بھاری، پیٹ: بڑا، داڑھی لانبی اور رنگ: گندمی تھا، حضرت فاطمہؓ کے بطن سے پانچ اولادیں: تین صاحبزادگان اور دو صاحبزادیاں تھیں، تفصیل گذر چکی ہے، دوسری ازواج سے حسب ذیل اولاد تھی: عباس، جعفر، عبداللہ، عثمان، عبیداللہ، ابوبکر، محمد الاصغر، یحییٰ، عمر، محمد الاوسط، محمد الاکبر (جو محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں)، رقیہ،

ام حسن، رملہ الکبریٰ، ام کلثوم صغریٰ، ام ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ، رملہ الصغریٰ، فاطمہ، امامہ، خدیجہ، ام الکرام، ام سلمہ، ام جعفر، جمانہ، نفیسہ، نسب حضرات حسنین اور محمد الاکبر، نیز عباس و عمر سے چلا۔

تقدیر

مومن ہونے کیلئے جن چیزوں کا دل سے یقین کرنا ضروری ہوتا ہے ان میں "تقدیر" بھی ہے۔

"تقدیر" کے لغوی معنی ہیں اندازہ لگانا، طے کرنا، شرعاً اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے، ہر لمحہ وہر گھڑی سامنے آرہا ہے؛ یہ سب جیسے اللہ کی مشیت یعنی اس کے چاہنے سے ہورہا ہے، ایسے ہی دنیا کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے اللہ کی جانب سے اس کے طے کردینے اور طے کرکے لوح محفوظ میں لکھادینے کے مطابق ہورہا ہے، موت وزندگی، عزت وذلت، غربت ودولت، صحت وبیماری، سعادت وبدبختی، ہدایت وگمراہی تمام چیزیں اس کی جانب سے طے شدہ ہیں، سرسری طور پر اس مسئلہ کو دیکھنے میں آدمی الجھ جاتا ہے، بہک جاتا ہے، اسی لئے یہ مسئلہ شریعت کا نہایت نازک مسئلہ ہے اور اس کی زیادہ کھود کرید اور اس میں غور وفکر ناپسندیدہ ومنع ہے، بس یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کی جانب سے ایسا ہی طے ہے، انسان کے دل میں یہ خیال واعتقاد جتنا بس جائے اسے اتنا ہی سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور یہ حالات اسی کی جانب سے آرہے ہیں۔

آپ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے نظام کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ایک حصہ وہ ہے جو محض اس کے کرنے سے اور فرشتوں کے واسطے سے انجام پارہا ہے، انسانوں کا اس میں کوئی دخل نہیں، جیسے ہواؤں کا چلنا، بارش ہونا، پھل وپھول کا اُگنا، تمام مخلوقات کی پیدائش وغیرہ۔

دوسرا حصہ وہ ہے جس کو انسانوں سے متعلق کر رکھا ہے، یعنی انسانی اعمال جنہیں انسان اپنے ہاتھ وپیر ودیگر اعضاء سے کرتا ہے، دل میں ان کے کرنے یا نہ کرنے کا میلان

پاتا ہے، نفس وضمیر اسے ان کے کرنے یا نہ کرنے پر ابھارتے وآمادہ کرتے ہیں۔

یوں تو یہ دونوں حصے اللہ کے زیر قدرت اور تقدیر کے ماتحت ہیں، البتہ پہلے حصہ میں انسان کا نہ کوئی دخل ہے اور نہ اختیار اور دوسرے حصہ میں نہ تو وہ بالکل مجبور ہے، پتھروں اور درختوں کی مانند ہے اور نہ بالکل آزاد کہ جو جی میں آئے کرنا چاہے کر گذرے، بلکہ دونوں کے بیچ کی کیفیت ہے اللہ نے ہر کام کے لئے کچھ اسباب ووسائل بنائے ہیں، انہیں اسباب ووسائل کے ذریعہ وہ کام ہوتا ہے تو اسباب ووسائل کا اختیار کرنا انسان کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اور ان کے ذریعہ کام کا ہوجانا اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، بندہ جس قسم کے اسباب اختیار کرتا ہے ویسا ہی کام وجود میں آتا ہے، بیماری سے شفا دوا کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، دوا کرنا ہمارا کام ہے، مگر شفا اللہ کا کام ہے، ایک ہے منزل اور ایک ہے اس کے راستے پر چلنا، راستے پر چلنا ہمارا کام ہے، منزل تک پہنچانا اللہ کا کام ہے، اللہ نے ہم کو پیدا فرما کر ہدایت اور گمراہی، ایمان وکفر کے دو راستے ہمارے سامنے رکھ دیئے ہیں اور ان میں کسی ایک پر چل پڑنے کا اختیار دے دیا ہے، اب ہم اپنے اختیار سے جس پر چلیں گے اسی کے مطابق منزل کو پالیں گے:

اِنَّاخَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ	ہم نے اس کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا اس طور
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ بَصِيْرًا	پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں تو ہم نے اس کو
اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا	سنتا دیکھتا بنایا، ہم نے اس کو رستہ بتلایا یا تو
وَّ اِمَّا كَفُوْرًا	وہ شکر گذار ہوگیا یا ناشکر ہوگیا۔

حضرت علیؓ نے اس اختیار کو یوں سمجھایا کہ: "دیکھو اگر ایک پیر اٹھا کر کھڑے ہونا چاہو تو ہوسکتے ہو، مگر دونوں پیروں کو اٹھا کر کھڑے ہونا چاہو تو ناممکن، بس اللہ نے بندے کو اسی حد تک اختیار دیا ہے اور اسی حد تک پابند بنایا ہے"، بعض حضرات نے یوں فرمایا ہے کہ "تقدیر کی بناء پر مجبور نہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ انسان اچھے کام اور فائدے کے کام

کر کے خوش ہوتا ہے اور برے کام، نقصان کے کام سے غمگین ہوتا ہے، یہ خوشی وغمی ہی اس کے اختیار کی علامت ہے، اگر مجبور ہو تو یہ خوشی وغم کیوں ہو"۔

بہرحال تقدیر یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ نے پہلے سے طے فرما دیا ہے، کوئی بھی انسان جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اس کا کھانا پینا، عمر وموت سب طے شدہ ہوتی ہے اور تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، البتہ اللہ نے تقدیر کے دو حصے رکھے ہیں، ایک کو تقدیر معلق اور دوسرے کو تقدیم مبرم کہتے ہیں، تقدیر معلق کا مطلب ہے "ایسی تقدیر جو کسی چیز پر موقوف ہوتی ہے کہ اس کے ہونے نہ ہونے سے اس میں تبدیلی ہو جاتی ہے" جیسے کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ: "انسان اگر نیکی کا عادی ہو تو اس کی عمر بڑھا دی جاتی ہے" اور تقدیر مبرم جو بالکل قطعی ہے اور اس میں کسی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی، تقدیر کے سلسلہ میں، بہت سی احادیث وارد ہیں: (۱) اللہ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دیں تھیں (۲) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ: ایک دن ہم لوگ تقدیر کے متعلق بحث کر رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، حضورؐ یہ منظر دیکھ کر سخت ناراض ہوئے اور آپؐ کا چہرہ مبارک بالکل سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ: "تمہیں اسی کا حکم دیا گیا ہے، یا یہ کہ مجھے اسی کیلئے بھیجا گیا ہے، تم سے پہلے کے لوگ اس کی بابت بحث ومباحثہ میں ہلاک ہو گئے ہیں، تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اس کی بابت بحث مت کرنا"۔

عقیدۂ آخرت

جن حقیقتوں پر ہمارے لئے ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے آخرت بھی ہے، قرآن وحدیث میں بکثرت اللہ پر ایمان کے ساتھ آخرت پر ایمان کا ذکر ہے، آپ قرآن مجید کھولیں تو سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہے "وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ" (اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں)۔

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب: اس بات کا یقین ہے کہ ایک دن اس عالم رنگ و بو کی موجودہ شکل وصورت کا آخری دن ہوگا، اس دن یہ عالم ختم ہو جائیگا، اس کی ایک ایک چیز فنا ہو جائیگی، حتیٰ کہ آسمان وزمین کی موجودہ حالت وحقیقت بھی بدل جائیگی اور پھر ایک نئی دنیا وجود میں آئیگی، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس دن کی آخری گھڑی تک کے ہر انسان کو پھر سے جسم وروح کے ساتھ زندگی بخشی جائیگی اور سب کی اللہ کے سامنے پیشی ہوگی دنیا میں ملی ہوئی زندگی میں کیا گیا؛ بھلا یا بُرا سب سامنے آئے گا اور اسی کے مطابق اللہ کی جانب سے جزا وسزا، ثواب وعقاب، رضا وناراضگی کا معاملہ ہوگا۔

ایک ایسے دن کے آنے کا عقل بھی اس وجہ سے تقاضا کرتی ہے کہ اس دنیا میں بہت سے براکام کرنے والے بے سزا کے پھر رہے ہیں اور بھلا کرنے والے پریشان، کتنے ظالم آزاد گھوم رہے ہیں اور مظلوم حیران، تو کوئی وقت وموقع تو ایسا ہونا چاہئے جہاں ہر ایک کی حقیقت کھلے اور ہر ایک کی پکڑ وگرفت ہو، دنیا کے لوگ ایسی آزادی کو گوارا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کے شایان شان بے انصافی کب ہو سکتی ہے، اسی لئے فرمایا گیا ہے: "أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ" (تو کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں کی مانند کر دیں گے)۔

نیز یہ کہ جب دنیا کی ہر چیز کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور

برآمد ہوتا ہے تو کیا یہ نیک و بد اعمال بے ثمرہ و بے نتیجہ ہوں گے؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ....

یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے۔

اس دنیا میں سزا و جزا کا سلسلہ اس لئے نہیں ہے کہ یہ امتحان کی جگہ ہے، یہاں تو عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے، اس دن اعمال کی جانچ و تول ہوگی۔

''آخرت'' کی ضرورت اللہ تبارک وتعالیٰ کے جلال و جمال اور صفت عدل و کمال کے پورے ظہور کیلئے بھی ہے۔

رہ گیا اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا وجود عقل کی رو سے، تو قرآن مجید نے تو اس کا بڑا سادہ جواب دیا ہے کہ: ''جب تم کو یہ تسلیم ہے کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ دوسری مرتبہ پیدا کرے گا تو ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد دوسری مرتبہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے'' ـــــ اور بڑے بڑے سائنس دانوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، ''پروفیسری سے ڈوکاس'' لکھتے ہیں:

> ''کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد؛ جنہوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور موجود ہیں جن کی بناء پر روح کے باقی رہنے کا فریضہ ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے، اس کی دوسری توجیہ نہیں کی جا سکتی، اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے چند کے نام یہ ہیں''۔

پھر نو ممتاز مفکرین کے نام ذکر کئے ہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تجرباتی دلیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے''۔

اس عقیدہ کا انسانی زندگی کے سدھار و بناؤ میں بڑا دخل و اثر ہے، چنانچہ والٹیر کہتا ہے:

> ''خدا اور دوسری زندگی کے تصور کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ اخلاقیات کیلئے مفروضے کا کام دیتے ہیں، اس کے نزدیک صرف اسی کے ذریعہ سے عمدہ اخلاق کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسن عمل کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہتا اور اسی طرح سماجی نظم کا برقرار رہنا ناممکن ہو جاتا ہے''۔

دراصل یہ عقیدہ ہی انسان کو برائیوں سے روکتا اور بھلائیوں پر آمادہ و مجبور کرتا ہے، قانون حکومت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ معلوم ہے کہ حکومت کی سزا کیسی ہی سخت ہو، وقتی و عارضی ہوتی ہے اور یہ ہمیشہ کی اور سخت ترین اور مشاہدہ و تجربہ بھی یہی ہے کہ اس یقین کے حامل لوگ ہی پاکیزہ زندگی گذارتے ہیں۔

البتہ اس کی تفصیلات زبان نبوت کے ذریعہ ہی جانی جا سکتی ہیں، عقل سے نہیں، اس لئے کہ آخرت کی نسبت عقل کی حیثیت ایسی ہے جیسے کہ بچہ جو کہ ماں کے پیٹ میں ہو اسے دنیا کی خبر پہنچائی جائے تو وہ ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا، نہ یقین کر سکتا ہے، اس لئے انبیاء پر یقین کی بناء پر ان باتوں کا یقین کرنا ہوگا، آخرت کا پہلا مرحلہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور میں پیشی اور پوچھ گچھ کا ہوگا اور دوسرا مرحلہ اللہ کے فیصلہ کے مطابق جائے قیام یعنی جنت یا دوزخ میں جانا و رہنا۔

عالم برزخ یعنی قبر کی زندگی

قرآن پاک اور حضور ﷺ کی احادیث میں ذکر کردہ تفصیلات کے مطابق انسانی زندگی کے چار مراحل ہیں؛ پہلا مرحلہ: عالم ارواح؛ جہاں وہ ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے تک رہتا ہے، دوسرا مرحلہ: عالم اجسام یعنی یہ دنیا جہاں وہ ماں کے پیٹ میں آنے کے بعد سے موت تک رہتا ہے، تیسرا مرحلہ: عالم برزخ یعنی دنیا وآخرت کے درمیان کا عالم؛ جہاں اسے موت سے لے کر قیامت آنے تک رہنا ہے، چوتھا مرحلہ: عالم قیامت جو اس عالم کے فنا ہونے پر شروع ہوگا اور پھر کبھی ختم نہ ہوگا۔

عالم ارواح میں صرف روح ہوتی ہے، عالم اجسام میں روح کے ساتھ جسم بھی ہوتا ہے، عالم برزخ میں محققین کے قول کے مطابق عام لوگوں کی محض روح ہوتی ہے اور جسم ختم ہوجاتا ہے؛ ہاں خاص خاص بندوں کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں، جیسے انبیاء، اولیاء، شہداء، عالم آخرت میں پھر روح وجسم دونوں جمع ہوجائیں گے، مگر دنیا وآخرت کے جسم میں فرق یہ ہے کہ دنیا کا جسم مختلف چیزوں سے متاثر ہوتا ہے اور بالآخر مٹ جاتا ہے، سڑ گل جاتا ہے اور آخرت کا جسم کسی چیز کا کوئی اثر نہیں لے گا اور کبھی نہ بدلے گا اور نہ ہی ختم ہوگا۔

عالم برزخ کو ہی "قبر کی زندگی" کہتے ہیں، اس زندگی کا حاصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کئے گئے اعمال کے مطابق آخرت میں انسان کے ساتھ جو معاملہ ہونا ہے اس کا ہلکا سا نمونہ وسلسلہ قبر سے ہی شروع ہوجاتا ہے، اسی لئے حضورؐ نے فرمایا ہے: "قبر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا یا جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے"۔

انسان جب مرتا ہے تو روح اس کے جسم سے نکل جاتی ہے اور اس کا تعلق عالم برزخ سے قائم ہوجاتا ہے، روایات کی تصریح کے مطابق عالم برزخ کی کاروائی اس وقت تک شروع نہیں ہوتی جب تک کہ جسم انسانوں کے ہاتھوں میں رہے، اگر ان کے قبضے میں ہو،

جب ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو یہ کاروائی شروع ہوتی ہے، اسی لئے تاکید ہے کہ: "مردہ کے غسل اور کفن ودفن میں جلدی کرنی چاہئے"۔

سب سے پہلے انسان کا قبر سے سابقہ پڑتا ہے جو نیکوں کا استقبال کرتی ہے اور بروں کو بری طرح دباتی ہے، پھر دو فرشتے جو "منکر" اور "نکیر" کہلاتے ہیں، آکر تین اصولی سوالات کرتے ہیں، "دنیا میں رب کس کو جانا"، "دین کون سا اختیار کیا" اور "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کہتے ہو"؟ مومن کے جوابات ان کے حق میں صاف ہیں اور کافر لاعلمی کا اظہار کرتا ہے، پھر مومن اگر بدعمل رہا ہے تو کچھ نہ کچھ سختی ضرور ہوتی ہے، مگر کافر کے مقابلہ میں اس کا معاملہ ہلکا رہتا ہے، کافر کیلئے سخت مصیبت یہیں سے شروع ہوجاتی ہے۔

نیک مومن سے کہا جاتا ہے: "ٹھاٹ سے سو، اب قیامت میں اٹھنا" اور قبر نہایت آرام دہ اور تا حد نظر کشادہ کردی جاتی ہے، جنت کی ایک کھڑکی اس میں کھول دی جاتی ہے، جنت کا لباس وبستر اس کو مہیا کیا جاتا ہے اور صبح وشام اسے جنت میں ملنے والا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے، اگر کچھ برے کام کئے ہوتے ہیں تو ان کی سزا بھی ملتی ہے، مگر اس کے کئے ہوئے نیک اعمال اسے تکلیف سے بچاتے بھی ہیں، قبر میں ہی جہنم بھی دکھائی جاتی ہے کہ اس سے بچ گئے، بعد میں مرنے والوں کی ارواح سے بھی ملاقات ہوتی ہے، ان سے بعد کے حالات کی دریافت ہوتی ہے۔

کافر کے ساتھ سخت سے سخت معاملہ ہوتا ہے، قبر نہایت تنگ کردی جاتی ہے کہ پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور سخت سے سخت عذاب دیا جاتا ہے، جسے انسانوں اور جناتوں کے علاوہ ساری مخلوق محسوس کرتی اور سنتی ہے، کبھی انسانوں پر بھی منکشف ہوجاتا ہے، جنت جس سے اس کو محروم کیا گیا؛ دکھائی جاتی ہے، جہنم کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور جہنم کی ایک کھڑکی قبر میں کھول دی جاتی ہے، قبر آگ بن جاتی ہے، فرشتے مارتے ہیں، نہایت زہریلے سانپ وبچھو اسے ڈستے اور نوچتے ہیں، جو مومن بدعمل ہوتا ہے نماز، روزہ وغیرہ سے دور ہوتا ہے اسی قسم کے عذاب کا سامنا اس کو بھی کرنا ہوتا ہے، البتہ کافر سے ہلکا عذاب ہوتا ہے۔

قیامت کی علامات اور حالات

یوں تو قرآن مجید اور احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قیامت نہایت قریب آچکی ہے اور اب اس کے آنے میں دیر نہیں ہے''، لیکن اس کا کوئی متعین وقت نہیں بتایا گیا ہے، جب کبھی وقت کا سوال ہوا تو حضورؐ کی زبان سے وقت کے علم کا انکار کرایا گیا کہ اس کے آنے کے وقت کی فکر نہ کرو، بلکہ یہ سوچو کہ وہ کیسی سخت چیز ہوگی، لہٰذا اس کی تیاری کرو، البتہ روایات و آیات میں اس کی بہت سی علامات ذکر کی گئی ہیں، جن سے اس کے زیادہ سے زیادہ قرب کو جانا جا سکتا ہے، ان میں سے بعض علامات تو عام ہیں، جیسے ہر قسم کے گناہوں کی کثرت، طاعات میں رغبت کی کمی وغیرہ اور بعض خاص و اہم ہیں، مثلاً:

''دجال کا نکلنا'': جس کے متعلق آتا ہے کہ ہر نبی نے امت کو اس سے ڈرایا ہے، جو خدائی کا دعویٰ کر کے ساری انسانیت کو فتنے میں ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اسے بہت سے ظاہری کمالات دے گا، مثلاً مردے کو زندہ کرنا، زمین کے خزانے وغیرہ نکالنا، جو اس کی مان لے گا وہ تباہ و برباد ہو جائیگا اور جو نہ مانے گا کامیاب ہو کر رہے گا، حضورؐ نے اس کی خاص پہچان یہ بتائی ہے کہ: ''وہ داہنی آنکھ کا کانا ہوگا اور اس کی پیشانی پر ''ک ف ر'' حروف لکھے ہوں گے، جسے ہر مسلمان پڑھ لے گا، خواہ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ ہو''۔

''حضرت مہدی کا آنا'': مہدی ان کا لقب ہوگا، ان کا اور ان کے والدین کا نام حضورؐ کے جیسا ہوگا، نیز صورت و سیرت بھی حضورؐ سے ملتی جلتی ہوگی، جو تمام مسلمانوں کے سربراہ ہوں گے اور باطل کے خلاف جہاد کریں گے، اسی بیچ دجال نکلے گا اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے دنیا میں تشریف لائیں گے، حضورؐ نے فرمایا ہے کہ: ''شام کے مشہور

شہر دمشق میں دو فرشتوں کے مونڈھوں پر ہاتھ رکھے اتریں گے''، قیامت کے قریب ان کی آمد کا ذکر بہت سی احادیث میں ہے، اس لئے ان کا ماننا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے، دجال کو قتل کریں گے، دنیا سے شریعت محمدی کے علاوہ تمام دینوں کو مٹا دیں گے، ان کے زمانے میں سارے عیسائی مسلمان ہو جائیں گے۔

وہ باحیات ہی ہوں گے کہ ''یاجوج وماجوج'' نامی دو قومیں ظاہر ہوں گی؛ جن کو حضرت ذوالقرنین نے دنیا کے کسی حصے میں قید کر دیا تھا، وہ نکلیں گے اور بہت بڑی تعداد میں ہوں گے، ان کا تھوڑا سا ہی حصہ پورے دریا کا پانی پی جائیگا، ساری دنیا کو تباہ و برباد کریں گے، مسلمان ایک پہاڑ پر پناہ لے کر ان سے محفوظ رہیں گے، آخر ایک آسمانی بلا کا شکار ہو کر مریں گے۔

''ایک جانور نکلے گا'' جو ایک انگوٹھی اور ڈنڈا لئے ہوگا اور ہر مسلمان و کافر کے جسم پر انگوٹھی و ڈنڈے سے نشان لگائے گا۔

قیامت سے ایک سو بیس برس پہلے ''سورج بجائے پورب سے نکلنے کے پچھم سے نکلے گا'' اور پھر اہل ایمان ختم ہو جائیں گے، حتیٰ کہ زمین پر ایک بھی اللہ کا نام لینے والا نہ رہ جائیگا، نہایت شریر و بدکردار لوگ ہوں گے اور اچانک قیامت آجائیگی، جس کے حالات قرآن مجید کی مختلف سورتوں اور احادیث میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

قیامت ایسا اچانک آئے گی کہ کسی کام کرنے والے کو اپنا کام پورا کرنے کا موقع نہ مل سکے گا ــــ ایک مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سارے انسان و جاندار مر جائیں گے اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائیگا، آسمان پھٹ جائیں گے، تارے جھڑ جائیں گے، سورج و چاند بے نور ہو جائیں گے، پہاڑ روئی اور ان کے گالوں کی طرح اڑیں گے، زمین بالکل ہموار و برابر کر دی جائیگی ــــ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائیگا اور ساتھ ہی آسمان سے مانند شبنم ہلکی ہلکی بارش ہوگی تو تمام انسان زندہ ہو ہو کر زمین سے اٹھنے اور قبروں سے نکلنے

لگیں گے، سارے انسان ننگے بدن اور بغیر ختنے کے ہوں گے، سب میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، کوئی پیدل اور کوئی سواری پر، میدان حشر میں شروع شروع سب پریشان ہوں گے کہ نہ جانے کیا ہو، ایک میل کی بقدر اونچائی پر سورج ہوگا، بقدر اعمال سب پسینے میں ہوں گے، بھکاری کا چہرہ گوشت سے خالی، قرآن کا بھلانے والا کوڑھی، بے نمازی فرعون وغیرہ کے ساتھ، قاتل مقتول کے ہاتھ میں، دھوکہ باز وعہد شکن ایک امتیازی جھنڈے کے ساتھ، حاکم وبادشاہ کے ہاتھ وپیر بندھے ہوئے، زکوٰۃ نہ دینے والا مالوں کا سانپ گردن میں ڈالے ہوئے، دورُخا آگ کی زبان کے ساتھ، زمین کا غاصب اس کا طوق پہنے ہوئے، دوسری طرف مؤذن لمبی گردن والے، شہید اپنے زخم کے ساتھ، پابند جماعت ایک خاص نور کے ساتھ، حافظ کے والدین نورانی تاج کے ساتھ، کوئی مشک وزعفران کے ٹیلوں اور نور کے منبروں پر اور کوئی عرش الٰہی کے سایہ میں؛ جسے فرشتوں کی ایک خاص تعداد اٹھائے ہوگی۔

جمع ہونے کے بعد پوچھ گچھ میں دیر ہونے سے لوگوں کی پریشانی بڑھتی ہی جائیگی، حتیٰ کہ لوگ انبیاء کرامؑ سے سفارش کو کہیں گے، بڑے بڑے انبیاء کے پاس جائیں گے اور سب معذرت کردیں گے، آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالٰی کی اجازت سے سفارش فرمائیں گے، یہ سفارش آپؐ کا ہی امتیاز ہے، حضورؐ کی سفارش کے بعد کام شروع ہوگا، ایک تعداد ایسی ہوگی جو بغیر کسی حساب وکتاب کے جنت میں جائیگی، ایک اچھی خاصی تعداد سے ان کے کئے ہوئے برے اعمال بتلائے وجتلائے جائیں گے، مگر ان کو بھی بآسانی جنت میں جانے کو مل جائیگا، اکثر لوگوں سے پوچھ گچھ اور جرح ہوگی، بالخصوص کفار کو جواب وصفائی کا پورا موقع دیا جائیگا، وہ موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اہل ایمان کے انجام کو دیکھ کر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کیلئے جھوٹ بولیں گے، ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جائیں گے، فرشتوں کی تحریر کا انکار کریں گے، مگر ایسے گواہ ہوں گے کہ آخر خود

انہیں اپنی زبان سے اعترافِ جرم کرنا پڑے گا، ان کے ہاتھ، پیر، کان، آنکھ تمام اعضاء گواہی دیں گے کہ ہم سے کیا کیا جرم کیا، زمین کا ایک ایک حصہ گواہی دے گا کہ فلاں دن و فلاں وقت مجھ پر ایسا ایسا کام کیا، کافر سارے کے سارے جہنم میں جائیں گے اور مومن جنت میں، سب اپنے ٹھکانے میں ہمیشہ کے لئے جائیں گے، البتہ جو مومن گنہگار ہوں گے اور ان کی معافی کی کوئی صورت نہ نکلی ہوگی، نہ خود انہوں نے توبہ کی، نہ اللہ نے معاف کیا، نہ بندوں نے معاف کیا تو وہ بھی کچھ مدت کے لئے جہنم میں جائیں گے تاکہ گناہوں سے پاک ہولیں، اعمال کی جانچ کے ذریعہ فیصلہ ہوجانے کے بعد جس میں پوچھ گچھ بھی ہوگی اور اعمال اور نامۂ اعمال کی تول بھی، پھر سفارش بھی سنی جائیگی، مگر اللہ کے حکم سے محض اس کے مقرب بندوں کی اور صرف مومنوں کے حق میں، کافروں کے حق میں نہیں، کسی کا مرتبہ بڑھے گا، کسی کی سزا ختم کی جائیگی، کوئی مومن جہنم میں رہ نہ جائیگا، حافظ، عالم، شہید، انبیاء سب اپنے اپنے درجے کے مطابق سفارش کریں گے، جس کا ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی ظاہر ہوگا، نکال لئے جائیں گے، پھر کچھ ایسے لوگ نکالے جائیں گے جن کے ایمان کا اللہ کے علاوہ کسی کو پتہ نہ ہوگا۔

میدانِ حشر میں فیصلہ سنانے کے بعد جب لوگ روانہ ہوں گے سامنے ایک پل آئے گا، کافر تو اس کے نیچے ہی رہ جائیں گے کہ نیچے ہی جہنم ہوگی، سیدھے وہاں پہنچادیئے جائیں گے اور مومن پل کے اوپر سے گذریں گے، ہر ایک اپنے اپنے عمل کے مطابق کوئی سواری پر، کوئی پیدل، کوئی نہایت تیز اور کوئی گرتا پڑتا، اس میں بھی بدعمل جن کی معافی نہ ہوگی وہ جہنم میں گرجائیں گے اور بعد میں سفارش اور اللہ کے فضل کی بدولت نکالے جائیں گے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

پانچ چیزوں کا سوال ہر ایک سے ہوگا، عمر کہاں گنوائی، جوانی کس چیز میں لگائی، علم پر کیا اور کتنا عمل کیا، مال کہاں سے حاصل کیا اور پھر کن کن جگہوں میں خرچ کیا؟

جنت

''جنت'' کے معنی ہیں باغ، چونکہ عالم آخرت میں اللہ نے اپنے نیک بندوں کے لیے جو جگہ تجویز فرمائی ہے، اس میں بکثرت باغات ہوں گے، اس لئے اس کو ''جنت'' کا نام دیا گیا اور ''جہنم'' دہکتی ہوئی آگ، یہ دونوں چیزیں پیدا کی جا چکی ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد جنت میں رکھا گیا تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو معراج کے موقع پر یہ چیزیں دکھائی گئی تھیں اور مرنے والے کو عالم برزخ میں ہی ان کا انظارہ کرایا جاتا ہے ــــ جنت میں کیا کیا ہوگا؟ قرآن مجید وحدیث میں بہت کچھ بیان کیا گیا ہے اور اس کی نعمتوں کے اعتبار سے وہ بھی کم ہے، اسی لئے قرآن مجید میں ایک موقع پر آیا ہے: ''کوئی نہیں جانتا کہ اس کیلئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پوشیدہ کر کے رکھا گیا ہے'' اور حدیث میں حضور نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے: ''وہاں وہ نعمتیں ہیں کہ جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی دل میں ان کا خیال آیا'' ــــ راحت وآرائش، لطف ولذت کی اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں جو ہمیں سمجھانے کیلئے دنیا کی چیزوں کے نام سے بیان کی گئی ہیں، جنت میں ہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر۔

جنت کی لمبائی چوڑائی کی کوئی حد نہیں، ایک معمولی آدمی کو بھی اس دنیا کا دس گنا حصہ دیا جائیگا، جنت کے آٹھ دروازے ہیں، اندر باغات کا تو شمار ہی نہیں، نہایت گھنے ولبے، سو سال کی مسافت کا رقبہ رکھنے والے درخت؛ جن کے تنے سونے کے ہوں گے، چار بڑی بڑی نہریں ہوں گی اور نہر کیا بلکہ دریا وسمند؛ جن کی شاخیں پوری جنت میں بکھری ہوں گی اور ہر جنتی سونے کی چھڑیوں سے اشارہ کر کے جہاں جس طرف چاہے گا ان کو لے جائے گا یہ نہریں پانی، دودھ، شہد اور شراب کی ہوں گی، عمارتوں میں ایک اینٹ سونے اور ایک

چاندی کی ہوگی، مسالہ نہایت خوشبودار مشک کا، زمین کی مٹی مشک وزعفران کی ہوگی اور کنکریاں وسنگ ریزے موتی ویاقوت؛ جس وقت جو چاہو کھانے کو میسر، لیٹے بیٹھے، کھڑے کسی طرح ہاتھ اٹھاؤ اور پھل ہاتھ میں، خواہش کرو اور مل گیا اور ایک پھل ٹوٹا، دوسرا اس کی جگہ لگ گیا اور پھر نہ پیشاب اور نہ پاخانہ، نہ ہی دوسری گندگیاں، کھانا پینے وڈکار سے ہضم ہوگا، غلام وخدام خوبصورت لڑکوں کی صورت میں اور بیویاں عورتوں وحوروں کی صورت میں بے شمار، ہر ایک کا قد ساٹھ ہاتھ اور ہمیشہ جوان، تیس سال کی عمر میں، نہ داڑھی مونچھ، نہ کپڑا اگندہ ہوگا، نہ پرانا اور لطف یہ کہ وہاں ہمیشہ رہنا ہوگا، فرشتے وہاں پہنچنے پر سلام ومبارکباد پیش کریں گے۔

تمام جنتی دو بڑے گروہوں میں ہوں گے، ایک ''مقربین'' دوسرے ''اصحاب الیمین'' مقربین افضل ہوں گے، پھر ان میں بھی مراتب ودرجات کا فرق ہوگا، حدیث میں جنت کے سو درجے مذکور ہیں اور ویسے جنت کے سات طبقات منقول ہیں؛ جن میں سب سے اعلیٰ ''فردوس'' ہے، اولین ناشتہ زمین کی روٹی اور مچھلی وبیل کی کلیجی کا ہوگا۔

وہاں نہ کوئی لڑائی جھگڑا ہوگا اور نہ اختلاف، ہر ایک اچھے حال میں اور دوسرے کے اچھے حال کو دیکھ کر جہاں کمی کا احساس یا اس حال کی خواہش ہوئی فوراً وہ حالت اسے بھی حاصل ہو جائیگی، پھل ہر قسم کے، نہایت لذیذ وکیف آور، پرندے بھی ملیں گے جو جنت میں اڑتے پھریں گے اور ان کے گوشت کی خواہش ہونے پر بھنے بھنائے سامنے آکر گر جائیں گے، سونے وچاندی کے برتن ہوں گے، نہ جانے کن کن چیزوں کے زیورات ہوں گے، ہر قسم کی سواریاں ہوں گی، نہایت قیمتی اور ریشمی ومخمل کے بستر وگدے اور قالین ہوں گے، جمعہ جمعہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار ہر ایک کو ہوگا اور خواص کو روزانہ صبح وشام کو ہوگا، ہر جمعہ کو بازار میں جانا ہوگا؛ جس میں فرشتے ہوں گے، پسند کی چیز آدمی بلا تکلف لے گا، وہاں ایک مخصوص ہوا ہوگی؛ جس سے انسان کے حسن وجمال میں اضافہ ہوگا، موسم نہایت معتدل

روشنی نہایت دلفریب، ہمہ وقت ایسا ہوگا جیسے کہ صبح کو سورج نکلنے سے ذرا پہلے کا سہانا وقت، انسان جس چیز کی خواہش کرے گا فوراً ملے گی، اولاد چاہے گا تو وہ، کھیتی کرنا چاہے گا تو وہ اور سب کچھ آناً فاناً پلک جھپکتے میں کہ زمین دیکھتے دیکھتے جتے گی، پودا اُگے گا اور تیار ہو کر کھڑا ہو جائیگا۔

خلاصہ یہ کہ وہ ایسی آرام کی جگہ ہوگی کہ ایک انسان جس نے دنیا میں ساری زندگی مشقتوں اور تکلیفوں میں گذاری ہوگی اسے صرف ایک مرتبہ جنت میں غوطہ سا دیکر نکال لیا جائے گا اور دنیا کی سالہا سال کی تکلیفیں بھول جائیگا۔

جہنم

اللہ کے غیظ و غضب اور اس کی ناگواری کے اظہار کا ذریعہ وجگہ، جوان لوگوں کیلئے ہمیشہ کی قیام گاہ بنائی گئی ہے؛ جنہوں نے دنیا میں اپنی عمر اللہ کی نافرمانی ہی نہیں بلکہ مخالفت میں گذاری اور نہ صرف یہ کہ اس کی خدائی کو تسلیم نہیں کیا بلکہ خدائی میں دوسروں کو شریک بنایا، جس طرح جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں ہوں گی جو تصور میں نہیں آسکتیں، ایسے ہی جہنم میں سزاؤں و عذاب کی سختی کا بھی صحیح اندازہ یہاں مشکل ہے، جہنم محض آگ ہی آگ ہے؛ جو ہزارہا سال سے روشن ہے اور دن بدن اس کی تیزی بڑھتی ہی جاتی ہے، آگ جلتے جلتے اب سیاہ و تاریک ہو چکی ہے، ایندھن بھی دنیا کی طرح لکڑیاں نہ ہوں گی، بلکہ انسان، پتھر گندھک اور بت وغیرہ، حدیث میں مذکور ہے: ''دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ اثر رکھتی ہے''، دنیا کی آگ ایک گھڑی و منٹ کو برداشت نہیں ہوتی تو اس آگ کو کیا برداشت کیا جا سکے گا، نہایت گہری کہ اوپر سے کوئی چیز پھینکی جائے تو مسلسل ستر سال تک گرنے کے باوجود تہہ تک نہ پہنچے گی، نہایت لمبی و چوڑی، انتہائی موٹی موٹی دیواریں، جس میں سات دروازے اور سات منزلیں ہوں گے، ہر ایک کو خوب پھیلا کر جگہ دی جائیگی اور تکلیف بڑھانے کیلئے ہر ایک کے جسم کو تصور سے باہر حد تک لمبا و چوڑا کر دیا جائے گا، تاکہ تکلیف کا زیادہ احساس ہو، جہنم بڑی ناراضگی اور غیظ و غضب میں ہوگی، دور ہی سے جہنم میں جانے والوں کو دیکھ کر اس سے آوازیں نکلیں گی، اونٹوں کے برابر سانپ اور ڈسنے کی سوزش دسیوں سال تک ہوگی، بڑے بڑے خچروں کی مانند بچھو، نہ کھانا ملے گا، نہ پانی، بلکہ کھانے کو آگ کے کانٹے اور زقوم جیسے پھل ہوں گے اور پینے کو یا تو زخموں کا دھون، خون و پیپ، یا تیل کی تلچھٹ کی مانند کھولتا ہوا پانی، جو سب کچھ جلا کر پیٹ کے راستے سے باہر کر دے گا،

سر پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائیگا اور لوہے کے گرز مارے جائیں گے، آگ کی زنجیر وطوق پہنائے جائیں گے، گندھک کے کپڑے ہوں گے جو مزید جلن وتپش پیدا کردیں گے، بلکہ خود جلیں گے۔

ان تمام تکالیف کے باوجود نہ تو موت ہوگی اور نہ صبر آسکے گا، اس لئے کہ تکلیف بڑھتی ہی رہے گی، ان ظاہری تکلیفوں کے علاوہ فرشتوں کے تکلیف دہ جملے، نیز اہل ایمان کی باتیں الگ ہوں گی، بڑی تعداد میں انسان جہنم میں جائیں گے، سب کے چہرے سیاہ، جسم کا ایک ایک حصہ نہایت بڑا حتیٰ کہ اکثر اعضاء کھال وزبان وغیرہ میلوں لمبی کردی جائیں گی۔

سب سے ہلکا عذاب یہ ہوگا کہ "آگ کی جوتیاں پہنادی جائیں گی، مگر ان کا اتنا اثر ہوگا کہ ان کی وجہ سے انسان کا دماغ کھولے گا"۔

خلاصہ یہ کہ وہ ایسی تکلیف کی جگہ ہوگی کہ ایک آدمی جس نے دنیا میں ساری زندگی بڑی راحت اور عیش وآرام میں گذاری ہوگی، اسے جہنم میں ایک غوطہ دے کر نکال لیا جائیگا اور وہ اس سالہا سال کی راحت وآرام کو بھلا بیٹھے گا اور کہے گا کہ: "میں نے تو کبھی آرام دیکھا ہی نہیں"۔

اسلام کے بنیادی ارکان

گزشتہ صفحات میں آپ نے اسلام کے بنیادی عقائد سے متعلق کافی معلومات حاصل کرلی ہیں، اس مضمون میں اسلام کے بنیادی ارکان یعنی اعمال بیان کئے جاتے ہیں۔

ارکان لفظ "رکن" کی جمع ہے، شریعت میں اس سے وہ اعمال مراد لئے جاتے ہیں؛ جن کا اختیار کرنا اسلام وایمان کے اظہار کیلئے ضروری ہے اور جیسے گذشتہ صفحات میں ذکر کردہ عقائد کو دل میں بٹھائے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا اسی طرح ان چیزوں کو اختیار کئے بغیر مسلمان نہیں کہا جاسکتا، یہ کل پانچ چیزیں ہیں: (۱) کلمۂ شہادت (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ (۵) حج۔

ایک حدیث میں ان کی اہمیت کو یوں سمجھایا گیا ہے کہ ان کو یوں سمجھو جیسے کہ کوئی خیمہ یا شامیانہ ہو تو اس کے کھڑے ہونے کیلئے پانچ لکڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک تو بیچ کی جو اصل ہوتی ہے؛ جس کے بغیر خیمہ اٹھ ہی نہیں سکتا اور باقی چار چار کونوں پر، شہادت کی حیثیت بیچ کی لکڑی کی اور باقی چار کناروں کی چاروں لکڑیوں کی مانند ہیں، بیچ کی لکڑی نہ ہو تو خیمہ کھڑا ہی نہیں ہوگا اور اگر وہ ہو لیکن کنارے کی لکڑی نہ ہو تو جو کنارہ خالی ہوگا جھکا رہے گا۔

اسی طرح ان کا معاملہ ہے، اگر شہادت کا وجود نہ ہو تو انسان مومن ہی نہیں قرار پائے گا اور اگر وہ ہے، لیکن باقی چاروں میں سے کسی ایک کو اعتقاد فرضیت کے باوجود نہیں کرتا تو اس کے مطابق اس کا ایمان کمزور قرار پائیگا۔

شہادت:

یعنی زبان سے اللہ کے تن تنہا، مستحق عبادت ہونے کا اقرار، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی نبوت ورسالت کا اعتراف۔

نماز:

اسلام کا اولین فریضہ اور اصل الاصول عمل جو ہر مسلمان کے ذمہ لازم ہے؛ جو بوقت بلوغ مسلمان ہو یا اسلام لانے کے وقت بالغ ہو، یہ کسی شخص سے کسی حال میں ساقط نہیں، وضو کی قدرت نہ ہو تو تیمم سے پڑھے، کھڑے ہو کر پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر، ورنہ لیٹ کر، رکوع وسجدہ نہ کرسکے تو اشارہ سے کام لے کر، فی الحال کسی طرح ممکن نہ ہو تو بعد میں قضاء کے طور پر، بہر حال بلوغ کی اولین گھڑی سے لے کے زندگی کے آخری لمحہ تک ہر ایک پر فرض ہے، ہر اس مسلمان پر جو عاقل وبالغ ہو خواہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، بیمار ہو یا صحت مند، مسافر ہو یا مقیم، بس عورت سے مخصوص ایام میں معاف ہے، قرآن و حدیث میں نماز کا اہتمام کرنے کی بڑی تاکید اور تعریف آئی ہے، اس پر بڑے انعامات مذکور ہیں اور کوتاہی کی بڑی مذمت اور سخت سزاؤں کا تذکرہ ہے اور اسی کو ایمان کا امتیازی نشان فرمایا گیا ہے کہ عام حالات میں نماز ہی کے ذریعہ انسان کا مسلمان ہونا جانا جاتا ہے۔

نماز کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج میں ہوئی یعنی ہجرت سے پہلے مکہ میں، دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں اور الگ الگ پانچ اوقات میں، اول: فجر؛ طلوع صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک؛ دو رکعت، دوم: ظہر؛ دوپہر کے بعد سے سورج ڈوبنے سے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تک؛ چار رکعت، سوم: عصر؛ سورج ڈوبنے سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے سے لے کر سورج ڈوبنے تک؛ چار رکعت، چہارم: مغرب؛ سورج ڈوبنے سے لے کر تقریباً سوا گھنٹے تک؛ تین رکعت، پنجم: عشاء؛ سورج ڈوبنے کے تقریباً سوا گھنٹے بعد سے لے کر طلوع صبح صادق تک؛ چار رکعت، اسی وقت میں ان چاروں رکعتوں کے علاوہ تین رکعتیں وتر کی واجب ہیں، دو نمازیں دو دو رکعت سال بھر میں مزید واجب ہیں؛ یعنی عید الفطر وعید الاضحیٰ کی، باقی تمام نمازیں سنت اور نفل ہیں۔

روزہ:

اسلام کا دوسرا فریضہ، یہ بھی ہر بالغ مسلمان پر فرض ہے، جس کا مطلب ہے: ''طلوع صبح صادق سے لے کر سورج ڈوبنے تک کسی قسم کی چیز کھانے پینے اور پیٹ میں پہنچانے نیز صحبت سے بچنا، سال میں ایک مہینے یعنی پورے رمضان کا روزہ فرض ہے، جو کبھی ۲۹ دن اور کبھی تیس دن کا ہوتا ہے، یہ بھی کسی سے معاف نہیں، ادا ممکن نہ ہو تو قضاء کرے، عورت بھی ایام ماہواری وزچگی کی قضاء کرے گی، جب بھی معتبر ذرائع سے معلوم ہو جائے کہ رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا، روزہ شروع ہو جائیگا، مدینہ میں ۲ سنہ ھ فرضیت ہوئی۔

زکوٰۃ:

یعنی جس شخص کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی (چھ سو گرام سے کچھ زائد) یا ساڑھے سات تولہ سونا (ساڑھے ستاسی گرام) یا ان میں سے کسی ایک مالیت کا ضرورت سے زائد نقد روپیہ یا سامان تجارت ہو اور سال گذر جائے تو چالیسواں حصہ نکالنا؛ جو ڈھائی فیصد ہوتا ہے ضروری ہوتا ہے، زکوٰۃ جانوروں کی خاص مقدار پر بھی ہے اور زمین اور اس کی پیداوار پر بھی، اس کی فرضیت بھی مدینہ میں ۲ سنہ ھ میں ہوئی اور ہر عاقل وبالغ مسلمان پر فرض ہے، اسی کے ضمن میں فطرہ وقربانی بھی ہے کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہے اس پر یہ دونوں واجب ہیں، البتہ کچھ فرق بھی ہے، تفصیلات علماء سے پوچھیں۔

حج:

زندگی میں ایک مرتبہ مکہ مکرمہ کا سال کے مخصوص دنوں میں سفر اور وہاں قیام اور وہاں مختلف مقامات پر مختلف انداز کے اعمال کا انجام دینا، اس کی فرضیت ۳ سنہ ھ میں ہوئی اور ہر اس بالغ وعاقل مسلمان پر فرض ہے جس کے پاس پورے سفر کا اپنا نیز گھر رہ جانے والے اہل وعیال کا خرچہ ہو، حج کے اصل اعمال کا سلسلہ ۸ ذی الحجہ سے شروع ہو کر بارہ کو ختم ہو جاتا ہے، اس سے متعلق ضروری امور یہ ہیں: احرام باندھنا (دو چادروں کا خاص انداز سے

پہننا)، تلبیہ پڑھنا (لَبَّیْكَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کہنا)، مزدلفہ میں اور عرفات میں کھڑا ہونا، رمی کرنا (مخصوص مقامات پر سات کی تعداد میں کنکریاں پھینکنا)، بال کٹانا (رمی سے فارغ ہو کر سر کے بال کو منڈانا یا کترانا؛ اس سے پہلے بدن کے کسی حصہ کے بال یا ناخن کا کاٹنا، توڑنا، سب منع ہے)، قربانی کرنا، بیت اللہ کا طواف کرنا، سعی کرنا (صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا)، مکہ مکرمہ میں حج کے علاوہ ایک عمل ''عمرہ'' کا بھی انجام دیا جاتا ہے؛ جو فرض و واجب نہیں اور حج کے دنوں کے علاوہ سال میں کسی دن کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام کا مقصد دراصل اللہ کے سامنے بندے کا اپنے آپ کو پورے طور پر جھکا دینا ہے، اس کے حکم و طلب پر اپنے تمام مشاغل، راحت و آرام و کاروبار کو چھوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہونا اور اٹھنا و بیٹھنا۔۔۔ سب کچھ ہوتے ہوئے کھانے پینے کو چھوڑ دینا، اپنی محنت کی کمائی دوسروں کے سپرد کر دینا اور انتہا یہ کہ گھر، اہل و عیال اور وطن کیا بلکہ ملک سے دور دراز مقام کا سفر کر کے دیوانہ وار ادھر اُدھر پھرنا اور اللہ کی بڑائی و عظمت کا پکار پکار کر اعلان کرنا اور اس سے عشق و محبت کا اظہار کرنا۔

علم کی شرعی اہمیت وحیثیت

اسلام نے علم کی بڑی اہمیت اور اہل علم کی بڑی حیثیت اور قدر و منزلت بیان کی ہے، اس لئے کہ انسان احکام خداوندی کے مطابق زندگی گذارنے کا پابند ہے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اسے احکام کا علم ہو، چنانچہ کلام پاک اور احادیث دونوں میں علم و اہل علم کا تذکرہ گرانقدر الفاظ میں آیا ہے، سورہ آل عمران کے دوسرے رکوع میں اللہ تبارک و تعالی کے تن تنہا معبود ہونے کی شہادت و گواہی دینے والوں میں اللہ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اہل علم کو بھی ذکر کیا گیا ہے:

شَهِدَ اللهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلَائِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ ....

گواہی دی ہے اللہ تعالی نے اس چیز کی کہ بجز اس پاک ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی۔

سورۂ زمر کے دوسرے رکوع میں ہے:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

کیا علم والے اور جہل والے برابر ہوتے ہیں؟

سورۂ فاطر میں ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ....

اس سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

اور احادیث تو بے شمار ہیں، چند ذکر کی جارہی ہیں:

۱. اگر کوئی شخص علم کی طلب میں کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالی اس کی وجہ سے اس کیلئے جنت کا راستہ سہل کر دیتے ہیں۔

۲. عالم کی فضیلت محض عبادت گذاری میں رہنے والے پر ایسی ہے جیسے کہ تم میں سے کسی کے مقابلہ میں میری فضیلت۔

۳. اللہ کے فرشتے اور تمام آسمان وزمین والے حتیٰ کہ چیونٹیاں سوراخوں میں اور مچھلیاں بھی لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والے کیلئے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

۴. ایک عالم دین شیطان پر ایک ہزار عبادت گذاروں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

۵. علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۶. جو علم کی طلب میں نکلے وہ لوٹنے تک اللہ کے راستے میں ہوتا ہے۔

۷. جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کیلئے علم حاصل کر رہا ہو تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔

۸. رات کی ایک گھڑی علم کا درس وتدریس رات بھر جاگنے سے بہتر ہے۔

۹. دو حریص آسودہ نہیں ہوتے؛ علم کا حریص علم سے اور دنیا کا حریص دنیا سے۔

۱۰. فرائض اور قرآن کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو سکھاؤ اس لئے کہ میر (بھی) موت آنے والی ہے۔
(مشکوٰۃ)

روایات میں صرف علم حاصل کرنے کی فضیلت کا ہی ذکر نہیں بلکہ دوسروں کو سکھانے وبتانے کی بھی فضیلت وتاکید ہے۔

۱. تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن خود سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

۲. مجھ سے سیکھو اور دوسروں تک پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت (اور ایک ہی بات) ہو۔

۳. جو اس وقت موجود ہیں (اور میری بات سن رہے ہوں) وہ جو لوگ غائب ہیں ان تک پہنچادیں۔

۴. ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا: ''کیا بات ہے آخر لوگ اپنے پڑوسیوں کو سمجھاتے اور سکھاتے کیوں نہیں اور ان کو نصیحت اور بھلائی کا حکم اور برائی سے منع کیوں نہیں

کرتے اور آخر لوگ خود اپنے پڑوسیوں سے فقہ اور علم کیوں نہیں حاصل کرتے لوگ سمجھانے وسکھانے اور وعظ ونصیحت کا کام ضرور کریں اور دوسرے لوگ ضرور سیکھیں وسمجھیں، ورنہ میں ان کو جلد ہی سزا دوں گا''۔

۵. عالم وطالب علم ہی بھلائی میں شریک ہیں، باقی تمام لوگوں میں کوئی بھلائی نہیں۔

۶. عالم اور طالب علم کے علاوہ ساری دنیا اور جو کچھ بھی اس میں ہے اللہ کی رحمت سے دور ہے۔

۷. عالم بنو، یا طالب علم، یا دین کی بات سننے والے، یا دین والوں سے محبت کرنے والے پانچویں کچھ نہ بنو۔

یوں تو علم خواہ کسی چیز کا ہو انسان کے لئے عزت وشرف کا باعث ہوتا ہے، لیکن قرآن وحدیث میں ذکر کردہ فضائل ''علم دین'' کیلئے ہیں، یعنی ان علوم کیلئے جن سے دین کی معلومات ہوں اور وہ علوم، جو علوم دینیہ سے استفادہ میں معاون ومددگار ہوں وہ بھی اس کے حکم میں ہیں، ایسے ہی جو علوم نہ تو دینی ہیں اور نہ دینی علوم کے مددگار، مگر ان کے ذریعہ کسی طرح بھی دین کی خدمت ہوسکتی ہے، وہ بھی انسان کیلئے آخرت میں بہتری کا باعث بنیں گے۔

البتہ شرط یہ ہے کہ علم حاصل کرنا اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا اور خدمت دین کیلئے ہو، محض دنیا کمانے کیلئے نہ ہو، جیسا کہ دنیوی علوم میں عام طور سے ہوتا ہے۔

قرآن وحدیث میں ذکر کردہ بے شمار فضائل، تاکیدیں نیز دین پر صحیح طریقے سے چلنے کیلئے علم کی ضرورت کے پیش نظر علماء نے ذکر کیا ہے کہ: ''ہر مسلمان خواہ مرد ہو یا عورت اس کیلئے اپنی زندگی کی ضروریات ومعمولات کی حد تک دین کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے اور ہر ایک کے ذمہ لازم ہے'' مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ فرائض، حلال وحرام کھانا پینا اور حلال وحرام کا کاروبار یعنی جو مشغلہ معاش کا اختیار کرے اس کے مسائل۔

اور اپنی ضرورت سے زائد جس سے دوسروں کو نفع پہنچایا جا سکے اور ان کی رہنمائی کی جا سکے، اس لئے ایسے افراد کا ہونا بھی ضروری ہے، جو دین کا وسیع علم رکھتے ہوں، تا کہ ضرورت مندوں کی پوری اور صحیح رہنمائی کر سکیں اور لوگوں کو حرام میں پڑنے سے بچائیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو نہ جاننے والوں کی دنیا وآخرت دونوں برباد ہوں گی۔

مسلمانوں کی علوم وفنون پر توجہ

علم کی شرعی اہمیت، حیثیت اور ضرورت بیان کی جا چکی ہے، اسی کے پیش نظر پوری مسلم قوم نے علم کی نشر واشاعت میں جو دلچسپی لی اس کا مظاہرہ کسی زمانے میں دنیا کی کسی قوم نے نہیں کیا، جس سرزمین پر مسلمانوں کے قدم پہنچے وہ دولت اسلام سے محروم نہ رہی بلکہ نور ایمان سے منور ہوئی اور کفر کی تاریکی سے دور ہوئی، اسی طرح وہ سرزمین علم کی روشنی سے بھی خالی نہیں رہی بلکہ وہاں سے جہل کا اندھیرا دور ہوا اور علم کا اجالا پھیلا۔

مسلمان مکہ ومدینہ سے نکل کر جہاں کہیں گئے اور جہاں بسے ہیں وہیں مکتب ومدرسہ قائم ہو گیا اور پڑھنے وپڑھانے کا سلسلہ چل پڑا، آپ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے دائرۂ حکومت نیز ان کی آبادیوں پر مشتمل ممالک کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے، آپ کو مسلمان کسی علاقے اور کسی دور میں اس اہم فریضے اور اس قیمتی دولت وسرمائے سے لاپروائی برتتے ہوئے نظر نہیں آئیں گے۔

آغاز اسلام میں مکہ مرکز علم تھا، ہجرت کے بعد مدینہ کو یہ شرف حاصل ہوا، حدود سلطنت وسیع ہوئے، صحابہ کے قدم دور دور تک پہنچے تو بصرہ وکوفہ اور دمشق وشام کو یہ عزت ملی، پھر بغداد، قاہرہ واسکندریہ کی قسمت جاگی، چند ہی صدیاں گذری تھیں کہ اندلس اسلامی یونیورسٹیوں کا مرکز بنا، دوسری طرف خراسان، بخاریٰ اور نیشاپور میں علمی مجلسیں گرم ہوئیں، ہندوستان بھی پہلی صدی میں اسلام کے زیر سایہ آنے کا شرف حاصل کر چکا تھا، کیوں پیچھے رہتا، دہلی، جون پور، احمد آباد، ٹھٹھ اور بعض دوسرے شہروں میں اطراف عالم کے علماء وفضلاء نے جمع ہو کر ہندوستان کی قسمت کو چار چاند لگائے، تحصیل علم کیلئے ہزارہا میلوں اور دسیوں ممالک وسیکڑوں شہروں کا سفر کیا گیا، چنانچہ ہر چہار طرف مایہ ناز علماء پیدا

ہوئے اور گراں قدر کتابیں تصنیف کی گئیں، آج اگر محققین علماء اسلام اور مسلمانوں کی تصنیفات کی فہرست تیار کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس فہرست میں دنیا کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک دسیوں ممالک کے علماء وفضلاء کے نام شامل ہیں اور ہر وہ خطہ جہاں مسلمان پہنچے اور رہے، اس خطہ کا کوئی نہ کوئی مایہ ناز عالم یا گراں قدر تصنیف ضرور اس فہرست میں درج ہوگی۔

علم کی نشر واشاعت سے مسلمانوں کی اس عام دلچسپی کا تذکرہ بہت سے مسلم وغیر مسلم محققین نے کیا ہے، ایک فرنچ مفکر ''گستاؤلی بون'' لکھتا ہے:

> ''تعلیم کے سلسلہ میں عربوں نے جس چستی کا مظاہرہ کیا ہے وہ نہایت ہی حیرتناک ہے اور اس فضیلت میں دوسری بہت سی قومیں ان کے برابر تو ہوسکتی ہیں مگر ان پر سبقت نہیں رکھتیں، یہ جب کسی شہر پر غلبہ پاتے تو اولین توجہ جامع مسجد اور مدرسہ کی تعمیر کی طرف ہوتی''۔

یہی مفکر ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

> ''عربوں کا علمی شغف اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ خلفاء بغداد اطراف عالم کے علماء اور مشاہیر فن کو جمع کرنے کیلئے ہر قسم کے وسائل اختیار کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک خلیفہ نے قیصر شاہ روم سے جنگ کا اعلان محض اس وجہ سے کر دیا تھا کہ اس نے ایک مشہور ریاضی داں کو بغداد جانے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ اس شہر میں دنیا بھر کے اہل فن، علماء وادباء؛ ہر دین ومذہب اور ملک وعلاقے کے جمع ہوگئے اور بغداد پورے عالم کا حقیقی علمی مرکز قرار پایا''۔

مسلمانوں کی اس طرف توجہ اور اس میں کامیابی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ رومیوں کا سات صدیوں تک مصر پر تسلط رہا اور صرف ایک مدرسہ قائم کر سکے اور وہ بھی انہیں بند کرنا

پڑا اور مسلمانوں کی حکومت کو بمشکل پانچ صدیاں گذری تھیں کہ اس کے ایک شہر اسکندریہ میں ہی بیس مدرسے تھے اور ایسا نہیں کہ مسلمانوں کے قائم کردہ علمی مراکز، محض دینی وعربی علوم سے متعلق ہوں بلکہ انہوں نے لیبارٹریز، رصدگاہیں اور بڑے بڑے کتب خانے بھی بہت سے شہروں میں قائم کر رکھے تھے، حتیٰ کہ اندلس کے خلیفہ ''حکم ثانی'' کے کتب خانہ میں چھ لاکھ کتابیں تھیں؛ جن کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی اور اسلامی اندلس ساری دنیا کے اہل علم بالخصوص اہل یورپ کا علمی مرکز تھا اور نہ سہی تو موجودہ ہندوستان ودیگر ممالک سے اندازہ لگا لیجئے کہ حکومتوں کے کسی قسم کے تعاون کے بغیر کتنی بڑی تعداد میں مدارس و علمی ادارے قائم ہیں اور ایسے کہ دینی وعربی علوم میں ساری دنیا حتیٰ کہ عرب بھی ان کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہیں۔

ان کا یہ علمی شغف صرف عوام کی حد تک نہیں تھا، بلکہ سلاطین وامراء بھی برابر کے شریک تھے، ان میں بڑے بڑے فاضل، اصحاب تصانیف حتیٰ کہ اصحاب درس بھی ہوئے اور ان کے اس شغف کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اسلام کے ابتدائی عہد کے علوم وفنون پر بہت سی بیش بہا کتابوں کا اضافہ کیا، بلکہ علم وفن کے شائقین کے لئے دسیوں علوم وفنون کی داغ بیل ڈالی اور کتاب وسنت اور علوم عرب سے بہت سے علوم کو نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور سابقہ علوم وفنون کو ترقی دے کر بام عروج تک پہنچایا، آج دنیا کی کوئی لائبریری، کوئی علمی تحریر وگفتگو اور مجلس ان کی پیش کردہ کتابوں وتحقیقات سے بے نیاز نہیں۔

ان کا یہ شغف اصل میں تو علوم دینیہ سے متعلق تھا، لیکن چوں کہ ان کے اصل ماخذ عربی میں تھے، نیز اسلام کے اولین ماننے والے یا عرب تھے یا عربوں کے زیر اثر، اس لئے علوم عربیت بھی ان کا مرکز توجہ رہے اور علوم عربیت میں بھی غیر عرب نے بعض ایسی کتابیں لکھیں جو اپنے موضوع اور تحقیقات میں آج تک منفرد ولاجواب ہیں۔

علوم انبیاء

انبیاء کرام علیہم السلام کو چونکہ بہت بڑی ذمہ داری سونپی جاتی ہے کہ مخلوق خدا کو تمام دنیا سے کاٹ کر اللہ سے جوڑتے ہیں، اس لئے ان کے ساتھ اللہ کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ درجہ کے اخلاق وکمالات سے نوازتے ہیں، شکل وصورت میں بھی وہ اپنے وقت کے تمام انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں اور سیرت وکردار میں تو ہوتے ہی ہیں۔

علم چونکہ سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، اس لئے انبیاء کرام اپنے دور میں علم کا مخزن اور علوم کا سمندر ہوتے ہیں اور چونکہ انبیاء کرام کی نبوت وبعثت کا مقصد خلق خدا کی ہدایت ہوتی ہے، اس لئے ان کے علوم اسی سے متعلق ہوتے ہیں، اس سلسلہ کا کوئی پیچیدہ مسئلہ اور کوئی مشکل ایسی نہیں ہوتی جسے وہ حل کر کے ہر قسم کے شبہات ومشکلات کو دور نہ کر دیتے ہوں، دین کی بابت وہ کسی بڑے سے بڑے اہل عقل اور اس کی معلومات واستدلال کے سامنے زیر نہیں ہوتے، بلکہ دنیا جہان کے عقلاء پر بھاری رہتے ہیں، اس لئے کہ یہ علوم وہبی یعنی خداوند قدوس کی خصوصی عطا ہوتے ہیں۔

رہ گئے دوسرے معاملات وامور جن کا ہدایت وگمراہی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ وہ شعروشاعری، سائنس وجغرافیہ اور معاش وکائنات کے طبعی نظام وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں، ان کی بابت ان حضرات کی معلومات وآراء کا قطعی ہونا یا مفید ہونا ضروری نہیں، بسا اوقات ان کی رائے کے خلاف جو صورت ہوتی ہے وہ تجربہ سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے، اسی سلسلہ میں ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا: ''اپنے دنیوی معاملات کو تم ہی زیادہ جانتے وسمجھتے ہو'' اور ان کے حق میں یہ کوئی نقص کی بات نہیں اور نہ ہی ان علوم میں بڑے سے بڑا درجۂ کمال حاصل کرنے والا حضرات انبیاء کے برابر ہوسکتا ہے، دنیا کا قاعدہ ہے کہ

انسان نے جس کام کو اپنا مقصود بنایا ہے، اس میں ماہر وفائق ہونا اس کا کمال سمجھا جاتا ہے، مثلاً ڈاکٹر کیلئے ڈاکٹری اور انجینیر کیلئے انجنیری میں، بلکہ علوم دنیا یعنی وہ علوم جن کا انسانوں کی ہدایت وگمراہی سے کوئی تعلق نہیں وہ کمالات نبوت کے منافی ہیں، یہی نہیں بلکہ بہت سے علوم تو ایسے ہیں کہ ان سے شانِ نبوت مجروح ہوتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں حضورؐ کے حق میں شعروشاعری کی بابت دو باتیں فرمائی گئی ہیں: ''مَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْبَغِي لَهٗ'' پہلی بات تو یہ کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعری کا علم نہیں دیا اور دوسری یہ کہ یہ علم ان کے شایانِ شان بھی نہیں۔

یہ آیت پاک اصل دلیل ہے کہ بہت سے علوم ان کو نہیں حاصل ہوتے، وہ ان سے پاک ودور رکھے جاتے ہیں، البتہ ان علوم کی وجہ سے اگر کوئی ایسا اشکال سامنے آئے جو گمراہی کا باعث بنے تو اسے ضرور حل فرماتے ہیں اور ان کی ذمہ داری ہے اور اس کا حل و جواب ان کے دل میں ڈالا جاتا ہے۔

انبیاء کرام کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ خلق خدا کی ہدایت میں مشغول ہوں اور اس کو انفرادی واجتماعی زندگی کے شرعی اصول وآداب کی تعلیم کریں اور اس سلسلہ کی تمام کوتاہیوں وکجیوں کو ان سے دور کریں، خالص دنیوی معاملات سے نہ وہ دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ وہ ان کے مناسب ہوتے ہیں اور اگر ان کی بابت وہ کوئی رائے بھی دیں تو اس کا مفید ہونا ضروری نہیں ہے، احادیث میں منقول ہے کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں دیکھا کہ کھجوروں کی پیدائش وافزائش کے لئے ایک خاص عمل کیا جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر تم یہ نہ کیا کرو تو کیا حرج ہے؟ صحابہ جذبۂ عمل سے سرشار تھے، حضورؐ کے یہ فرمانے پر اس کو چھوڑ دیا، مگر اس کے نتیجہ میں پھلوں سے محرومی رہی، اسی موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا: ''اپنی دنیا کے معاملات تو تم ہی زیادہ جانتے ہو''، بعض دوسری احادیث میں مزید وضاحت ہے، ایک میں ہے: حضورؐ نے فرمایا:

’’میں ایک انسان ہی ہوں اگر تمہاری دنیا کی بابت تم کو کسی چیز کا حکم کروں تو اسے اختیار کرلیا کرو اور اگر اپنی رائے سے کسی چیز کو کہوں تو پھر تو انسان ہی ہوں‘‘، ایک حدیث میں اوپر والے واقعہ کے ذکر نے کے بعد آپؐ کا فرمان منقول ہے:’’میرا محض ایک گمان تھا، اس کی وجہ سے میرا مواخذہ نہ کرو، ہاں اللہ کی جانب سے کوئی بات کہوں تو اسے ضرور لے لو، اس لئے کہ اللہ کی طرف سے میں غلط بات نہیں کہہ سکتا‘‘۔

حاصل یہ کہ انبیاء کا امتیاز وہ علوم ہیں جن کا تعلق فرائض نبوت ورسالت کی ادائیگی سے ہے، اس میں وہ جو کچھ بھی اپنی زبان سے نکالتے ہیں وہ وحی خداوندی ہوتی ہے، یا وحی سے مؤید، رہیں دوسری چیزیں تو نہ تو ان کا وحی ہونا ضروری ہے اور نہ ہی ان کی تائید میں وحی کا آنا ضروری ہے اور یہ علوم نبوت ہی اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم ہوتے ہیں اور اسی کے پیش نظر حضورؐ کے متعلق منقول ہے کہ:’’آپؐ کو تمام اولین وآخرین کا علم دیا گیا‘‘ اور حضورؐ نے ایک مرتبہ صحابہ سے فرمایا:’’میں تم سب سے زیادہ علم والا ہوں‘‘۔

اور اس موقع پر یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ علماء کرام جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث وجانشین اور نائب ہوتے ہیں تو ان کی وراثت ونیابت بھی انہیں علوم اور انہیں معلومات میں ہوتی ہے اور اسی میں ان کا کمال مطلوب اور موجب تعریف ہے، دوسرے علوم وفنون اور معاملات سے ناواقفیت یا واقفیت کی کمی دین کے نقطۂ نظر سے عیب نہیں اور نہ ان کے منصب ومرتبہ کے لئے مضر۔

قرآن مجید کا نزول وترتیب اور موجودہ شکل وصورت

قرآن مجید کل بائیس سال، دو مہینہ، بائیس دن کی مدت میں نازل ہوا، یہ اس کے ساتھ خصوصی معاملہ تھا، ورنہ اس کے علاوہ تمام آسمانی کتابیں ایک ہی مرتبہ میں پوری کی پوری نازل کردی گئیں، اس کے ساتھ معاملہ یہ ہوا کہ پورا قرآن مجید ایک رات کو آسمان دنیا یعنی سب سے نچلے آسمان پر پہنچا دیا گیا، یا ہر سال کا حصہ سال بسال پہنچایا جاتا رہا اور وہاں سے حضورؐ پر نازل ہوتا رہا، عام طور سے تھوڑی تھوڑی آیات اترتی تھیں اور کبھی کبھی پوری پوری سورتیں بھی نازل ہوئیں، خصوصاً چھوٹی چھوٹی سورتیں تو ایک ہی مرتبہ میں اتریں، بعض بڑی سورتیں بھی اسی طرح نازل ہوئیں، سب سے پہلی آیات:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ....

اے نبی آپ قرآن اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجئے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپ قرآن پڑھا کیجئے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

بمقام غارِ حرا، بماہ رمضان، شب دوشنبہ، بتاریخ ۱۷ رمضان یا ۲۴ رمضان کو نازل ہوئیں اور سب سے آخری آیت مشہور وراجح قول کے مطابق:

وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ

ڈرو اس دن سے جس دن کہ تم پیش کئے جاؤ گے اللہ کے حضور میں پھر ہر نفس کو اس کئے

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ .... ہوئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائیگا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ دن پیشتر نازل ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی ایک مدت تک قرآن مجید کی وہ شکل نہ تھی جو آج ہے، یہ صورت دھیرے دھیرے ہوتی چلی گئی، آپؐ کی زندگی میں تو یہ ہوتا تھا کہ جب کسی سورت یا آیت یا سورت کے کسی حصہ کا نزول ہوتا، آپؐ صحابہؓ کو سناتے بہت سے لوگ اسے یاد کر لیتے اور وحی کے لکھنے کے ذمہ داروں میں سے موقع پر جو لوگ موجود ہوتے یا نہ ہوتے تو حضورؐ کی طلبی پر لکھنے کے لائق جو چیز مل جاتی اس پر لکھ لیتے؛ خواہ کسی درخت کی چھال یا پتھر کا ٹکڑا ہو یا کپڑے و چمڑے کا ٹکڑا ہو اور لکھ کر حضورؐ کے سپرد کر دیتے اور خود بھی نقل رکھ لیا کرتے تھے، حضورؐ ان چیزوں کو گھر کے ایک مخصوص حصے میں رکھوا دیتے تھے، ان لکھنے والوں کی تعداد چالیس سے بھی زائد ذکر کی گئی ہے، البتہ مشہور اور زیادہ تر کام کرنے والے چند حضرات حسب ذیل ہیں: حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاویہ، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت خالد بن سعید، حضرت حنظلہ، حضرت عبداللہ بن ارقم، حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہم، اسی طرح قرآن کی کتابت ہوتی رہی اور اسے جمع کیا جاتا رہا، حتیٰ کہ حضورؐ کی وفات ہوگئی۔

حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ خلافت میں جنگ یمامہ کے موقع پر حفاظ صحابہ کی بڑی تعداد شہید ہوگئی، اس وقت حضرت عمر کو نزاکت و خطرہ کا احساس ہوا کہ اگر دو ایک موقعوں پر مزید اسی طرح اس قسم کے لوگ شہید ہو گئے تو اندیشہ ہے کہ قرآن مجید ضائع ہو جائے، انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کو قرآن مجید باقاعدہ مرتب کرنے کی طرف توجہ دلائی، شروع میں حضرت ابو بکرؓ نے یہ فرما کر انکار کیا کہ "جس کام کو حضورؐ نہیں کر گئے ہیں، میں کیسے کر سکتا

ہوں"، حضرت عمرؓ نے ان کو سمجھایا حتیٰ کہ راضی ہو گئے تو کاتبان وحی میں سے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کہ نہایت ذمہ دار تھے طلب کیا گیا اور ان سے اس کام کے انجام دینے کا مطالبہ کیا گیا، انہوں نے بھی حضرت ابو بکرؓ والا عذر ذکر کیا، مگر پھر وہ بھی آمادہ ہو گئے اور کام شروع کیا، مختلف جگہوں پر بکھری ہوئی آیات و سورتوں کو یکجا کیا، یہ کام دو سال کی مدت میں مکمل ہو سکا اور پورا مجموعہ حضرت ابو بکرؓ کے سپرد کر دیا گیا جو ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس اور ان کی شہادت کے بعد حضرت حفصہؓ کے پاس رہا، یہ کام تو سرکاری تھا، سرکاری خزانہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا، عام طور سے لوگ جاننے والوں سے جس انداز پر قرآن مجید سیکھتے تھے پڑھتے تھے، بعض حضرات نے ذاتی طور پر بھی پورے قرآن مجید کو جمع و مرتب کیا تھا اور صورتحال یہ تھی کہ صحابہ چونکہ عرب کے مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ان قبائل کی زبانوں میں باہم تلفظ و الفاظ کا اختلاف تھا جو بہت سے مواقع پر شدید بھی تھا اس درجہ کہ ایک ہی تلفظ و لفظ میں سب کا قرآن مجید کا پڑھنا دشوار تھا، اس لئے حضورؐ نے سہولت کی غرض سے چند اہم قبائل کی زبان و تلفظ میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی، یہ ہی طریقہ برابر چلتا رہا، حتیٰ کہ صحابہؓ دور دور پھیل گئے اور امت کے لوگوں نے ان سے قرآن مجید کو حاصل کیا اور ہر ایک نے اپنے طریقہ کے مطابق سکھایا، نئے سیکھنے والوں کے سامنے چونکہ اس اختلاف کی حقیقت و حکمت نہیں تھی، انہوں نے اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے دوسرے طریقوں کو غلط سمجھا اور ان کی تردید بلکہ ان کے مطابق پڑھنے والوں کی تکفیر کرنے لگے، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں خاص طور سے یہ بات محسوس کی گئی اور یہ بھی ایک بہت بڑا فتنہ تھا، جس کی بدولت قرآن کی صحیح قراءت و تلاوت ضائع ہو سکتی تھی، حضرت حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ کے سامنے یہ صورتحال ذکر کے حضرات ابو بکر و عمرؓ کے زیر نگرانی جمع کئے جانے والے نسخۂ قرآن کی اشاعت و ترویج کی درخواست کی، حضرت عثمانؓ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک ہی طریقۂ تلاوت کو اختیار کرنے اور دوسرے تمام طریقوں کی مخالفت و

ختم کردینے کی تائید حاصل کی اور سابق مجموعہ کو نئے سرے سے تحقیق کے بعد متعدد نسخوں میں نقل کرنے کی ہدایت دی اور تاکید کی کہ جہاں کہیں قراءت کا اختلاف ہو قریش کی زبان کو ترجیح دی جائے، اس لئے کہ قرآن مجید کا نزول قریش ہی کی زبان میں ہوا ہے، انہیں نسخوں کو مختلف علاقوں میں بھیج کر انہیں کی تلاوت و رعایت کا حکم دیا اور دوسرے تمام نسخوں کو جلا دیا گیا، یہ کام ۲۵ سنہ ھ میں ہوا، نئی ترتیب و تحقیق کے مجموعہ کو ''مصحف عثمانی'' اور اس کے طریقہ تحریر کو ''رسم عثمانی'' کہا جاتا ہے، اس کے بعد سے قرآن کی نقل و کتابت میں اسی کی پابندی کی جاتی ہے، امت کا صدیوں سے اس پر عمل ہے اور اس کی مخالفت کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔

البتہ قرآن مجید کی موجودہ مطبوعہ صورت اور ابتدائی عہد کے ''مصحف عثمانی'' کی صورت میں کئی وجہوں سے فرق ہے، اول یہ کہ حضورؐ کے زمانہ سے لے کر اموی عہد کے حکمراں حجاج کے عہد تک حروف نقطوں سے خالی تھے؛ اس لئے کہ اس وقت تک نقطوں کا رواج نہیں تھا، اہل عرب واقفیت کی وجہ سے فرق و امتیاز کر لیا کرتے تھے، مگر جب بڑی تعداد میں غیر عرب مسلمان ہوئے تو دقت پیدا ہونے لگی،، اس وقت عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج نے اس پر توجہ دی اور وقت کے دو ذمہ دار علماء کو متعین کیا، انہوں نے ایک دوسرے سے ملتے جلتے حروف کو نقطوں کے ذریعہ ممتاز کر دیا اور نقطے تین سے زائد نہیں رکھے، اسی زمانے میں زبر، زیر، پیش اور تشدید و جزم کی موجودہ صورت اختیار کی گئی، اس سے کچھ پہلے معمولی اشارات رکھے گئے تھے، اسی طرح شروع شروع میں نہ تو آیتوں کے درمیان فصل کی اس قسم کی صورت تھی اور نہ پاروں و رکوع وغیرہ کا نظام تھا، نہ شروع میں سورۃ کا نام اور آیات کی تعداد وغیرہ لکھتے تھے، مگر ضرورت و سہولت کا احساس کرکے حضرات صحابہؓ و تابعین نے آیتوں کے درمیان فصل کی مختلف صورتیں اختیار رکھی تھیں، کسی نے دس دس، کسی نے پانچ پانچ، کو الگ کیا اور کسی نے نمبرات و تعداد کے ذریعہ اور موجودہ

صورت یہ ہے کہ آیتوں میں فصل کے لئے ''گول نشان'' استعمال کیا جاتا ہے، ایسے ہی پورے قرآن مجید کے تیس حصے؛ ہر حصہ کو ''پارہ''، پھر ہر پارے کے دو حصے، ہر ایک کو ''نصف'' اور ہر نصف کے دو حصے جس میں ہر ایک کو ''ربع'' کہتے ہیں، ہر ہر سورت کے شروع میں سورت کا نام اور آیات کی تعداد لکھی گئی، کچھ اور زمانہ گذرنے پر ہر سورت کی چند آیات کے کئی حصے کر کے ان کو ''رکوع'' کا عنوان دیا گیا۔

قرآن مجید کی کل سات منزلیں، ۳۰ پارے، ۱۱۴ سورتیں، ۵۴۰ رکوع، ۶۳۴۲ آیات، ۷۷۴۳۹ الفاظ، ۳۴۰۷۴۰ حروف ہیں اور پورے قرآن مجید کا عین آدھا پندرہویں پارے کے نصف کے بعد ''وَلْيَتَلَطَّفْ'' کی ''فاء'' ہے۔

علومِ قرآن

قرآن کریم کتاب ہدایت اور اسلامی دستور حیات تو ہے ہی، علوم وفنون کا سرچشمہ بھی ہے، اس لئے کہ وہ خداوند قدوس کا کلام ہے، جس کی ذات پر دنیا جہاں کے علوم وفنون ختم ہو جاتے ہیں، اس کے علم کی وسعت کا حال جیسا کہ اس نے قرآن مجید میں جگہ بجگہ بیان کیا ہے یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی اور ہلکی سے ہلکی حرکت بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے، خود اس کا ارشاد ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ....

(اے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کیلئے سمندر روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاوے، اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کیلئے ہم لے آویں۔

جس طرح اس کے کلام کی وسعت کا احاطہ کرنے سے ساری دنیا کے سمندر روشنائی بن جائیں تو بھی عاجز رہیں، اسی طرح اس کے فوائد وثمرات بھی بے انتہا ہیں اور اس کلام سے اخذ کئے جانے والے علوم وفنون بھی بے شمار ہیں، جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے، علمی ترقیاں بڑھتی جاتی ہیں، اتنا ہی اس کے علوم ومعارف زیادہ سے زیادہ سامنے آتے جاتے ہیں۔

علماء کرام نے اپنی محنت وکاوش کے نتیجے میں اس سے بے شمار علوم نکالے ہیں اور انہیں نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، جلال بلقینیؒ نے پچاس، زرکشی نے ۴۸، سیوطی نے ایک موقع سے ۱۰۲ اور اپنی مشہور کتاب اتقان میں ۱۸۰ اقسام ذکر کی ہیں، یہ کہہ کر کہ ان میں سے بعض اقسام میں دوسری بہت سے اقسام شامل ہیں، اگر ہر ہر قسم کو علاحدہ علاحدہ

ذکر کریں تو کل تعداد تین سو تک پہنچے گی۔

رہی یہ بات کہ کیا دنیا میں جتنے علوم وفنون پائے جاتے ہیں اور برابر وجود میں آرہے ہیں ان سب کے مسائل ان میں موجود ہیں اور یہ سب کا خزانہ ہے تو بعض لوگوں کا تو یہی خیال ہے، لیکن علماء محققین کا کہنا ہے کہ قرآنی علوم اصل ذخیرہ ہیں علوم نبویہ کا اور ان کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کا تعلق صرف ہدایت وضلالت سے ہوتا ہے، کلام پاک کی عظمت شان کی نسبت سے دوسرے تمام علوم وفنون کوڑا کرکٹ کی حیثیت رکھتے ہیں، نہ ہی اس قسم کے علوم قرآن کا موضوع ہیں اور نہ قرآن میں ان کے بیان وذکر کا ارادہ کیا گیا ہے اور نہ اس سے اس کی علمی عظمت وجلالت پر دھبہ آتا ہے، اس لئے کہ وہ کتاب ہدایت ہے، اس میں اسی کے بیان وپیش کرنے کا قصد کیا گیا ہے، ہاں اس کے ضمن میں بہت سے غیر دینی علوم وفنون جو اس دور میں رائج تھے یا جن کا آج چرچا ہے ان کے بعض اصول وقواعد کی طرف اشارہ یا ان کا ذکر ضرور آگیا ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے وضاحت وتفصیل کی ہے۔

قرآن مجید کو پورے طور پر سمجھنے وسمجھانے کیلئے علوم عربیت اور دیگر علوم دینیہ کے ساتھ خود قرآنی علوم سے بھی بڑی حد تک واقفیت ضروری ہے، اسی لئے ان علوم کے مجموعہ کو ''اصول تفسیر'' سے تعبیر کرتے ہیں یعنی وہ اصول وقواعد جن کے بغیر کلام پاک کی تفسیر ناممکن ہے، بعض حضرات نے ان تمام علوم پر مشتمل بڑی چھوٹی کتابیں تصنیف کی ہیں، مثلاً علامہ زرکشی کی ''البرھان فی علوم القرآن'' اور آخری عہد میں عرب ممالک میں تصنیف کی جانے والی بعض کتابیں جن کا نام متعدد حضرات نے ''مباحث فی علوم القرآن'' یا صرف ''علوم القرآن'' رکھا ہے اور بہت سے حضرات نے ان میں سے کسی ایک کو لے کر اس پر مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور شاید ہی کوئی فن ہو کہ جس پر مستقل کوئی کتاب یا رسالہ موجود نہ ہو۔

بعض اہم علوم قرآن حسب ذیل ہیں:

۱-علم القراءة والتجوید: قرآن مجید کے الفاظ کی ادائیگی کے اصول وقواعداوران کی رعایت کے ساتھ اس کے پڑھنے کاعلم وفن۔

۲-علم مخاصمۃ القرآن: دوسرے مذاہب ونظریات کے ماننے والوں کاردوجواب۔

۳-علم احکام القرآن: قرآن میں ذکرکردہ احکام کاعلم۔

۴-علم الناسخ والمنسوخ: قرآن کی کس آیت کے حکم کوختم کردیا گیاہےاورکس آیت کے ذریعہ،اس کاعلم۔

۵-علم اسباب النزول: خاص خاص آیات کےنزول کےاسباب وواقعات کاعلم۔

۶-اعلام القرآن: قرآنی شخصیات۔

۷-ارض القرآن: قرآنی جغرافیہ۔

۸-ربط القرآن: آیات وسورتوں کے باہمی ربط وتعلق کاعلم۔

۹-علم اعجاز القرآن: قرآن کی نمایاں شان یعنی ان وجوہات اوراس کی ان خصوصیات کاعلم جن کی بناء پرکوئی قرآن کی نظیروجواب نہ پیش کرسکا۔

۱۰-آداب القرآن: وغیرہ۔

اوران تمام پرحاوی اوران کاجامع علم ''علم التفسیر'' ہے جسے ''علم معانی القرآن'' (یعنی قرآن کے معانی ومطالب کاعلم) بھی کہتے ہیں۔

علم تفسیر

آپ نے علوم قرآن کی تفصیلات پڑھ لیں،ان کی روشنی میں اوران کی مدد سے کلام پاک کے مفہوم ومعانی کو بیان کرنا ''علم تفسیر'' کہلاتا ہے،اس کے لئے بقیہ تمام ''علوم قرآن'' معاون ومددگار ہیں، اگرچہ صرف علوم قرآن ہی قرآن مجید کی تفسیر کے لئے کافی نہیں، بلکہ ان کے ساتھ عربی علوم وفنون سے بھی بڑی حدتک واقفیت ضروری ہے، ساتھ ہی ساتھ علوم حدیث سے بہرہ ورہونا بھی ضروری ہے،اس لئے کہ کلام پاک کے پہلے شارح و پہلے مفسر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اورآپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ وتابعین ہوئے ہیں اوران چیزوں کاعلم حدیث کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے، مزید برآں تفسیر کیلئے مفسر کے حق میں صحیح اعتقاد، نفسانی خواہشات سے دوری، فہم صحیح، ذوق سلیم اورترجیح واستنباط کی صلاحیت رکھنے والا ذہن، یہ تمام چیزیں ضروری ہیں اور چونکہ قرآنی مفہوم بلکہ یوں کہئے کہ کلام خداوندی کی مرادوضاحت اسی علم کے ذریعہ ہوتی ہے، اس لئے یہ علم ''علم العلوم'' اور ''اصل الاصول'' ہے۔

حضوؐراورصحابہؓ وتابعین کے عہد میں علوم دینیہ باہم زیادہ ممتاز نہ تھےاورنہ ہی زیادہ پھیلے ہوئے تھےاورعلوم قرآن وحدیث کے سیکھنے وسکھانے کا سلسلہ بھی اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے حضوؐر کے ارشادات اور پھر صحابہؓ واکابر تابعینؒ کے اقوال کی نقل پر چل رہا تھا،اس لئے ''علم تفسیر'' کی کوئی مستقل صورت نہیں تھی، اگرچہ اس حیثیت سے امتیاز ہونے لگا تھا کہ بعض بعض صحابہ وتابعین کو کسی کسی فن سے خصوصی لگاؤ ہوتا تھا اوران سے اسی لگاؤ کے اعتبار سے علم ومعلومات کو حاصل کیا جاتا تھا، آگے چل کر جب علمی ترقی ہوئی، معلومات کے حدود وسیع تر ہوتے گئے تو یہ علوم اوران سے دلچسپیاں رکھنے والے بھی باہم بہت ممتاز

ہو گئے، حتیٰ کہ علوم قرآن وحدیث کے جمع کرنے کی طرف لوگ متوجہ ہوئے اور کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔

تفسیر یعنی قرآن کے معانی کے بیان کے سلسلہ میں امت نے اصولاً دو طریقے اختیار کئے ہیں، ایک ''تفسیر بالماثور''، دوسرا ''تفسیر بالرأی''۔

''تفسیر بالماثور'' کا مطلب یہ ہے کہ آیات کی توضیح وتفصیل میں، آیات ہی کو یا حضورؐ کے ارشادات، یا صحابہؓ وتابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے اقوال وآراء کی نقل وذکر پر اکتفاء کی جائے اور انہیں کے ذریعہ تفسیر کی جائے اور اپنی رائے واجتہاد سے کچھ نہ کہا جائے، بعض حضرات نے اسی انداز پر اپنی کتابیں بھی لکھیں، اس انداز کی اولین کتابیں تفسیر ابن عیینہ، تفسیر وکیع، تفسیر شعبہ بن حجاج ہیں اور مشہور ومستند تفاسیر میں تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، سیوطی کی الدر المنثور، البغوی، شوکانی کی فتح القدیر وغیرہ ہیں۔

''تفسیر بالرائے'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اجتہاد ورائے سے کسی مفہوم ومعنی کو بیان کیا جائے، اس سلسلہ میں ایک ضروری بات یہ ذہن نشین کرلیں کہ حضورؐ نے اپنی رائے سے کسی آیت کا مفہوم بیان کرنے کو منع اور سزا کا باعث بتایا ہے، اگرچہ بات صحیح کیوں نہ کہی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ میں بہت سے حضرات اپنی رائے سے کچھ کہنے سے پورے طور پر بچتے رہے، لیکن چونکہ جن صحابہؓ وتابعینؒ سے ممانعت والی حدیث مروی ہے انہیں سے خود ان کی ذاتی آراء بھی منقول ہیں، اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ: ''اس حدیث کا مصداق وہ تفسیر ہے جس کی ارشادات رسولؐ اور اقوال صحابہؓ وتابعینؒ سے تائید نہ ہوتی ہو اور جو اصول شرع کے موافق نہ ہو''۔

ایک بڑے طبقہ نے اسی طریقے کو ہر زمانے میں اختیار کیا ہے، اس سلسلہ کی مشہور تفاسیر: نسفی، قرطبی، ابوسعود، البحر المحیط، روح المعانی اور تفسیر کبیر وغیرہ ہیں۔

ایک بات یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعض حضرات نے تفسیر کے تحت صرف مفہوم قرآنی

ہی کا ذکر کیا ہے اور بعض نے حسب موقع دیگر علوم سے بھی بحث کی ہے، کسی نے کم اور کسی نے زیادہ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کسی نے اپنے ذوق کے مطابق ایک علم وفن کی رو سے زیادہ تفصیل کی ہے، مثلاً رازی معقولی ہیں تو عقلی بحثیں بہت کرتے ہیں، زمخشری نحوی اور بلیغ ومتکلم ہیں؛ تو نحو وبلاغت اور کلام سب کے مسائل ذکر کرتے ہیں، جیسے کہ بعض حضرات نے کسی ایک علم وفن کو لے کر اسی کے مطابق پورے کلام پاک کی تفسیر کی ہے۔

چونکہ اسلامی علوم کا اصل ذخیرہ عربی میں ہے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد کا بالخصوص علماء کا تعلق عربی سے رہا ہے، اس لئے یہ سارا کام عام طور سے عربی میں ہوا ہے، البتہ جیسے ضرورت کے پیش نظر دوسری زبانوں میں قرآن کے تراجم ہوئے ہیں، تفسیر کا بھی کام کیا گیا ہے اور یہ اگرچہ اتنا وسیع نہیں ہے مگر قیمت میں کمتر نہیں ہے، مثلاً فارسی میں تفسیر حسینی اور تفسیر عزیزی، انگریزی میں تفسیر ماجدی، اردو میں جیسے تراجم بکثرت ہیں، تفاسیر بھی متعدد اور نہایت وقیع ہیں، مثلاً بیان القرآن، معارف القرآن، جواہر القرآن، حواشی شبیر احمد عثمانی، تفسیر ماجدی وغیرہ۔

امت کے مشہور مفسرین اور صحابہ میں حضرات خلفاء اربعہ اور عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم تھے، ان میں بھی عبداللہ بن عباسؓ مرجع تھے، تابعین میں اخیر الذکر تینوں کے شاگردان، اول کے کوفہ، دوم کے مکہ اور سوم کے مدینہ میں جیسے علقمہ وحسن بصری وقتادہ، عطاء وسعید بن جبیر ومجاہد، ابوالعالیہ وغیرہ اور بعد کے طبری، زمخشری، رازی، بیضاوی، ابن کثیر، بغوی، سیوطی، الوسی وغیرہ۔

مشہور مفسرین

یوں تو جیسے تمام علوم وفنون کے بے شمار ماہر ہوئے ہیں با کمال مفسرین بھی بہت تعداد میں گذرے ہیں، چند اہم کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

۱- حضرت عبداللہ بن عباسؓ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے صاحبزادے اور والدہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کی بہن، حضرت لبابہ بنت حارثؓ تھیں، پیدائش ان دنوں میں ہوئی جب کہ قریش کی جانب سے پورے خاندان کا بائیکاٹ چل رہا تھا، وفات: بمقام طائف ۶۸ ہجری میں ہوئی، متعدد جنگوں میں شرکت کی، حضرت علیؓ کے عہد میں ایک زمانہ تک بصرہ کے گورنر رہے، حضورؐ نے ان کے حق میں علم دین اور بالخصوص علم قرآن سے نوازے جانے کی خصوصی دعا فرمائی تھی، اس لئے صحابہؓ کے درمیان تفسیر میں امامت وقیادت کا منصب آپ کو ہی حاصل تھا، اکابر صحابہ نے اس کو تسلیم کیا ہے، اسی لئے آپ کو ''ترجمان القرآن'' اور ''رئیس المفسرین'' وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، ان سے تفسیری روایات بہت بڑی تعداد میں منقول ہیں، جنہیں بعد میں بعض حضرات نے ''تفسیر ابن عباس'' اور ''تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس'' کے نام سے مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، مکہ کے ''مدرسہ تفسیر'' کے آپ ہی روح رواں تھے، آپ کے تلامذہ بہت بڑی تعداد میں تھے، جن میں عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر، طاؤس وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

۲- مجاہد بن جبر تابعی:

نام: مجاہد، والد: جبر، کنیت: ابوالحجاج، مکہ کے رہنے والے اور خاندان بنومخزوم سے تھے، بہت سے صحابہ جن میں حضرت علی، عائشہ، عبداللہ بن مسعود، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم

وغیرہ ہیں اور بالخصوص حضرت ابن عباس سے علم حاصل کیا اور خود ان سے بہت جلیل القدر تابعین نے استفادہ کیا، مثلاً عطاء، عکرمہ، قتادہ۔

۲۱ سنہ ھ میں پیدا ہوئے اور ایک قول کے مطابق ۱۰۴ سنہ ھ میں وفات پائی، مفسرین تابعین میں آپ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو صحابہؓ میں حضرت ابن عباسؓ کو، کہا گیا ہے کہ: تین مرتبہ پورے قرآن کی تفسیر اور تیس مرتبہ الفاظ قرآن کا علم ان سے حاصل کیا''، ان کی روایات کا بغیر کسی ردوکد کے مشہور ائمہ حدیث اعتبار کرتے ہیں۔

۳- طبری:

نام: محمد، والد: جریر بن یزید، کنیت: ابوجعفر، طبری بغدادی، عام طور سے صرف ''طبری'' کے نام سے ذکر کئے جاتے ہیں، بغداد میں ۲۲۴ سنہ ھ میں پیدائش اور وہیں ۳۱۰ ہجری میں وفات ہوئی، بہت بڑے مؤرخ اور روایات کا بڑا علم رکھنے والے تھے، تاریخ میں ان کی کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' بہت مشہور ہے، اسلامی تاریخ سے متعلق کوئی کتاب اس کے حوالہ سے خالی نہیں مل سکتی اور تفسیر جس کا نام ''جامع البیان'' ہے؛ ''تفسیر طبری'' کے نام سے مشہور ہے، تفسیر کی کتابوں میں یہ نہایت ضخیم ہے اور تفسیر بالاثر کے سلسلہ میں یہ ہی بعد کے لوگوں کا مرجع ہے، اس لئے کہ اس میں صحابہؓ وتابعین اور اتباع تابعین کے اقوال پوری سند کے ساتھ منقول ہیں حتیٰ کہ علماء نے کہا ہے کہ: ''تفسیر میں اس جیسی کوئی کتاب نہیں ہے''، آٹھویں صدی ہجری کی مشہور تفسیر کی کتاب ''تفسیر ابن کثیر'' اسی سے ماخوذ ہے، اس کے مصنف علامہ ابن کثیر علوم وفنون سے واقفیت نیز تصنیفات میں ''طبری'' کے مانند تھے، ان دونوں تفاسیر میں اصلاً آیات کے معانی اور احکام کے ذکر پر اکتفاء کی گئی ہے، دوسرے علوم پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

۴- شوکانی:

نام: محمد بن علی شوکانی، ۱۱۷۳ھ میں ''شوکان'' میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۰ سنہ ھ میں

وفات پائی، ابتداءً زیدی شیعہ تھے اور حضرت زید بن علی کی فقہ کے ماہر و مجتہد پھر وسعت مطالعہ کی بناء پر اہل سنت میں سے ہو گئے اور عدم تقلید کے مسلک کو اختیار کیا، ان کی تصانیف بڑی تعداد میں اور بعض نہایت اہم ہیں، "تفسیر فتح القدیر" بہت مشہور ہے، اس میں انہوں نے "تفسیر بالاثر" پر زیادہ توجہ دی ہے۔

۵-آلوسی:

ماضی قریب کے مشہور مفسرین میں علامہ آلوسی صاحب روح المعانی ہیں، ان کی تصنیف "روح المعانی" نہایت ضخیم اور مفید ہے، انہوں نے تفسیر بالرای کو اختیار کیا ہے، روایات کے ساتھ بکثرت دوسرے علوم کی معلومات سے بھی بحث کرتے ہیں، یہ حنفی فقہاء میں سے تھے اور بغداد کے رہنے والے تھے۔

نیز مشہور مفسرین میں رازی، زمخشری، بیضاوی، ابن حبان، ابن عطیہ، ابن ابی شیبہ، بغوی، نسفی، ابوسعود، قرطبی، ابوحیان اندلسی، سیوطی وغیرہ ہیں، ماضی قریب کے عرب علماء میں شیخ عبدہ، علامہ رشید رضا مصری، سید قطب اور سعید طنطاوی نے کافی شہرت حاصل کی ہے، ہندوستان بھی اس شرف سے محروم نہیں ہے، گذشتہ صدیوں میں بہ زبان عربی علاء الدین بن علی شافعی مہائمی، حسین بن خالد ناگوری، شیخ بن قاسم سندھی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور ملا جیون وغیرہ نے گرانقدر تفاسیر تصنیف کی ہیں اور ماضی قریب میں شاہ ولی اللہ کے تین فرزندان، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین نے شہرت حاصل کی اور اس صدی میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ نے امتیازی کام کئے ہیں اور ان کی تفسیری خدمات مشہور ہیں اور ہر ایک کے اپنے خصوصی امتیازات بھی ہیں۔

تفسیر کی کتابیں اختصار و تفصیل میں مختلف انداز کی ہیں، بعض بہت مختصر، بعض بہت مفصل حتیٰ کہ بعض حضرات نے تو ایک ہی سورت کی تفسیر متعدد جلدوں میں اور پورے

قرآن کی بیسیوں جلدوں میں لکھی ہے، ویسے مختصر تفاسیر میں: زاد المسیر، الوجیز، الواضح، جلالین اور متوسط میں: الوسیط، التیسیر، کشاف، ماتریدی، نسفی، بغوی، بیضاوی، مدارک، کواشی اور مفصل میں البسیط، البحر المحیط، کبیر، فتح البیان، قشیری، طبری، الدر المنثور، ابن کثیر، روح المعانی، ابوسعود وغیرہ مشہور ہیں۔

اعجاز قرآن

"اعجاز" کے معنی ہیں عاجز کر دینا، اسی سے لفظ "معجزہ" ہے یعنی ایسی چیز جو کہ عاجز کردے، علوم قرآن میں بلکہ قرآن کے کمالات میں یہ کمال نہایت اہم ہے کہ اسی کی بدولت قرآن کی تمام کلاموں و کتابوں پر برتری ثابت ہے اور اسی وصف و خوبی نے اسے حضورؐ کا ابدی معجزہ بنایا ہے اور حضورؐ کے خاص الخاص معجزہ کی شان بھی یہی تھی کہ اس کا اعجاز ابدی ہو دو وجہوں سے ایک تو اس لئے کہ حضورؐ کی بعثت ایسے لوگوں میں ہوئی جو بڑے صاحب زبان اور نہایت فصیح و بلیغ سمجھے جاتے تھے اور واقعۃً تھے اور ہر نبی کو اس کی قوم کے حالات اور ان میں سب سے زیادہ رائج علم و فن کے مناسب معجزہ ملا تھا، اس لئے حضورؐ کا معجزہ اسی لائن کا رکھا گیا۔

دوسری وجہ یہ کہ حضورؐ کی نبوت و شریعت ابدی، ہمیشہ ہمیش کیلئے ہے اور یہ زمانہ دنیا کی عمر میں علوم و فنون کی ہمہ گیر ترقی اور نشر و اشاعت کا ہے، اس لئے نبی آخر الزماں کا معجزہ علمی اعتبار سے ایسا ہونا ضروری تھا کہ زمانہ خواہ کہیں پہنچ جائے مگر اس کا کمال علمی، کسی دور کے علماء اور علمی ترقیات و بلندیوں کے سامنے ماند نہ ہو سکے، اس لئے حضورؐ کو علمی معجزہ دیا گیا ہے اور ایسا کہ جس کی "علمیت" ہی اس کا "اعجاز" ہے، یہی وہ وصف ہے کہ جس کی بنیاد پر کلام پاک نے فصاحت و بلاغت کے معدن تمام اہل عرب کو اس کا جواب پیش کرنے کا چیلنج کیا اور ساری دنیا سے مدد و تعاون حاصل کر کے پورے قرآن کا نہ ہو سکے تو دس سورتوں کا، وہ بھی ممکن نہ ہو تو چھوٹی سے چھوٹی سورت کا، مگر آج تک تاریخ عالم نے کوئی ایسا فرد نہیں پیش کیا جس نے اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت کی ہو اور جس نے اس سلسلہ میں کچھ کاوش کی بھی تو کچھ مدت بعد اپنی عاجزی کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس کمال کی رو سے بڑے

سے بڑے دشمن اسلام کو کلام پاک کی حقانیت اور اس کی بلندی شان اور انسانوں کی قدرت سے باہر ہونے کا اعتراف کرنا پڑا۔

ذکر کیا جا چکا ہے کہ "علوم القرآن" پر بحث و تصنیف کرنے والوں مثلاً سیوطی و زرکشی نے ضمناً اور بعض حضرات مثلاً جاحظ، ابوعبداللہ واسطی، ابوبکر باقلانی نے مستقلاً اس علم سے بحث کی ہے اور کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم کن کن وجوہ کی بناء پر "معجزہ" ہے، یہاں چند اہم وجوہ ذکر کی جاتی ہیں۔

۱. عرب جیسی جگہ میں حضورؐ جیسے شخص کی زبان پر اس کا ظہور، عرب وہ ملک جو ہر قسم کی تہذیب و علم سے دور تھا، بس فصاحت و بلاغت کا ایک فطری ذوق اور اس کے فطری اصول ان کے پاس تھے، جس سے چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی محروم نہ تھیں اور حضورؐ یتیم پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی والدہ و دادا بھی وفات پا گئے، چچا سرپرست بنے تو وہ معاشی اعتبار سے مجبور تھے اس لئے نہ مکہ میں رہ کر کچھ سیکھنا دکھانا ہوا اور نہ ادھر اُدھر کا سفر کر کے اور نہ ہی عربوں کے فطری ذوق کے مطابق شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، پھر بھی وحی نبوت آنے کی دیر تھی کہ یہ کلام بلیغ آپ کی زبان پر جاری ہوا جس سے ہر دل و دماغ مسحور ہوا۔
۲. فطری فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کے بلند معیار پر ہونے کے باوجود ساری قوم عرب کا کسی نظیر و مثال کے پیش کرنے سے عجز کا اظہار۔
۳. ماضی، حال، مستقبل، سب کے غیبی، عام انسانوں کے علم سے باہر کے واقعات و حالات کی خبر، نہایت صحیح و سچی اور واقعات کے عین مطابق۔
۴. مخصوص ترنم و کیف جو کلام پاک کے سننے پر ہر کس و ناکس حتیٰ کہ کافر کو بھی مسحور کرتا ہے، بالخصوص عرب حتیٰ کہ بعض لوگ محض اسی ترنم و کیف کے زیر اثر مسلمان ہو گئے۔

۵۔ بار بار کی تلاوت اور سننے سے نہ اکتانا، باوجودیکہ محبوب سے محبوب اور بہتر سے بہتر کتاب دو چار مرتبہ پڑھ کر آدمی تھک جاتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور یہ کتاب ہر روز روز اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

٦۔ ہر قسم کے نقص و تصرف سے حفاظت، اس لئے کہ اللہ نے اس کا ذمہ لیا ہے چنانچہ ہر زمانے میں اس کے بے شمار حافظ رہے اور ہیں دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے ، اور دوسری طرف اس کی نقل و اشاعت اس دور میں بھی رہی جب کہ پریس اور کتابیں نہ تھیں اور آج کا کیا پوچھنا۔

۷۔ وہ بے شمار علوم و معارف جن کا قرآن جیسی مختصری کتاب نے نہ احاطہ کیا ہے نہ آئندہ امکان ہے، اب تک نہ جانے کتنے علوم اس سے نکالے گئے ہیں اور مستقبل میں جانے کتنوں کا اضافہ ہوگا اور بالخصوص ایسے علوم جو ہر عہد کی تمام انسانی ضروریات سے متعلق ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ جس معاشرہ میں پہنچ جائے وہاں اثر و نفوذ اور اس کے پیش کردہ نظام کا دوسرے تمام نظاموں پر غالب آ جانا۔

اور انہیں وجوہ پر بس نہیں؛ حروف، الفاظ، ترتیب حروف، ترتیب الفاظ، صفت قانون سازی ان سب کے اعتبار سے قرآن پاک معجز ہے اور ان تمام وجوہات میں نہ تو کوئی دوسری کتاب اس کی نظیر ہے اور نہ ہی اس کے وجود میں آنے کا امکان ہے، اس لئے کہ یہ اس نبی کا معجزہ ہے جس کی نبوت، لائی ہوئی شریعت قیامت تک برقرار رہے گی، لہٰذا اس کے معجزہ کا اس وقت تک پوری آب و تاب کے ساتھ باقی رہنا ضروری ہے تا کہ اہل عقل و اصحاب علم کی گردنیں ہمیشہ جھکی رہیں، اس لئے کہ ہر دور میں نگاہیں انہیں لوگوں پر رہا کرتی ہیں اور اعتبار و اتباع انہیں کی آراء کا ہوتا ہے۔

حدیث پاک

جس ذات پاک پر قرآن مجید جیسی معجزانہ اور علوم و فنون کی جامع کتاب نازل کی گئی اور اس کے سمجھانے اور شرح کرنے کا اولین ذمہ دار اسی کو بنایا گیا، خود اس کی گفتگو اعجازی شان نہ رکھے، وہ ذاتی طور پر علوم و فنون کا مرکز و سرچشمہ نہ ہو، اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک عمل و حرکت لائق نقل و عمل نہ ہو، ناممکن ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و فنون کے متعلق آپ ایک مضمون پڑھ چکے ہیں اور قرآنی علوم کے بارے میں بھی، جس سے یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ قرآن کا موضوع اور نبی کی بعثت کا مقصد مخلوق کی ہدایت ہے۔

حدیث اصل میں حضورؐ کے اقوال ، افعال اور تائیدات کو کہتے ہیں اور ضمناً صحابہ و تابعین کے اقوال و افعال اور تائیدات کو بھی اس کے تحت لے لیتے ہیں، علماء نے احادیث سے بھی بہت علوم و فنون کا استنباط کیا ہے، اگرچہ ان علوم کی تعداد قرآنی علوم کی تعداد تک نہیں پہنچتی اس لئے کہ قرآن کلام خداوندی ہے، ان علوم میں بعض تو قرآن و حدیث دونوں میں مشترک ہیں اور بعض ممتاز ہیں اور جس طرح علوم قرآن پر کتابیں لکھی گئی ہیں اسی طرح علوم حدیث کا معاملہ ہے، بعض کتابیں تو تمام علوم حدیث کی جامع ہیں اور بعض خاص خاص علوم میں ہیں۔

یوں علم حدیث کی اصولی دو قسمیں ہیں: ''علم روایۃ الحدیث'' اور ''علم درایۃ الحدیث'' اول سے مراد: ایک دوسرے سے واسطہ در واسطہ حضورؐ تک احادیث کا نقل کرنا ہے، حضورؐ کے بعد صحابہؓ سے لے کر آج تک احادیث کے سننے سنانے کا جو سلسلہ رائج ہے وہ اسی علم کا مصداق ہے اور جن کتب احادیث میں محض روایات حدیث کے ذکر و نقل پر اکتفاء کی گئی ہے وہ اسی علم کی ہیں، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، جن کو صحاح ستہ کہتے

ہیں، ان جیسی کتابوں کا تعلق اصل میں اسی قسم سے ہے اور آن کا اکثر حصہ محض نقل روایات پر مشتمل ہے، اس کے تحت یہ ذہن نشین کر لیں کہ حضورؐ سے جو چیز منقول ہوا سے "حدیث مرفوع" اور جو صحابی سے منقول ہوا سے "حدیث موقوف" اور جو تابعی سے منقول ہوا سے "حدیث مقطوع" کہتے ہیں، حدیث کے ناقل کو "راوی" اور حدیث کو "روایت" کہتے ہیں اور ناقلین کے نام کے مجموعہ کو "سند" اور اصل مضمون کو "متن" کہتے ہیں۔

"علم درایۃ الحدیث": احادیث کی بابت تحقیق و تفتیش کا علم یعنی راوی اور روایت دونوں کے حالات سے بحث کرنا تا کہ یہ بات سامنے آسکے کہ حدیث لائق اعتبار ہے یا نہیں اور اعتبار کے کس درجہ پر ہے، نیز یہ کہ اس کا مفہوم کیا ہے، حدیث سے متعلق بقیہ تمام علوم اسی کے تحت آتے ہیں، اسی علم کو علماء "علم اصول الحدیث" بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ احادیث سے حقیقی استفادہ اسی علم پر موقوف ہے، رہی نقل محض تو اس سے برکت تو حاصل کی جاسکتی ہے مگر عمل کی لائن سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا اور قرآن وحدیث کے جاننے کا مقصد عمل کرنا ہے، البتہ احادیث کے معانی سے بحث "علم اصول الحدیث" کے تحت نہیں آتی، "علوم الحدیث" کے تحت آتی ہے۔

علماء نے ان تمام علوم کی تفصیلات ذکر کی ہیں، حاکم نے پچاس علوم اور ابن صلاح نے ۶۵ علوم ذکر کئے ہیں، ان علوم کی جامع اہم کتابوں میں اولین کتاب "المحدث الفاصل بین الراوی والسامع" ہے، نیز حاکم کی "معرفۃ علوم الحدیث"، خطیب کی "الکفایہ" اور "الجامع لادب الشیخ والسامع" اور سب سے مشہور ابن صلاح کی کتاب "مقدمہ" ہے جس پر علماء نے بہت توجہ کی ہے اور مختلف انداز سے اس پر کام کیا ہے، مختصر ومفید واہم کتاب "نخبۃ الفکر" اور اس کی شرح ہے۔

چند اہم علوم حسب ذیل ہیں:

۱. علوم الجرح والتعدیل: راویوں کے اخلاق و کردار کا علم۔

۲. علم رجال الحدیث: حدیث کے راویوں اور ان کے حالات کا جاننا کہ کون کون لوگ ہیں۔
۳. علم علل الحدیث: ان اسباب کا علم جن کی بنا پر احادیث میں نقص پیدا ہوتا ہے۔
۴. علم مفردات الحدیث: الفاظ حدیث کے معانی کا علم۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ علوم حدیث کا بڑا حصہ راویوں سے متعلق ہے اور علماء نے تمام امور کی رعایت کے ساتھ راویوں کے احوال کے علم کو "علم اسماء الرجال" سے تعبیر کیا ہے، یہ علم مسلمانوں کی ایجاد تو ہے ہی، علماء اسلام کا بے مثال کارنامہ بھی ہے، جس کی علوم و فنون اور بالخصوص تاریخ وسیرت کی ہمہ گیر تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی، مشہور اسلام دشمن مغربی مفکر ڈاکٹر اسپنگر لکھتا ہے:

> "کوئی قوم نہ دنیا میں ایسی گذری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیتوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث میں ایک قسم "حدیث قدسی" کہلاتی ہے، یہ وہ حدیث ہے جس میں حضورؐ اپنے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد نقل فرماتے ہیں، یوں تو نبی جو کہتا ہے اللہ ہی کی جانب سے کہتا ہے، مگر حدیث قدسی میں اللہ کی طرف نسبت کر کے بات کو نقل کیا جاتا ہے کہ اللہ کا فرمان ہے اور عام احادیث میں یہ نہیں ہوتا۔

اگر حدیث کے نقل کرنے والے معدودے چند افراد ہی ہوں تو اسے "خبر واحد" کہتے ہیں اور اگر بہت سے ہوں اور بعض خاص قیود وشرائط کی رعایت کے ساتھ ہو تو "متواتر" اور ان کے بغیر ہو تو "مشہور" کہتے ہیں، کلام رسول ہونے کی وجہ سے ہر ایک باعظمت ہے، لیکن "مشہور" و "متواتر" کی عظمت ومقام بڑھا ہوا ہے حتیٰ کہ ان کے ساتھ آیات قرآنیہ کا سا معاملہ کیا جاتا ہے۔

تدوین حدیث

''تدوین حدیث'' یعنی احادیث کو جمع کرنا اور کتابی صورت میں لکھنا و مرتب کرنا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور حضرات صحابہؓ کے ابتدائی عہد میں صحابہؓ و تابعین صرف دین کا علم حاصل کرنے کی فکر کرتے تھے، نہ لکھنے کی فکر ہوتی نہ کتابوں کی، بلکہ جو سیکھتے یاد کر لیتے، خود عمل کرتے اور دوسروں کو بتاتے اور حضورؐ کی حیات میں تو زیادہ توجہ قرآن مجید ہی کی طرف تھی، چونکہ وہ زمانہ وحی کے نزول کا تھا، حضورؐ صحابہؓ کو قرآن مجید سناتے بھی تھے اور سمجھا بھی تھے، اس لئے قرآنی آیات کے علاوہ کسی دوسری چیز کے لکھنے لکھانے کا نہ تو عام مزاج و معمول تھا اور نہ ہی عام اجازت تھی، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تو لکھنے والے قرآن و حدیث کا فرق سمجھ کر لکھیں گے، خواہ غیر قرآن کو قرآن سے الگ لکھیں یا ساتھ مگر آگے چل کر خدانخواستہ اس کی نوبت آجائے کہ لوگ غیر قرآن کو قرآن کا درجہ دے دیں یا دونوں ایک دوسرے سے مل جائیں اور فرق نہ رہ جائے حالانکہ قرآن ایک ابدی کتاب ہے جس کی حفاظت اس قسم کی چیزوں سے ضروری ہے، مزید یہ کہ اس عہد کی خصوصی قوت یادداشت اور احادیث کی زیادتی بھی ایک بڑا مانع تھی۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ کسی صحابی نے کچھ لکھا ہی نہ ہو، یا یہ کہ حضورؐ نے کبھی کوئی بات لکھوا کر نہ تو کسی کو دی ہو اور نہ کہیں بھیجی ہو، حضرت ابو شاہ یمنی کی خواہش پر حضورؐ نے حجۃ الوداع کا ایک بیان تحریر کرا کر انہیں دیا اور متعدد مرتبہ تحریری احکام اسلامی لشکر کے سپرد فرمائے یا کسی مسلمان حاکم و ذمہ دار کو بھجوائے اور جزیرۃ العرب کے اطراف کے مشہور سلاطین و حکمرانوں کے نام نہایت اہتمام سے والا ناموں کا بھجوانا تو مشہور ہی ہے۔

بعض صحابہؓ ذاتی طور پر لکھنے کا اہتمام فرماتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن

عمرو بن عاص بہت مشہور ہیں، انہوں نے اپنے مجموعۂ احادیث کا نام ''صادقہ'' (سچی باتوں کا مجموعہ) رکھا تھا، شروع شروع انہوں نے بغیر اجازت ہی اس کام کو کیا مگر جب حضورؐ کے منع فرمانے کی وجہ سے بعض صحابہؓ نے اس پر اشکال کیا تو آپؐ سے باقاعدہ اجازت حاصل کر لی، اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک نوشتہ میں چند مخصوص احکام لکھ رکھے تھے، ایک صحابی عمرو بن حزمؓ کو حضورؐ نے زکاۃ کی پوری تفصیلات لکھوا کر دی تھیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ تک صحابہؓ زیادہ تر مدینہ میں مقیم رہے اور احادیث کے بیان کرنے میں احتیاط بھی کرتے رہے، بعد میں یہ سلسلہ بڑھا، یوں کہ حضرات صحابہؓ نے اِدھر اُدھر پھیل کر حدیث کی نشر و اشاعت کی، جس کی عام صورت یہ تھی کہ زبانی محض اپنی یاد سے احادیث بیان کی جاتیں اور سننے والے بھی اسی طرح ان کو محفوظ کر لیتے، منقول ہے کہ: حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں خود احادیث کے لکھوانے کا ارادہ فرمایا تھا، مگر جیسا کہ خود ہی بیان فرمایا کہ: ''ایک مہینہ کے استخارہ کے بعد احتیاط نہ لکھوانے میں سمجھ میں آئی کہ کہیں لوگ قرآن کے مقابلے میں اسی پر نہ زیادہ توجہ کرنے لگیں''، اسی خیال نے عام صحابہؓ اور اکابر و اولین تابعین کو بھی اس کام سے روکے رکھا، ساتھ ہی یہ کہ اپنی خصوصی قوت حفظ اور قرآن و حدیث کے ساتھ خصوصی شغف و انہماک کی وجہ سے ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔

لیکن جب حضرات صحابہؓ کی تعداد نہایت تھوڑی رہ گئی، اکابر تابعین بھی رخصت ہونے لگے اور مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ہر قسم کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو احادیث کی نقل و بیان کے سلسلہ میں کچھ ایسا فساد رونما ہوا کہ اصل مجموعہ کی حفاظت کے خیال سے پہلی صدی کے اخیر میں ہی اس اہم کام کی طرف اکابر کو متوجہ ہونا پڑا، خاص وجہ یہ ہوئی کہ بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے نظریات و خیالات کی اشاعت و ترویج کیلئے اپنی طرف سے گڑھ کر احادیث کی نقل شروع کر دی۔

اکثر حضرات کا خیال ہے کہ اس طرف باقاعدہ اولین توجہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کی، اس سلسلہ میں مختلف علاقوں میں احکام بھیجے، لیکن خاص محنت وکاوش مشہور محدث ''ابن شہاب زہری'' نے کی، جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے، انہوں نے سب سے پہلی مرتب و مفصل کتاب جمع کی، مگر بخاری ومسلم وغیرہ کی طرح کاٹ چھانٹ کر کے نہیں، بلکہ جو کچھ بھی ملا جمع کرلیا، پھر تو سلسلہ چل پڑا اور ہر صدی میں بے شمار عوام وخواص نے اس کام کو کیا، دوسری صدی میں دسیوں مجموعے اکابر محدثین نے ترتیب دئے، البتہ حدیثِ رسول اور اقوال صحابہؓ وتابعین میں امتیاز پھر تحقیق کے بعد کاٹ چھانٹ کے ساتھ تصنیف وترتیب کا کام تیسری صدی میں ہوا اور یہی صدی اس کام کے حق میں سب سے زیادہ ممتاز سمجھی جاتی ہے، مشہور ومعتمد کتب احادیث اسی صدی کی تصانیف ہیں، بالخصوص صحاح ستہ، کچھ معقول اضافہ، چوتھی میں طبرانی، دار قطنی، ابن حبان، طحاوی وغیرہ کی بدولت ہوا، پانچویں میں حاکم نے عظیم الشان کام کیا، محض احادیث کی جامع کتابوں کی مختصر فہرست جو گذشتہ مضمون میں مذکور ہے، اس پر چند اہم کتابوں کا اضافہ کرلیجئے، جامع الاصول، تیسیر الوصول، الترغیب والترہیب، کنز العمال، جمع الفوائد، جامع صغیر، مستدرک حاکم، مشہور شروح اور احادیث کے معانی ومطالب پر مشتمل کتابوں میں صحاح ستہ کی متعدد شروح شامل ہیں، نیز مؤطا امام مالک، مسند امام احمد، مشکاۃ المصابیح وغیرہ کی شروح ہیں، بالخصوص بخاری کی شروح فتح الباری وعمدۃ القاری اور مسلم کی نووی بہت مشہور ہیں۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ احادیث کی تمام کتابوں کا ایک انداز نہیں ہے، بلکہ کسی میں تو کوئی ایک خاص مسئلہ لے کر اس کے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا ہے، ایسے مجموعے کو ''جزء'' کہتے ہیں، کسی میں فقہ کی کتابوں میں جو ابواب وعناوین لائے جاتے ہیں؛ ان کے مطابق کام کیا گیا ہے، ایسی کتابوں کو ''سنن'' کہتے ہیں، کسی میں اس پر مزید چند ابواب مثلاً ایمان، وحی، علم اور تفسیر سے متعلق روایات کا اضافہ ہے، ان کو ''جامع'' کہتے ہیں، بعض میں

صحابہؓ کے اسماء گرامی کو لے کر حروف تہجی کی رو سے احادیث جمع کی گئی ہیں؛ ان کو ''مسند'' کہتے ہیں اور بعض میں احادیث کو ہی حروف تہجی کے حساب سے ذکر کیا گیا ہے؛ ان کو ''معجم'' کہتے ہیں۔

''تدوین حدیث'' مستقل ایک علم ہے، علماء نے اس پر بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے، اُردو میں بھی اسی نام سے ایک ضخیم ونہایت مفید کتاب ہے۔

حجیت حدیث

حدیث پاک کی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا مجموعہ ہے اور اس چیز نے اس کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے کہ احادیث دراصل قرآن پاک کی شرح وتفسیر ہیں، اس لئے اللہ اور اس کے رسول کے منشا سے صحیح واقفیت اور مکمل اسلامی زندگی کو اپنانے وگذارنے کے لئے دونوں کا علم، دونوں سے تعلق اور دونوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، محض کسی ایک پر تکیہ کر لینا نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ ہدایت کے بجائے گمراہی کا سبب بنتا ہے، علماء حق نے احادیث کے ساتھ ہمیشہ اسی انداز کا معاملہ کیا ہے، لیکن ہر دور میں کچھ ایسے افراد بھی رہے جنہوں نے دین کی اصل روح کو نہیں سمجھا، اس لئے کہ وہ حضورؐ کے حقیقی منصب وعظمت سے ناواقف تھے اور حضرات صحابہؓ کی بھی خصوصیت کے قائل نہ تھے، ان لوگوں نے حدیث پاک کو وہ درجہ نہیں دیا جو اس کا حق تھا بلکہ اس کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھ کر غیر معتبر اور عمل کے حق میں حجت وسند نہیں قرار دیا، خوارج نے تمام صحابہؓ کی روایات کو غیر معتبر قرار دیا، شیعوں میں ''زیدیہ'' فرقہ کے علاوہ باقی تمام فرقوں نے محبانِ علی صحابہؓ کے علاوہ سب کی احادیث رد کر دی ہیں اور ان کے خیال کے مطابق ان محبان علی کی تعداد بمشکل پندرہ تک ہے، چونکہ قرآن پاک کے تمام معانی و مطالب کو محض قرآن مجید سے احادیث نبویہ اور صحابہؓ کے ارشادات کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اور ان لوگوں کے پاس اس سلسلہ کا کافی ذخیرہ نہیں تھا، اس لئے اپنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے دوسرا سب سے بڑا جرم یہ کیا کہ اپنی طرف سے احادیث گڑھ گڑھ کر خوب پھیلائیں اور کام چلایا، خوارج نے اگرچہ یہ کام نہیں کیا، لیکن حدیث سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے بڑی گمراہیوں میں پڑ گئے، ایک دوسرا اہم گمراہ فرقہ ''معتزلہ'' بھی

حدیث کو اس کا مقام ومرتبہ دینے پر راضی نہیں رہا، بہرحال حدیث کے رد وانکار کا یہ سلسلہ برابر اور ہر عہد میں چلتا رہا اور محققین علماء امت اس کا جواب دیتے رہے، ابتدائی عہد میں حضرت امام شافعیؒ نے اس قسم کے لوگوں کا بڑا تفصیلی جواب دیا ہے۔

یہ عہد جو علوم کی وسعت کے ساتھ عقلی وذہنی فتنوں کی کثرت کا بھی دور ہے، اس میں بھی یہ فتنہ وجود میں آیا اور اس عہد کے خصوصی حالات کی بناء پر نئے ساز وسامان کے ساتھ اور نہ صرف غیر مسلموں بلکہ ان کے زیر سایہ رہ کر تعلیم وتربیت حاصل کرنے والے یا ان کے علم وفکر سے مرعوب مسلمانوں نے بھی اس فتنہ کی حمایت اور اس کی اشاعت وترویج میں حصہ لیا اور احکام شرعیہ کے حق میں حدیث کے حجت ودلیل ہونے کا انکار کیا۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: قرآن کہتا ہے: ''مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ'' ہم نے قرآن مجید میں کوئی چیز بیان سے نہیں چھوڑی، تو آخر حدیث کیلئے کیا رہ گیا اور اس کی کیا ضرورت رہی، قرآن کی حفاظت کا وعدہ ہے، نہ کہ حدیث کا، اگر حدیث کی بھی وہی حیثیت ہوتی تو اس کی حفاظت کا اعلان واہتمام ہوتا، ورنہ اس کے محفوظ رہنے کی کیا دلیل؟ اگر حدیث کی بھی یہی حیثیت ہوتی تو خود حضورؐ اہتمام سے اس کے لکھنے کا حکم فرماتے اور سب سے پہلے صحابہؓ کی جماعت اس کام کو کرتی اور پھر حدیث پورے اعتماد کے ساتھ بعد کے مسلمانوں تک پہنچتی اور حال یہ ہے کہ بہت سے صحابہؓ وتابعین سے اس کی ممانعت اور ناپسندیدگی منقول ہے، بہت بعد میں اس کام کو کیا گیا تو پھر اس کی صحت پر پورا اعتماد و اطمینان کیونکر ہو سکتا ہے اور جب کہ خود ایک حدیث کا مضمون ہے کہ: ''میں جو کچھ قرآن کے موافق کہوں اسے مانو اور جو اس کے مخالف ہو اسے مت مانو، میں تو قرآن ہی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام کہتا ہوں''، اس مضمون سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث خود کوئی شرعی دلیل وحجت نہیں ہے۔

علماء کرام نے پوری تندہی وبیداری کے ساتھ اس فتنہ کا رد کیا اور ان کے دلائل کا

جواب دیا۔

۱. قرآن میں بیان ہر چیز کا ہے، لیکن بہت سی چیزوں کا تذکرہ اصولی صورت میں ہے اور صریح وصاف نہیں، حضوؐر نے بذریعہ احادیث اسی کو بیان کیا ہے اور قرآن میں متعدد جگہ فرمایا گیا ہے کہ آپؐ پر قران کو اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کیلئے مراد خداوندی کو پورے طور پر واضح فرمادیں "اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ" (ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں ان کو آپ ان سے ظاہر کردیں)۔

۲. اللہ کا وعدہ صرف قرآن کی ہی حفاظت کا نہیں ہے بلکہ پوری شریعت محمدیہ کی حفاظت کا وعدہ ہے، جس کے بنیادی مآخذ قرآن وحدیث دونوں ہیں، قرآن کی حفاظت تو ظاہر ومعلوم ہے، احادیث کی حفاظت یوں فرمائی گئی ہے کہ لوگ پوری چھان بین کے ساتھ یاداشت یا تحریر سے احادیث کو نقل کرتے رہے اور دوسروں تک پہنچاتے رہے، حتیٰ کہ آج بے شمار کتابوں کی صورت میں وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔

۳. حضوؐر کی ممانعت کی خاص وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو اشتباہ نہ ہوجائے ورنہ تو قرآن بھی باقاعدہ طور پر بعد میں جمع کیا گیا اور خود حضوؐر سے اپنے ارشادات کا لکھوانا اور اس کی اجازت ثابت ہے، ایسے ہی حضرات صحابہؓ کا انکار و بچنا بھی شدت احتیاط کی وجہ سے تھا کہ جو کام حضوؐر کے زمانہ میں عام طور سے نہیں کیا گیا، اسے کیوں کریں، پھر یہ کہ کہیں عوام الناس قرآن کو چھوڑ کر اسی کو نہ اہمیت دینے لگیں ورنہ خود صحابہؓ وتابعین سے لکھنے کا اہتمام ثابت ہے، محض اس وجہ سے اعتماد مجروح نہیں ہوگا کہ حضوؐر کے بہت بعد احادیث کا مجموعہ تیار ہوا ہے، اس لئے کہ علماء نے بے انتہا کوشش وکاوش کرکے احادیث میں صحیح وغلط کو صاف کردیا ہے اور اس کے درجے متعین کردیئے ہیں۔

۴. کوئی صحیح حدیث کبھی قرآن کے مخالف نہیں ہوسکتی اور جو مخالف ہو وہ قطعاً حدیث نہیں ہوسکتی، یہ مضمون بالکل صحیح ہے کہ حضوؐر قرآن ہی کے حلال وحرام کو بیان فرما. تے تھے، آپؐ کا ہر قول وفعل وحی کی بنیاد پر ہی ہوتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ حدیث کو حجت ودلیل نہ ماننے کی بناء پر دین کا بڑا حصہ ضائع ہوجائیگا، اس لئے کہ قرآن مجید تو بے انتہا مختصر اور جامع کتاب ہے اور اس میں مذکورہ مضامین حتیٰ کہ نماز اور زکاۃ وحج وغیرہ فرائض واسلام کے بنیادی اعمال وارکان کی تفصیلات بھی احادیث میں ہی منقول ہیں، اگر احادیث کو نہ مانیں تو ان فرائض کی بھی حقیقی صورت وکیفیت کا علم ہم کو نہیں ہوسکتا پھر خود ہی سوچ لیں کہ ہمارا دین کیسا ہوگا اور اس پر عمل کیسا ہوگا۔

مشہور محدثین

علوم حدیث سے خصوصی تعلق ومہارت رکھنے والے کو محدث کہتے ہیں، حضرات صحابہ سے لے کر آج تک ہر دور میں محدثین ہوتے رہے، جیسے کہ دوسرے فنون کے ماہر گذرے یہ تعداد میں بے شمار ہیں، حضرات صحابہؓ سب کے سب اسی صف میں آتے ہیں کہ سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو چیزیں بھی ان کے علم میں تھیں ان کو نقل کیا ہے، ویسے دور صحابہؓ میں ان کا کام زیادہ تر احادیث کے نقل کرنے کا تھا، حدیث سے متعلق تحقیق وتفتیش جو بعد میں علوم حدیث کے عنوان سے اختیار کی گئی، وہ اس زمانہ میں نہ تھی، نقل حدیث کے اعتبار سے صحابہؓ کی تین جماعتیں ہیں: ایک جماعت سے بکثرت احادیث منقول ہیں حتیٰ کہ ہزاروں کی تعداد میں، جیسے حضرت ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہ، ان میں بھی سرفہرست حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔

دوسری سے متوسط مقدار میں جیسے حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ تیسری سے بہت کم حتیٰ کہ بعض بعض سے ایک ہی حدیث منقول ہے، بعد کے لوگوں کا بھی یہی حال رہا ہے، لیکن بعض بعض حضرات نے فن میں اپنی مہارت وعظمت یا گراں قدر تصنیف کی بناء پر عالمی شہرت حاصل کی ہے، ایسے چند حضرات کے مختصر حالات ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱-زہری:

ابو بکر، محمد بن مسلم، قریشی، زہری: اکثر صرف زہری یا ابن شہاب زہری کے نام سے ذکر کئے جاتے ہیں ولادت ۵۱ ھ میں اور وفات بعمر ۷۲ سال ۱۲۴ ھ میں ہوئی، بے نظیر قوت یاداشت کی بنا پر صرف آٹھ راتوں میں پورا قرآن مجید حفظ کیا، باقی علوم وقت

کے بعض اکابر صحابہؓ مثلاً حضرت ابن عمرؓ، حضرت انسؓ وغیرہ اور ممتاز تابعین حضرت سعید بن مسیب اور عروہ بن زبیر وغیرہ سے حاصل کئے اور خاص طور سے سعید بن مسیب کی صحبت وخدمت میں رہے، حصول علم کیلئے مشقتوں کے برداشت کرنے میں آپ کو امتیاز حاصل تھا رات رات بھر جاگتے، لمبے لمبے سفر کرتے، اساتذہ کی ہر قسم کی خدمت کرتے اور جو کچھ حاصل کرتے اسے یاد بھی کرتے اور لکھ بھی لیتے، امتیازی قوت یاداشت کی بناء پر احادیث کی روایت ونقل میں بڑی شہرت حاصل کی، چاروں طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے، جب مدینہ میں تشریف فرما ہوتے تو لوگ کسی دوسرے کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، ممتاز محدثین نے ان کو اپنے وقت وعہد کا سب سے بڑا محدث شمار کیا ہے، حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ: ''بعض اہم چیزیں انہیں کی بدولت دوسروں تک پہنچیں''، حدیث کی سب سے پہلی کتاب کی ترتیب وتدوین کا شرف انہیں کو حاصل ہے، یہ کام انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خواہش پر کیا تھا اور یہ بھی انہیں کا کارنامہ ہے کہ: ''حدیث کی سند یعنی ناقلین حدیث کے سلسلہ اور ان کے احوال کی تحقیق پر خصوصی توجہ دی''، ان کے ممتاز شاگردوں میں امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور عمر بن عبدالعزیز جیسے لوگ ہیں، حدیث کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس میں آپ کے واسطے سے کوئی چیز منقول نہ ہو۔

۲-بخاری:

ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل، بخاری ۱۳ شوال ۱۹۴ ھ، بروز جمعہ بخارئ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ ھ میں وفات پائی، اپنے زمانے میں محدثین اور حفاظ حدیث کے امام مانے گئے، دس سال کی عمر سے پہلے ہی علم حدیث کی تحصیل میں لگ گئے اور پھر شہروں اور ملکوں ملکوں کی خاک چھانتے رہے، جہاں کہیں کسی محدث کی بابت علم ہوتا چل پڑتے اور اس سے علم حاصل کرتے، قوت یادداشت اور احادیث سے متعلق تمام علوم کی معلومات میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی، تین لاکھ احادیث یاد تھیں، اسی ذخیرہ سے ایک لاکھ نہایت صحیح ومعتبر احادیث

سے حدیثیں انتخاب کرکے اپنی کتاب لکھی؛ جوان کی علمی عظمت اور کتاب کی تصنیف میں خصوصی سعی وکوشش اورانتخاب وتحقیق کی بناء پرتمام کتب احادیث میں فائق مانی گئی،قران کے بعد دنیا کی سب سے زیادہ سچی ومعتبر کتاب قراردی گئی، اس کی تکمیل سولہ سال کی طویل مدت میں ہوئی، ہرحدیث کے لکھنے سے پہلے غسل کرکے دورکعت نماز پڑھتے اور پھر استخارہ کے بعد ہی نہایت اعلیٰ درجہ کی صحیح روایات کتاب میں شامل فرماتے، ان کی کتاب ایک امتیازی خصوصیت احادیث پرقائم کردہ ان کے عنوانات اوران عناوین واحادیث کی باہمی مناسبت ہے، اصل کتاب میں ہرحدیث صحیح ومرفوع ہی ذکر کی ہے، کل ۷۳۹۷ احادیث ہیں اور تکرار کے بغیر ۲۶۰۲، امت نے زمانہ تصنیف سے لے آج تک ان کی کتاب کو عظمت واعتماد کی نگاہ سے دیکھا ہے اور سیکڑوں کی تعداد میں اس کی شروحات لکھی گئی ہیں، جن میں ابن حجر عسقلانی، علامہ عینی، زرکشی اور سیوطی کی شروح مشہور ہیں، ہندوستانی شروح میں فیض الباری مشہور ہے، اس کتاب کے علاوہ دوسری بھی کتابیں لکھیں اور سبھی معتمد ونہایت مفید ہیں، یتیم تھے، والدہ نے کفالت کرکے تعلیم دلائی تھی، بچپن میں بینائی جاتی رہی تھی، مگر والدہ کی دعاؤں کے طفیل اللہ نے لوٹادی۔

۳-مسلم:

مسلم بن حجاج، قشیری، نیشاپوری ۲۰۴ھ میں مقام نیشاپور میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۶۱ھ میں وفات پائی، بچپن سے تحصیل علم میں اور اس کے لئے سفر میں لگ گئے، تمام اسلامی ملکوں کا سفرکیا اور محدثین اور علماء محققین سے کسب فیض کیا، امام بخاری کے ہم زمانہ بلکہ ان کے شاگرد تھے اور ان سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے، اپنی کتاب میں انہیں کی اقتداء میں صرف صحیح احادیثِ ذکر کی ہیں، تمام کتب حدیث میں بخاری کے بعد صحت د اعتبار میں اسی کتاب کا درجہ ہے، البتہ امام بخاری نے انتخاب حدیث میں جس سختی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے انہوں نے کام نہیں لیا ہے، ان کی کتاب میں کل ۷۲۷۵ اور بغیر

تکرار کے ۴۰۰۰ احادیث ہیں، اس کی بھی کئی شرحیں ہیں، مشہور امام نووی اور قاضی عیاض کی شرح ہے، نیز حلقۂ دیوبند کے مشہور عالم ومحدث علامہ شبیر احمد کی فتح الملہم جو مکمل نہیں ہو سکی۔

۴-ترمذی:

ابوعیسیٰ، محمد بن عیسیٰ، ترمذی، ولادت بمقام ترمذ ۲۰۹ھ اور وفات وہیں ۲۷۹ میں ہوئی، وقت کے اکابر محدثین سے علم حدیث حاصل کرنے کیلئے دور دور کا سفرکیا، امام بخاری بھی ان کے استاذ ہیں، ان پرنہایت اعتماد فرماتے تھے حتیٰ کہ چند احادیث خودانہوں نے ان سے حاصل کیں اور ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا اشرف ہے، حدیث میں انہوں نے بھی بڑی ہی اہم کتاب تحریر فرمائی جو سنن ترمذی کے نام سے مشہور ہے، البتہ اس میں احادیث کی نقل میں بخاری ومسلم جیسی احتیاط نہیں برتی گئی ہے، اس لئے مختلف قسم کی احادیث آگئی ہیں، جن کے درجات وہ خود بیان فرماتے ہیں، کتاب بہرحال کتب حدیث میں ایک بڑا مقام رکھتی ہے، اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ہرحدیث کے ساتھ اس سے نکلنے والے مسائل کے حق میں حضرات صحابہؓ اور دوسرے علماء کے مذاہب بھی بیان فرماتے ہیں، مشہور شرح کرنے والوں میں ابوبکر بن عربی، ابن رجب حنبلی، عبدالرحمٰن مبارک پوری، یوسف بنوری وغیرہ ہیں۔

۵-ابوداؤد:

ابوداؤد سلیمان بن اشعث، اسدی، سجتانی، ولادت ۲۰۲ھ، وفات بمقام بصرہ ۲۷۵ھ، دور دراز کا سفر کے علم حدیث کی تحصیل کی، ان کے اساتذہ میں امام بخاری ومسلم کے اساتذہ بھی ہیں اور شاگردوں میں امام نسائی وغیرہ، ان کی کتاب ''سنن ابی داؤد'' حدیث کی مشہور ومعتمد کتابوں میں سے ہے اور صحاح ستہ میں شامل ہے، کہا جاتا ہے کہ: ان کی کتاب پانچ لاکھ احادیث کا انتخاب ہے، جس میں ۴۸۰۰ احادیث ہیں، اس کا امتیاز یہ

ہے کہ صرف احکام فقہیہ سے متعلق روایات جمع کی ہیں، احادیث ہر قسم کی نقل کرتے ہیں، اگرچہ موقع بموقع ان کے درجہ ومرتبہ پر توجہ بھی دلاتے رہتے ہیں، اس کے مشہور شراح میں خطابی، شہاب الدین رملی، شمس الحق عظیم آبادی اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری وغیرہ ہیں۔

یہ چند نہایت مشہور محدثین کے حالات ہیں، ورنہ تو مشاہیر محدثین اور ان کے کارناموں کی فہرست کافی لمبی ہے، کسی کا کارنامہ صرف روایات کے مجموعہ کی تصنیف وتالیف ہے، جیسے امام مالک، امام احمد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، دارقطنی، ابن عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، ابن حبان، ابن خزیمہ، بیہقی وغیرہ اور کسی کی یادگار دوسرے علوم حدیث میں کوئی اہم تصنیف ہے۔

علم احکام

قرآن وحدیث سے تعلق رکھنے والے اور ان دونوں سے حاصل کئے جانے والے علوم میں سے ایک مشترکہ علم ''علم احکام'' ہے، یہ علم ان علوم میں نہایت مہتم بالشان ہے بلکہ بایں معنی سب سے ممتاز ہے کہ حضرات انبیاء کی آمد اور آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد صرف یہ رہا ہے کہ بندوں کو اللہ کے احکام سے واقف وروشناس کرایا جائے تاکہ وہ ان کی بجا آوری کرسکیں اور علم احکام ہی احکام خداوندی سے واقفیت کا ذریعہ ہے، البتہ احکام کا تعلق چونکہ تین چیزوں سے ہے؛ اول: اعتقادات کہ کیا عقیدہ صحیح ہے اور کیا غلط، دوم: اعمال کہ انسان کے ظاہری اعضاء یعنی ہاتھ پیر وغیرہ سے ہونے والے اعمال میں سے کیا جائز ودرست ہے اور کیا ناجائز وغلط، سوم: اخلاق کہ کیا کیا عادتیں وخصلتیں اچھی ہیں اور کیا بری، اور اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان تینوں کو سدھارنے وسنوارنے کا ہم سے مطالبہ ہے اور تینوں کے سدھارنے وسنوارنے پر ہی آخرت کی پوری کامیابی موقوف ہے، اس لئے علم احکام کے تین حصے ہیں: علم کلام، علم فقہ، علم اخلاق؛ عقائد سے متعلق علم ''علم کلام''، اعمال سے متعلق ''علم فقہ''، اخلاق سے متعلق ''علم اخلاق'' کہلاتا ہے۔

شروع میں جبکہ علوم وفنون کی اتنی کثرت نہ تھی اور نہ ہی ہر علم کے مسائل کو وہ وسعت حاصل تھی جو بعد میں ہوگئی، نیز یہ کہ عام توجہ اصل مقصود پر تھی یعنی اس پر کہ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی وحکم کا علم ہو اور اس پر عمل کیا جائے، اس وقت یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے ممتاز نہ تھیں، بلکہ پورے مجموعہ کو ''علم دین'' اور ''علم احکام'' اور ''علم فقہ فی الدین'' کہا کرتے تھے، ''فقہ'' کی تعبیر خود قرآن وحدیث میں آئی ہے، یہ معاملہ پہلی صدی اور دوسری صدی کے وسط تک رہا اور حضوؐر کی حیات میں حضوؐر تن تنہا ہی ان تمام مشکلات کا مداوا تھے،

آپؐ کے بعد صحابہؓ اور تابعین کے عہد تک یہی بات رہی۔

دھیرے دھیرے ہر قسم کے مسائل میں وسعت ہوتی چلی گئی اور ذوق ومزاج اور ذہن و ماحول کے اختلاف کی وجہ سے دلچسپیوں کا بھی فرق ہوتا گیا حتیٰ کہ ''علم احکام'' تین علاحدہ علاحدہ حصوں میں منقسم ہو گیا اور ہر حصہ الگ الگ عنوان سے جانا جانے لگا اور ہر ایک سے خصوصی دلچسپی رکھنے والا گروہ دوسرے سے ممتاز قرار پایا اور اس نے جس قسم کو اپنے لئے مرکز توجہ بنایا اس پر محنت کر کے اسے خوب وسعت وترقی دی، اسی پر بس نہیں بلکہ ہر قسم کے جزئی مسائل کی وسعت، معلومات کی قلت وکثرت اور ذوق ومزاج کے اختلافات نے تینوں اقسام میں متعدد مکاتب فکر اور مذاہب قائم کر دیئے، جن میں سب سے زیادہ وسعت فقہ کو حاصل رہی اور علم فقہ میں تو نہیں لیکن کلام وتصوف کے بعض مکاتب فکر نے ایسے نظریات بھی اپنائے کہ اصول شرع کے خلاف ہونے کی بناء پر علماء اسلام نے ان نظریات کو صرف خلاف سنت وبدعت ہی نہیں قرار دیا بلکہ سراسر ایمان کے خلاف اور ان کے اپنانے والوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

ویسے لفظ حکم واحکام کا استعمال فقہ میں بکثرت ہوتا ہے اور فقہ کی رو سے اس کی متعدد اقسام ہیں، فرض، واجب، سنت، مستحب، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، خلاف اولی، مباح۔

''فرض'': جس کا کرنا لازم ہے، نہ کرنے پر سخت گناہ اور انکار کفر ہے، اس کی دو قسمیں ہیں: ''فرض عین''؛ جو ہر ایک کیلئے ضروری ہے، جیسے نماز، روزہ، ''فرض کفایہ''؛ جو پوری جماعت کے ذمہ ہے؛ کوئی ایک یا چند کر لیں تو کافی ہے، جیسے نماز جنازہ، ''واجب'': جس کا کرنا ضروری ہے اور نہ کرنا گناہ ہے؛ لیکن انکار کفر نہیں جیسے عید کی نماز، ''سنت'': جس کا کرنا بڑا باعث ثواب اور نہ کرنا باعث ملامت وناگواری، جیسے فجر سے پہلے کی دو سنتیں، ''مستحب'': جس کا کرنا پسندیدہ ہے، ''حرام'': جس کا نہ کرنا ضروری ہے، کرنے پر سخت گناہ

اور انکار کفر ہے، جیسے چوری، ''مکروہ تنزیہی'': جس کا نہ کرنا پسندیدہ ومطلوب ہے، ''خلاف اولیٰ'': جس کا نہ کرنا بہتر ہے، ''مباح'': جس کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہے، فقہ کی رو سے انسان کے تمام اعمال کا تعلق ان احکام میں سے کسی ایک سے ضرور ہوتا ہے اور فقہی کتابوں اور فتاویٰ میں یہی بتایا جاتا ہے کہ کون سا عمل کس قسم کے تحت آتا ہے۔

علم کلام

''کلام'' کے معنی ہیں ''گفتگو''، اصطلاحی مفہوم ہے: وہ علم جس میں عقائد کو بیان کیا جائے، یہ بحث کی جائے کہ کن نظریات وخیالات کا دل میں بسانا جائز ہے اور کن کا نہیں، کن پر ایمان موقوف ہے اور کن کی وجہ سے کفر کا حکم لگتا ہے۔

انسانی کردار اور اس کے اعمال واحوال کے حق میں عقیدہ کی بڑی اہمیت ہے، عقیدہ ہی انسان کا مقصد زندگی متعین کرتا ہے، جو انسان عقیدہ سے خالی ہو اس کا کوئی مقصد زندگی نہیں ہوتا، بلکہ وہ شتر بے مہار ہوتا ہے، دنیا کی بڑی سی بڑی طاقتیں جو کام کسی انسان سے نہیں کرا سکتیں عقیدہ وہ کام اس انسان سے لے لیتا ہے، یہ عقیدہ کا ہی کرشمہ ہے کہ اسلام کے اولین پیروکار ہزار ہا دشمنوں اور صدہا مصائب کے بیچ حق پر جمے رہے اور میدان میں تعداد کی کمی اور بے سروسامانی کے باجود مسلمانوں کے پائے ثبوت نے لغزش نہیں کھائی۔

''عقائد'' انسان کے وہ نظریات کہلاتے ہیں جن کو وہ ادنیٰ سے شک کے بغیر اپنے دل میں بٹھاتا و بساتا ہے، شریعت کی نگاہ میں عقائد وہ تمام امور ہیں جن کی دل سے تصدیق ویقین کے بغیر انسان مومن نہیں کہلاتا، البتہ اس تصدیق ویقین کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، ایک مرحلہ تو یہ ہوتا ہے کہ محض سن سنا کر، ماحول کی بناء پر کسی چیز کو مان لیا جائے اور ایک یہ کہ حقائق کا علم باقاعدہ حاصل کر کے یقین پیدا کیا جائے اور پھر غور وفکر میں برابر مشغول رہ کر، نیز عبادات میں مصروف رہ کر اس یقین کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے اور پختہ کیا جائے۔

شرعی عقائد کا مدار صرف قرآن وحدیث پر ہے، جس چیز کو ان دونوں میں بطور عقیدہ ذکر کیا گیا ہے اسی کو ''اسلامی عقیدہ'' کہا جا سکتا ہے، محض عقل وقیاس سے کسی عقیدہ کا اضافہ

نہیں کیا جا سکتا، البتہ قرآن وحدیث سے ثابت عقائد پر پختگی حاصل کرنے میں عقل سے مدد ضرور لی جا سکتی ہے، بلکہ لی جائیگی، اس لئے کہ اس کی دعوت خود قرآن نے دی ہے، یہی وجہ ہے کہ جگہ بجگہ غور وفکر کا حکم دیا ہے، اس پر توجہ دلائی ہے، قدرت کے کسی کارنامے پر غور وفکر کے بغیر گذر جانے کی مذمت کی ہے، صاف فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل حق کیلئے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کے نفع کی چیزیں لے کر تر و تازہ کیا اس کے خشک ہونے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید رہتا ہے دلائل ہیں ان لوگوں

کیلئے جو عقل رکھتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ: ١٦٤

لیکن یہ دعوت صرف اس حد تک ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی جو بے شمار مخلوقات اور اس کی قدرت کے لاتعداد کرشمے موجود ہیں ان کا مطالعہ کر کے، ان پر غور و فکر کے ذریعہ ان کے بنانے والے کی صناعی و کاریگری کا اندازہ کیا جائے اور پھر اس راستے سے اس ذات بے مثال یعنی خداوند قدوس کی عظمت و قدرت کا سکہ اپنے دل میں بٹھایا جائے، یہ مطلب نہیں کہ ہر چیز کو عقل ہی سے سمجھا جائے اور اسی کے فیصلوں کو سند بنایا جائے، ورنہ تو نوبت وہ آئے گی جسے ایک حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''لوگ آپس میں ایک دوسرے سے سوال و جواب کے طور پر کہیں گے کہ اس کو اللہ نے پیدا کیا، اُس کو اللہ نے پیدا کیا تو آخر اللہ کو کس نے پیدا کیا''؟ نعوذ باللہ۔

بعض حضرات نے اسلامی عقائد کے اصولی چار حصے قرار دیئے ہیں:

۱. الٰہیات: یعنی خداوند قدوس کی بابت عقائد۔
۲. نبوات: یعنی عقائد بابت حضرات انبیاء اور ان کے واسطے سے ان کے اتباع سے متعلق۔
۳. روحانیت: یعنی عقائد باب عالم غیر مادی مثلاً عالم ملائکہ و عالم ارواح وغیرہ۔
۴. سمعیات: یعنی عقائد بابت مابعد الموت۔

الٰہیات:

الٰہیات کے تحت اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اور اسماء و صفات سے متعلق بحث کی جاتی ہے؛ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱. جس طرح ایک انسان دوسرے انسان یا دنیوی چیزوں میں سے کسی چیز کی ذات و حقیقت سے واقف ہوا کرتا ہے، اسی طرح کا علم اللہ کی ذات سے متعلق نہ آج تک

کسی کو ہوا، نہ آئندہ ہو سکے گا، ساری دنیا کے علوم یکجا ہو جائیں اور ساری عقلیں اکٹھا ہو جائیں تو بھی اس کی ذات تک رسائی ممکن نہیں، جب دنیا کی بہت سی چیزوں کی حقیقت اب تک انسان نہیں جان سکا، جب کہ برابر تحقیقات میں لگا ہے، تو اس کی ذات کا معاملہ تو بہت بڑا ہے، اس کی ذات و حقیقت میں غور و فکر کی نہ اجازت ہے، نہ گنجائش، اس لئے کہ یہ چیز بجائے راہ یاب کرنے کے گمراہی کا باعث بن جائیگی۔

۲. اللہ کے نام بڑی تعداد میں ہیں، حتیٰ کہ ابوبکر ابن عربی نے تو بعض اہل علم سے ایک ہزار کی تعداد نقل کی ہے، یہ متعدد نام دراصل اس کی صفات کے پیش نظر ہیں اور یہی اس کی صفات کے مظہر ہیں، مشہور تعداد ۹۹ منقول ہے جو ایک حدیث میں یکجا ہی حضورؐ سے منقول ہیں اور وہی طغروں وغیرہ میں شائع کئے جاتے ہیں، اللہ کے علاوہ دوسرے چند اسماء ہیں: رَحْمٰن، رَحِیْم، خَالِق، بَارِی، غَفَّار قَهَّار، وَهَّاب، رَزَّاق، عَلِیْم، غَفُوْر، حَمِیْد، مَجِیْد، حَکِیْم، حَلِیْم تَوَّاب، رَؤُوْف، نَافِع، ضَارّ، هَادِی، حَیّ، قَیُّوْم باقی ان میں بڑی خیر و برکت، ان کے ذکر میں بڑا ثواب اور ورد میں روحانی فائدہ ہے اور ہر ایک کی الگ الگ بھی خاصیتیں ہیں، جن کی بناء پر ان سے مخصوص فائدے حاصل ہوتے ہیں، البتہ یہ ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی نام اپنی طرف سے نہیں تجویز کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہی نام استعمال ہو سکتے ہیں جو قرآن و حدیث میں منقول ہیں۔

۳. اس کی صفات بے حد و بے حساب ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے نام بڑی تعداد میں ہیں، انہیں اسماء سے ان کی صفات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جیسے کہ کائنات میں بکھری ہوئی اس کی قدرت کی نشانیوں سے اس کی صفات کو سمجھا جا سکتا ہے، قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی اہم صفات کا تذکرہ کیا ہے۔

مثلاً ''ایجاد'' (وجود بخشا، پیدا کرنا)، ''حیات وبقاء'' (ہمیشہ سے ہونا اور ہمیشہ رہنا)، ''سمع وبصر'' (سننا و دیکھنا)، ''کلام'' (بات کرنا)، ''قدرت وارادہ'' (کہ جو چاہے کرے)، ''علم'' (ہر چیز کا علم رکھنا خواہ کتنی ہی چھوٹی و معمولی ہو اور کسی زمانے کی ہو اور کیسی ہی پوشیدہ جگہ میں، سیکڑوں پردوں کے اندر ہو)، ''رزق'' (روزی دینا)، ''وحدانیت'' (تن تنہا سارے نظام کائنات کو چلانا)، ''استغناء'' (اپنے نظام کو چلانے اور مطلوبہ کام کے کرنے میں ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہونا)۔

البتہ صفات کے سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ بہت سی صفات ایسی ہیں کہ جن کا استعمال بندوں کیلئے بھی ہوتا ہے، جیسے بہت سے افعال کا یہی معاملہ ہے، بندوں کے حق میں اس کا مفہوم علاحدہ اور اللہ تعالیٰ کے حق میں علاحدہ ہوتا ہے، مثلاً ''ناراض ہونا، خوش ہونا''، قرآن مجید میں ''حیاء کرنے'' کا ذکر آیا ہے، تو جیسے اس کے ''سننے، دیکھنے، بات کرنے'' وغیرہ کا مفہوم وہ نہیں ہے جو ہمارے ''سننے، دیکھنے و بات کرنے'' کا ہے کہ ہم ان کاموں کیلئے ''کان، آنکھ اور منھ و زبان'' وغیرہ کے محتاج ہیں اور وہ ان چیزوں کا محتاج نہیں، ایسے ہی اس کے ''ناراض ہونے'' کا مطلب: ''سزا دینا''، ''خوش ہونے'' کا مطلب: ''انعام واکرام کی بارش کرنا''، ''حیاء کرنے'' کا مطلب: ''کسی کام سے رکنا اور اس کو نہ کرنا'' ہے۔

نبوات:

نبوات وانبیاء سے متعلق نیز روحانیت ملائکہ (فرشتوں) اور ان کے نظام نیز وحی سے متعلق اور ''سمعیات'' یعنی موت کے بعد حالات: برزخ، قیامت، جنت ودوزخ سے متعلق تفصیلات ابتدائی اوراق میں گذر چکی ہیں۔

کلامی مذاہب

اختلاف وگروہ بندی سے کوئی جماعت خالی نہیں رہی، لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد فیض نبوت کا عہد تھا، اس لئے امت میں کسی کجی کے پیدا ہونے اور اگر کہیں کسی میں پیدا ہو تو اس کے برقرار رہنے کا سوال نہیں تھا، حضرات صحابہؓ کا معاملہ یہ تھا کہ اتمام عمل کی بناء پر اعمال کے بارے میں زیادہ پوچھتے اور عقائد میں جو کچھ، جس انداز پر بتا دیا گیا تھا؛ بس اسی انداز پر اس کو دل میں بٹھا لیتے، زیادہ کھود کرید نہیں کرتے تھے، قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات نیز حضرات انبیاء کی عظمت شان اور برزخ و آخرت سے متعلق جو کچھ جس انداز پر بتا دیا گیا بغیر کسی ادنیٰ تردد کے اس کو مان لیا، حضورؐ کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ کا یہی مزاج وشان رہی اور ان سے تعلق رکھنے والے اکثر افراد کا بھی یہی معاملہ رہا۔

مگر ایک تو حضورؐ کی وفات کی وجہ سے فیضان نبوت کا چراغ گل ہو چکا تھا، دوسرے مختلف ذہن ومزاج کے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے، بہت سے لوگ اغراض فاسدہ کا شکار ہو گئے، بعض کو دشمنان اسلام نے اسلام کی قوت کو زک پہنچانے کیلئے اپنا آلۂ کار بنا لیا، اس لئے جہاں عمل وانتظام کے اعتبار سے بہت اختلافات وفتنے سامنے آئے، نظریات میں بھی اختلاف پیدا ہوا اور اعتقادات کا بھی رخ بدلا، اب نہ تو حضرات صحابہؓ کی سادہ لوحی رہ گئی تھی، نہ ہی عقلیات سے احتیاط ودوری، نتیجہ یہ ہوا کہ محض شر وفساد کی نیت سے اور کبھی اخلاص کے ساتھ عقائد کے حق میں کھود کرید کا مزاج پیدا ہوا اور اس میں قرآن وحدیث کی اصل روح یعنی بغیر چون وچرا ''اطاعت وسرنگوں ہونے'' کا بھی لحاظ وخیال نہیں کیا گیا اور نہ ہی اصول شرع کی رعایت رکھی گئی، نتیجۃً عقائد کے اعتبار سے مسلمانوں میں متعدد گروہ

پیدا ہوگئے اور ہوتے رہے اور یوں حضورؐ کی یہ پیشینگوئی پوری ہو کر رہی کہ ''ایک وقت آنے پر میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائیگی''، اس میں پیش پیش وہی جماعتیں رہیں جن پر عقل کا غلبہ تھا اور ہر چیز کو از روئے عقل سمجھنا ضروری گردانتی تھیں، جیسے عصر حاضر میں یورپ، بلکہ دنیا کے اکثر متمدن ممالک کا حال ہے، نیز وہ قومیں بھی پیش پیش رہیں جو شرک وبت پرستی نیز اپنے بڑوں کے متعلق غلو آمیز عقیدت کا شکار تھیں، انہوں نے اپنے سابقہ نظریات وغلو آمیز عقائد کو اسلامی عقائد کے جامہ میں ڈھال لیا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حق ان مختلف گروہوں میں بٹ کر چھپ گیا اور کوئی گروہ ایسا نہیں رہ گیا جسے بے تکلف ''اہل حق'' کہا جاسکے، بلکہ ایک گروہ ہر دور میں حق کا علمبردار رہا اور اس نے حسب موقع وصلاحیت حق کے کلمہ وجھنڈے کو سربلند کرنے کی کوشش کی، بلکہ رکھا اور کیوں نہ ہوتا جب کہ حضورؐ کی یہ بھی پیشن گوئی ساتھ ہی میں منقول ہے کہ: ''ایک گروہ ان میں اہل حق کا ہوگا''، آپؐ سے یہ بھی منقول ہے ''پوری امت کبھی کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی'' اور آپؐ کا یہ ارشاد بھی مشہور ومعروف ہے کہ ''میری امت کا ایک گروہ ہر عہد وزمانے میں حق پر ہوگا اور حق کو قائم کرنے والا اور اس کیلئے ہر ممکن جدوجہد کرنے والا ہوگا''۔

اسی لئے اصولی طور پر سارے فرقے دو حصوں میں منقسم مانے گئے ہیں: ایک: ''اہل السنۃ والجماعۃ''، دوسرے: ''ان کے بالمقابل''، حدیث پاک میں ان کی تعداد ۷۲ آئی ہے، اصولاً یہ وہ جماعتیں ہیں جنہوں نے قرآن وسنت کی سادہ تعلیم اور حضرات صحابہؓ کی تعلیمات وارشادات کے خلاف کسی نظریہ واصول کو اپنایا، ان کے سلسلہ میں پہلے تو چند اصولی چیزیں ذہن نشین کرلیں، پھر ان کے متعلق تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱. ''اہل حق'' اور دوسروں کا اختلاف یہ نہیں ہے کہ ایمان کے ثبوت کے لئے جن چیزوں کی تصدیق ویقین ضروری ہے، اہل حق ان کو مانتے ہیں اور دوسرے فرقے ان کے منکر ہیں، اس لئے کہ ان کو مانے بغیر تو کوئی انسان مومن نہیں قرار پاسکتا،

اسی لئے جن افراد یا جماعتوں نے اسلام کو قبول کرنے کے بعد ایسی کسی چیز کا انکار کیا وہ مرتد اور اسلام سے خارج قرار پائے، مثلاً حضورؐ کی آمد کے بعد کسی دوسرے کو نبی ماننا، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو نظام کائنات کے چلانے میں شریک ودخیل ماننا، یا ملائکہ، جنت ودوزخ اور حشر ونشر وآخرت وغیرہ میں سے کسی کے وجود کا قطعاً انکار کرنا۔

۲. اہل السنۃ کے بالمقابل وہی فرقے قرار پائے ہیں جنہوں نے قرآن وسنت کی سادہ تعلیم اور حضرات صحابہؓ کی تعلیمات وارشادات کے خلاف کسی نظریہ واصول کو اپنایا ہے اور اس نظریہ وتائید کیلئے وہ قرآن وسنت کے دلائل بھی پیش کرتے ہیں، اگرچہ شرعاً ان دلائل سے اپنے عقائد کے حق میں ان کا استدلال صحیح نہیں ہے جیسے بعض آیات واحادیث میں آیا ہے کہ: ''جو آدمی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرلے وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں جائیگا؛ اگرچہ مومن ہو'' جبکہ دوسری آیات وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جانے کیلئے صرف ایمان ضروری وکافی ہے، چاہے اس کے ساتھ اعمال بالکل نہ ہوں یا برے کیوں نہ ہوں، اس لئے اہل السنۃ کہتے ہیں: ''پہلی آیات کا مقصد سختی کے ساتھ ان گناہوں سے روکنا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں آدمی گناہ کرتے کرتے کفر تک پہنچ جائے''، ورنہ مومن ہمیشہ کیلئے جہنم میں نہیں جائیگا، کچھ عرصہ کی سزا کے بعد نکال لیا جائے گا اور بعض فرق ضالہ نے پہلی آیات کی وجہ سے مومن کو ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہنے کا مستحق بتایا

۳. فرقہ ضالہ کی بابت حکم یہ ہے کہ اگر یہ امید ہو کہ وہ کچھ بات سنیں گے اور ان کی کچھ اصلاح کی جاسکے گی تو ان سے ربط رکھا جائے ورنہ ان سے کنارہ کشی اختیار کی جائے ان کی مجلسوں اور کتابوں سے پرہیز کیا جائے۔

حدیث کی تصریح کے مطابق ایسے فرقوں کی تعداد ۷۲ ہے، لیکن چودہ سو سالہ اسلامی

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضورؐ کی وفات سے لے کراب تک یہ بڑی تعداد میں ہو چکے ہیں اور ان کے ظہور کا سلسلہ برابر جاری ہے، اس لئے اس حدیث سے بظاہر یا تو محض کثرت تعداد مراد ہے یا کسی ایک زمانے کے فرقے یا اہم واصولی اختلاف رکھنے والے، اس لئے کہ معمولی اور دو ایک باتوں میں اختلاف کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی اور کئی فرقوں میں ذیلی بہت سی شاخیں ہوئی ہیں، یوں تو اپنے وقت وعہد اور علاقے میں ہر ہر فرقہ کا چرچا رہا، لیکن عموماً یہ فرقے ایک خاص وقت تک رہ کر ناپید ہو گئے، بعض ایسے فرقے بھی ہیں کہ جو آج تک باقی ہیں، جیسے خوارج وروافض یا یہ کہ اسلامی تاریخ میں ان کو خاص شہرت واہمیت حاصل ہے، مثلاً خوارج ومعتزلہ وغیرہ۔

خوارج:

خوارج کا امتیاز یہ ہے کہ یہ حضرت علیؓ سے بغض ونفرت میں تمام حدوں کو تجاوز کر کے ان کو کافر کہتے ہیں اور نہ صرف ان کو بلکہ حضرت عثمانؓ وحضرت معاویہؓ اور ان سب کے حامی وہمنوا صحابہؓ کو بھی، ان کا ظہور حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے درمیان ہونے والی مشہور ''جنگ صفین'' کے موقع پر ہوا، اس جنگ میں صلح کیلئے حکم کی جو تجویز اختیار کی گئی، اس سے برہم ہو کر اپنی ایک جماعت بنا ڈالی اور پھر مدتوں اہل حق سے جنگ کرتے رہے، ان کا خصوصی امتیاز یہ رہا کہ ان کے اندر عمل کا اہتمام بہت تھا، یہی وجہ ہے کہ جنگوں میں شہادت کے شوق میں بڑی بے جگری سے لڑتے تھے اور ان سے مقابلہ آسان نہ ہوتا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مومن ہونے اور جنت میں جانے کیلئے عمل کو ضروری کہتے ہیں اور جو عمل نہ کرے؛ حرام چیزوں کا ارتکاب کرے، فرائض کو چھوڑے اسے ''کافر'' کہتے ہیں، ان کی بہت سی شاخیں ہوئیں، جن میں بعض تو نہایت غلو میں مبتلا تھیں حتیٰ کہ ان کو کافر قرار دیا گیا ہے، ان کا معتدل فرقہ ''اباضیہ'' رہا اور یہی آج بھی باقی ہے اور افریقہ کے بعض

علاقوں میں نیز عُمان میں آباد ہے، ان کی بھی اپنی مستقل فقہ ہے اور ممتاز علماء ہیں۔

معتزلہ:

معتزلہ کا وجود بھی اکابر صحابہؓ کے بعد لیکن عہد صحابہؓ میں ہی ہوا، اس فرقہ کا بانی مبانی ''واصل بن عطاء'' تھا؛ جو حضرت حسن بصریؒ کا ہم نشین تھا، مگر گناہ کبیرہ کے مرتکب کی سزا کے مسئلہ میں اختلاف کر کے ان سے علاحدہ ہوا اور پھر اپنی ایک جماعت بنالی، جس کا عہد عباسی میں خاص طور سے دور دورہ رہا اور اہل علم کے درمیان ہر عہد میں اس کا چرچہ رہا، اس لئے کہ انہوں نے علوم اسلامیہ اور خاص طور سے عقل سے تعلق رکھنے والے علوم سے بڑی دلچسپی لی، ایسی کتابیں لکھیں جو آج تک شہرۂ آفاق اور اپنے اپنے موضوع پر نہایت محقق و بے مثال سمجھی جاتی ہیں اور اسلامی فرقوں میں ان کا یہ خاص امتیاز ہے کہ ہر چیز کو از روئے عقل سمجھنا چاہتے ہیں اور عقل کے فیصلے کو ہی سب کچھ گردانتے ہیں، حتیٰ کہ انسانی عقلوں کے فیصلے کی پابندی اللہ کے حق میں ضروری کہتے ہیں، گناہ کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے باہر کہتے ہیں اور جن چیزوں کو ان کی عقلیں اس طریقے پر نہیں مانتیں جیسا کہ اہل السنۃ ان کو مانتے ہیں؛ تو یا تو ان کا انکار کرتے ہیں یا ان میں تاویل کرتے ہیں، ''عقل'' کو کثرت سے آلۂ کار بنانے کی بناء پر بحث ومباحثہ اور مناظرہ میں ان کو امتیاز رہا، کہا جاتا ہے کہ: علم کلام کا باقاعدہ وجود دراصل انہیں کے مناظرات کی وجہ سے ہوا؛ جو انہوں نے اہل حق یا اپنے مخالف فرقوں سے کئے اپنے دور ودورہ کے عہد میں، اسی وجہ سے کسی دوسرے فرقہ کو ابھرنے کا موقع نہ دیا اور یہی وہ فرقہ ہے جس نے مرکزی اسلامی سلطنت تک کو مسخر کر لیا تھا، عہد عباسی کے کئی خلفاء اس سے حد سے زیادہ متاثر رہے، اسی فرقہ کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور اُن کی آراء کی مخالفت کرنے والے اکابر اہل حق علماء حتیٰ کہ امام احمد بن حنبلؒ جیسے امام اہل اسلام کو سخت سزائیں دیں، یہ فرقہ صدیوں پہلے ناپید ہو چکا ہے۔

روافض:

روافض کا وجود حضرت عمرؓ کے عہد میں عبداللہ بن سبا یہودی کی زیر قیادت ہوا اور اس فرقہ نے روز اول سے مسلمانوں کے درمیان انتشار اور اسلامی حکومت میں خلفشار پیدا کرنے کا کام کیا، پہلی صدی ہجری کے متعدد واہم فتنوں میں اصلاً انہیں کا ہاتھ رہا، ان کا امتیاز حضرت علیؓ سے حد درجہ محبت و تعلق ہے، جو ان کے ایک فرقہ ''زیدیہ'' میں تو صرف اس حد تک ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو تمام صحابہؓ سے افضل قرار دیتے ہیں اور باقی کا تعلق اس حد سے آگے ہے، حتیٰ کہ بعض کے اندر غلو کی تمام حدوں سے تجاوز کر کے حضرت علیؓ کو نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل اور اصل نبی آخر الزماں قرار دینے کی بات ہے بلکہ ان کو مظہر خدا و خدا تک قرار دیا جاتا ہے، ایسا کہنے والے آج بھی موجود ہیں اور اِسی غلو کی وجہ سے روافض چند کے علاوہ تمام صحابہؓ کو مرتد قرار دیتے ہیں، اس وقت ان کے بہت سے فرقوں میں ''زیدیہ'' یمن میں پایا جاتا ہے اور باقی اکثر روافض کا فرقہ امامیہ کی دسیوں شاخوں میں سے دو وسیع اور اہم شاخوں ''اثناعشریہ'' اور ''اسماعیلیہ'' سے تعلق ہے، عصر حاضر کا فرقہ ''بہائیہ'' بھی اصلاً اُن سے ہی تعلق رکھتا ہے، زیدیہ اور اثناعشریہ دونوں کے مستقل فقہی مذاہب ہیں۔

اہل السنۃ والجماعۃ:

علماء حقہ کو اختیار کرنے والا گروہ ہر عہد میں ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کہلایا، اس گروہ کا یہ لقب و نام اس مشہور ارشاد نبوی کی بناء پر جس میں مذکور ہے کہ: ''اہل حق کا گروہ وہ ہوگا جو اس چیز پر ہو جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں'' یعنی جو سنت اور جماعت صحابہ کو اپنانے والا ہو، اہل سنت کا امتیاز تمام صحابہ کرامؓ سے محبت و تعلق اور ان پر اعتماد ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ سے منقول دین کی تفصیل و تشریح پر ایمان و عمل ہے، مشہور گمراہ فرقہ معتزلہ نے تمام اسلامی فرقوں سے مناظرہ کا جو بازار گرم کر رکھا تھا، جب کافی عرصہ کے بعد اس کا زور ٹوٹا اور حکومت وقت نے اہل حق کو ہی اپنی نصرت وحمایت کا مستحق سمجھا تو اہل حق نے پوری ذمہ داری کے ساتھ تمام فرقوں و فتنوں کو سامنے رکھ کر کلامی مسائل کی تحقیق کے کام کو انجام دیا اور اس کام میں امام ابوالحسن اشعری اور امام ابومنصور ماتریدی نے نمایاں حصہ لیا، ان سے پہلے حضرات ائمہ اربعہ وغیرہ بالخصوص امام ابوحنیفہؒ و امام احمدؒ بہت کچھ کام کر گئے تھے، البتہ چونکہ امام اشعری و امام ماتریدی وغیرہ کے انداز فکر اور طریق بحث و تحقیق میں ہر ایک کے مخصوص ماحول و مزاج کی وجہ سے کچھ فرق تھا، اس لئے بعد میں اہل سنت و جماعت کے تین مکاتب فکر سامنے آئے، ایک اشاعرہ کا، دوسرا ماتریدیہ کا اور تیسرا سلفیہ کا، سارے اہل حق انہیں تینوں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے ہیں، تینوں مکاتب قرآن وسنت نبویہ اور سنن صحابہ کے پابند اور باہم کسی قدر اختلاف کے ساتھ عقل و شرع دونوں سے استدلال کرتے ہیں، اگرچہ بڑی تعداد میں امت کے خواص و عوام کا تعلق زیادہ تر پہلے دو مکاتب فکر سے رہا ہے۔

اشاعرہ:

اشاعرہ کے مقتدا: امام ابوالحسن اشعری ہیں، جنکی ولادت: ۲۶۰ھ بمقام بصرہ میں

ہوئی اور وفات سنہ ۳۳۰ھ کے بعد ہوئی، معتزلہ سے علم حاصل کیا، خاص طور سے ان کے ایک ممتاز عالم وامام ابوعلی جُبائی سے اور اپنی صلاحیت واستعداد کی وجہ سے بسااوقات بحث و مباحثہ میں اپنے استاذ کی نیابت بھی کرتے تھے، مگر اللہ نے ہدایت نصیب فرمائی تو ان سے کنارہ کش ہوگئے اور مدتوں تنہائی میں رہ کر اہل حق اور معتزلہ دونوں کے مسائل ودلائل کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا اور شرح صدر وقلبی اطمینان حاصل کرنے کے بعد عوام کے سامنے میدان میں آئے اور ڈنکے کی چوٹ پر حق کا اعلان کیا، جمعہ کے دن جامع مسجد بصرہ میں اپنی توبہ اور معتزلہ کے رد کیلئے میدان میں آنے کا اعلان کیا اور ایک کتاب ''الإبانۃ'' نامی تصنیف فرمائی، اس وقت جو اختلافی مباحث جاری تھے ان میں اعتدال کو اپنایا اور سلف صالحین حضرات صحابہؓ وتابعین کے مسلک کو پورے طور پر اختیار فرمایا، معتزلہ کا پورا پورا رد کیا اور چونکہ اب ان کا زور ٹوٹ چکا تھا اور یہ معتزلہ کے ہی پروردہ و پرداختہ تھے، فرق ضالہ کے رد کے اصولوں سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ وقت کے دوسرے فرقہ ضالہ پر سخت رد کیا، عام علماء وعوام ان سے مانوس ہوئے اور علماء نے غایت اکرام واحترام کے طور پر ان کو ''امام اہل السنۃ والجماعۃ'' کا لقب دیا اور ان کی حیات میں اور اس کے بعد بھی ممتاز علماء وقت نے ان کے مسلک ونظریات کی تقویت واشاعت میں حصہ لیا، مثلاً ابوبکر باقلانی، امام غزالی، بیضاوی، سید شریف جرجانی وغیرہ۔

ماتریدیہ:

ماتریدیہ کے مقتدا: محمد بن محمود ابومنصور ماتریدیؒ ہیں، جو سمرقند کے ایک محلہ ''ماترید'' میں پیدا ہوئے اور سنہ ۳۳۳ھ میں وفات پائی، یہی وہ زمانہ تھا جس میں معتزلہ زوال کا شکار ہوئے، علم اپنے علاقے کے حنفی علماء سے حاصل کیا اور خاص طور پر یحییٰ بلخی حنفی سے، ان کا علاقہ ''فقہ'' کی تدوین کا خاص علاقہ تھا، اس میں فقہی مناظرے گرم رہتے تھے، معتزلہ کا زور ہونے پر اس علاقے میں بھی کلامی مسائل چھڑے، اسی ماحول میں امام ابومنصور نے

نشوونما پائی، لہٰذا اسی کے مناسب مزاج پایا اور فقہ وکلام دونوں میں مناظرے کئے، یہی زمانہ امام اشعریؒ کا بھی ہے، دونوں حضرات ایک دوسرے سے ربط کے بغیر اپنے کام میں مصروف رہے، اکثر مسائل میں نتائج کی حد تک دونوں کا اتفاق رہا، لیکن انداز فکر ہر ایک کا مختلف تھا، اسی لئے بعض مسائل میں اختلاف بھی ہوا اور اسی انداز فکر اور بعض مسائل کے اختلاف کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے امتیاز حاصل ہے، کہا جاتا ہے کہ: ''امام ابومنصور صرف فقہ میں ہی حنفی نہ تھے، بلکہ کلام میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے اصول ونظریات کے پابند تھے'' اس لئے کہ امام صاحب اس میدان میں بھی امام تھے، چنانچہ ان کا شہرۂ آفاق رسالہ ''الفقہ الأکبر'' اسی موضوع سے متعلق ہے اور اس موضوع سے متعلق نیز امام صاحبؒ کی تصنیف ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور امام ابومنصور کے علاقے میں امام صاحبؒ کے اصول ہی رائج تھے، اس لئے انہوں نے انہیں اصول پر کام کیا، انہیں کی تحصیل کی، انہیں کی تقویت کی اور انہیں کی تالیف وتشریح میں کتابیں لکھیں، مثلاً کتاب تاویل القرآن، کتاب مآخذ الشرائع، کتاب الجدل، کتاب الاصول وغیرہ، گویا انہوں نے کلام میں حنفی مذہب کی تجدید کی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارے حنفی کلام میں ماتریدی ہیں، بلکہ جو علاقہ امام اشعری کے کارومحنت کا رہا جیسے عراق، وہاں کے احناف اشعری تھے، جیسے ماتریدی مسلک کو دوسری فقہ کے بعض علماء نے بھی اختیار کیا ہے، بہرحال اہل حق میں اب تک عموماً یہی دونوں مسلک رائج ہیں۔

سلفیہ:

اہل حق کا تیسرا مکتب فکر ''سلفیہ'' کا ہے، اس لفظ کی نسبت ''سلف'' کی طرف ہے، جس کے معنی گذشتہ لوگ اور پہلے گذرے ہوئے لوگ کے ہیں، اس کو یہ عنوان اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کے ماننے والوں نے اس کو ہی حضرات صحابہؓ وتابعین اور ان کے محتاط علماء کی رائے کے مطابق قرار دیا ہے، اس کے ظہور اور کسی قدر فروغ کا زمانہ بھی چوتھی صدی

ہجری کا ہے، جس کے اوائل میں امام اشعریؒ اور امام ماتریدیؒ اپنا اپنا کام کر کے وفات پا چکے تھے، ائمہ میں اس کی نسبت امام احمد حنبلؒ کی طرف کی جاتی ہے، چوتھی صدی ہجری کے بعد اس مکتب فکر کی زوردار نمائندگی اور اس کی تقویت واشاعت کا کام ابن تیمیہؒ م ۷۲۸ھ نے کیا اور تیسرے مرحلہ میں شیخ محمد بن عبدالوہاب م ۱۲۰۶ھ کے بدست اسے کافی فروغ و ترقی حاصل ہوئی اور اس وقت کی سعودی حکومت گویا انہیں کی حکومت ہے، ہندو پاک کے اہل حدیث حضرات نیز بعض عرب ممالک کے کافی لوگ اس مسلک کی طرف اپنی نسبت کو پسند کرتے ہیں، یہ اشاعرہ وماتریدیہ کے بیچ کا ایک درمیانہ مکتب فکر ہے، جو دونوں کے بعض نظریات سے مرکب ہے اور بعض سے اختلاف کرتا ہے، اس کا امتیاز یہ ہے کہ عقائد کی بابت قرآن وحدیث کی نصوص کو معروف لغوی مفہوم پر محمول کرتے ہوئے ان کے ظاہر پر چھوڑ دیا جائے، نہ تو ان میں تاویل کی جائے اور نہ ایسی کسی چیز کا اعتقاد کیا جائے جو ذات باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہ ہو۔

آج کل ''العقیدۃ الطحاویۃ'' اور ''شرح العقیدۃ الطحاویۃ'' کے نام سے دو کتابیں عالمی سطح پر عام، مقبول وپسندیدہ ہیں بلکہ داخل نصاب بھی ہیں۔

العقیدۃ الطحاویۃ:

یہ اہل حق کے عقائد کے بیان میں بہت ہی مختصر سا رسالہ ہے، جس کے مصنف تیسری صدی ہجری کے مشہور محدث وحنفی فقیہ ومجتہد امام طحاوی (احمد بن محمد) ہیں، انہوں نے اس کے آغاز میں صراحت کی ہے کہ کتاب میں مذکور عقائد امام ابوحنیفہ وابو یوسف ومحمد رحمہم اللہ وغیرہ کے عقائد ہیں۔

اور اس کی مشہور ومعروف شرح ابن ابی العز حنفی کی ہے، جو اصل کتاب نیز سلف صالحین کے ذوق ومزاج کے مطابق ہے، اس کے کئی نسخے وایڈیشن رائج ہیں۔

علم فقہ

فقہ کے لغوی معنی ہیں: سمجھنا وجاننا، اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ اعمال کے شرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جانا جائے، اس علم کے ساتھ ایک دوسرا علم ملحق ہے؛ وہ ہے ان اصول کا علم جن کی روشنی میں کسی دلیل سے کوئی حکم معلوم کیا جاتا ہے، اس علم کو ''اصول فقہ'' کہتے ہیں۔

اسی علم کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اعمال کے احکام بیان کئے جاتے ہیں، اسلامی عبادات کی بھی بحث آتی ہے کہ کون سی عبادت کس پر کب لازم آتی ہے، کس عبادت کے کتنے اور کیا کیا اجزاء ہیں، ان کی کیا حیثیت ہے، کن چیزوں کی بناء پر وہ عبادات ناقص یا غیر معتبر قرار پاتی ہیں، کون سے اعمال اسلامی نقطۂ نظر سے جرم ہیں اور ان کا بحیثیت جرم کیا مرتبہ وسزا ہے، ساتھ ہی معاشرتی زندگی کے تمام پہلو، ہر قسم کے لین دین ومعاملات کی صورتیں زیر بحث آتی ہیں، روزہ، حج، زکاۃ، نکاح وطلاق، چوری وڈکیتی، شراب خوری وحرام کاری، خرید وفروخت، کرایہ داری وعاریت، ہدیہ ومیراث، شرکت و بٹائی وغیرہ تمام عبادات وانسانی معاملات کی شرعی تفصیلات آپ اس علم کے تحت معلوم کر سکتے ہیں، حاصل یہ کہ اسلام چونکہ ایک جامع نظام اور مکمل دستور حیات ہے، اس لئے اس کے تحت اس علم کو بھی نہایت وسعت وعظمت حاصل ہے اور انسانی زندگی کا کوئی عملی پہلو اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔

عہد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مدار تھے، صحابہؓ آپؐ سے ہی پوچھتے اور آپؐ سے جواب ملتا، وہ نہایت سادہ ہوتا کہ فلاں کام کرلو، یا نہ کرو، یا ایسے کرلو، تفصیلات کہ اس کام میں کیا کیا جزء فرض وواجب ہیں اور کیا سنت ومستحب، اس کا بیان نہیں ہوتا تھا، نہ آپؐ

فرماتے، نہ صحابہؓ معلوم کرتے، اگرچہ آپؐ کی حیات میں ہی اہل علم صحابہؓ نے بھی مسائل کے بتانے کا کام شروع کر دیا تھا، کچھ آپؐ سے سن کر، کچھ اپنی صلاحیت کی بناء پر، مگر آپؐ کے بعد پورے طور پر حضرات صحابہؓ نے اور ان کے بعد حضرات تابعینؒ نے اس ذمہ داری کو سنبھالا، صحابہ میں امتیازی شان رکھنے والے حضرات خلفاء راشدین، عبداللہ بن زبیر، عبد اللہ بن عباس، عبداللہ ابن عمر، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ تھے اور یہ حضرات مختلف ملکوں میں اپنا کام انجام دے رہے تھے، لیکن مرکزی مقامات: مکہ، مدینہ اور کوفہ وشام تھے، مکہ میں ابن زبیر وابن عباس، کوفہ میں حضرت علیؓ وابن مسعود، شام میں حضرت حذیفہؓ ومعاویہؓ اور مدینہ میں متعدد اکابر صحابہؓ تھے، ان کے بعد انہیں مقامات پر ان کے خصوصی تلامذہ ان حضرات کے طریق کار کے مطابق کام کرتے رہے، مدینہ میں سعید بن مسیب، سالم بن عبداللہ بن عمر، قاسم بن محمد بن ابوبکر، مکہ میں عطاء، کوفہ میں ابراہیم نخعی، شعبی وغیرہ، بصرہ میں حسن بصریؒ، شام میں مکحول وغیرہ رحمہم اللہ۔

ان حضرات کے عہد میں کچھ تو مسائل بھی زیادہ ہو گئے اور کچھ ان حضرات نے احکام کی تفصیل بھی شروع فرما دی کہ کیا فرض ہے اور کیا سنت اور دن بدن مسائل بھی بڑھتے گئے اور یہ بحثیں بھی طول پکڑتی گئیں حتیٰ کہ آج فقہی مسائل کا ذخیرہ ہزار ہا کتب کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جب کہ بے شمار کتابیں ضائع وناپید بھی ہو چکی ہیں۔

اور اختلاف تو انسانی فطرت ہے، اس لئے ان مسائل کے بارے میں حضورؐ کے بعد سے ہی اختلافات سامنے آئے جو دن بدن بڑھتے ہی رہے، حضرات علماء نے ابتدائی زمانے میں پائے جانے والے ہر عہد کے اختلافات کے خصوصی اسباب کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے، ہاں حضرات صحابہؓ کے اختلافات کے بعض اسباب کو ضرور ذکر کیا جا رہا ہے، جو صرف انہیں میں منحصر نہیں تھے بلکہ دور تک اثر انداز

ہوئے۔

ہر صحابی کے نظر میں حضورؐ کی جملہ احادیث کا نہ ہونا، مختلف اوقات میں حضورؐ کے اقوال واعمال کا مختلف ہونا، حضورؐ کے اعمال کے محمل کی تجویز کہ سنت ہے، یا واجب ہے، یا کیا، اس میں اختلاف، حضورؐ کے قول وعمل کو پورے طور پر سمجھ نہ سکنا، تحصیل علم کی صلاحیت کا مختلف ہونا، پھر استنباط مسائل کے طریق کار کا مختلف ہونا کہ کسی نے صرف نقل کو ضروری سمجھا اور کسی نے عقل کی رو سے مسئلہ کے حل کو جائز جانا، کسی حکم کی علت کو سمجھنے میں اختلاف، سہو ونسیان اور حفظ ویادداشت کا اختلاف۔

حضرات صحابہؓ کے بعد اس قسم کے اسباب کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے اسباب رونما ہوئے، جن کی بناء پر فقہی مسائل میں اختلاف بڑھتا ہی گیا حتیٰ کہ آپ اگر تحقیق میں لگیں تو بہت سے مسائل ایسے ملیں گے کہ ان میں سے ایک ایک کی بابت دسیوں اقوال ہیں اور ہر قول کسی نہ کسی دلیل پر مبنی ہے اور شرعی حدود واصول کے مطابق ہے، اسی لئے اس اختلاف کو کبھی بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، بلکہ بنظر تحسین دیکھا گیا کہ بسا اوقات اسی اختلاف اقوال کی بدولت انسان کسی بڑی مشکل والجھن سے نجات پا لیتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقولہ ہے: ’’مجھے یہ پسند نہیں کہ حضورؐ کے صحابہ اختلاف نہ کرتے اس لئے کہ اس صورت میں لوگ بڑی تنگی میں ہوتے، وہ ساری امت کے مقتدا ہیں، ان میں سے کسی کے قول پر عمل سنت پر عمل ہے‘‘ بلکہ اکابر تابعین وعلماء محققین نے تصریح کی ہے کہ: ’’فقیہ کیلئے اختلافی مسائل کا علم بہت ضروری ہے، اس کے بغیر وہ مسائل کا صحیح حل پیش نہیں کر سکتا‘‘۔

فقہی مذاہب

گذشتہ مضمون میں یہ بات گذر چکی ہے کہ فقہی مسائل میں امت کے درمیان شدید اختلاف رہا، اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں فقہی مذاہب بھی کثیر تعداد میں پیدا ہو گئے، اگرچہ تمام کے تمام زیادہ مدت باقی نہ رہ سکے، بنیادی طور پر تمام فقہی مذاہب دو حصوں میں بایں معنی منقسم ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت نے فقہی مسائل کے استنباط واستخراج کے حق میں دو طریق کار اپنائے، یہ طریق کار حضرات صحابہؓ سے تابعین نے اور ان سے ان کے شاگردوں نے حاصل کیا اور واسطہ در واسطہ تمام علاقوں میں اور ہر عہد میں یہی دونوں طریق کار رائج رہے اور یوں بنیادی دو مکتب فکر قائم ہوئے، ایک ''اہل حدیث'' کا، دوسرے ''اہل رائے'' کا۔

یہ دونوں اس حد تک متحد ہیں کہ دونوں ہی کتاب وسنت سے احکام کو اخذ کرتے ہیں اور اجماع امت پر اعتماد کرتے ہیں۔

اس کے بعد ''اہل حدیث'' مکتب اس بات کا قائل ہے کہ کسی مسئلہ میں رائے یعنی عقلی فیصلہ وقیاس کو بدرجۂ مجبوری ہی اختیار کیا جائے، ورنہ حکم کو قرآن وسنت کے صریح الفاظ میں تلاش کیا جائے اور صریح الفاظ قرآن وحدیث سے کام نہ چل سکے تو معمولی غور و فکر سے کام لیا جائے، بہت گہرائی میں نہ اترا جائے، اس مکتب فکر کے حاملین میں یہ جذبہ اس لئے پیدا ہوا کہ انہوں نے کثیر تعداد میں روایات حدیث کو حاصل کرنے و بیان کرنے کا اہتمام کیا اور اپنے پاس روایات کا وافر ذخیرہ جمع کر لیا، لہٰذا روایات میں کفایت سمجھی اور عقل ورائے سے مدد کی ضرورت نہ سمجھی، نہ محسوس کی اور انہیں جمع کردہ روایات سے تمام مسائل کا حکم نکالا و بیان کیا۔

''اہل رائے'' کا نظریہ یہ رہا کہ حضوؐر کی طرف نسبت کم سے کم کی جائے، اس لئے کہ حضوؐر کے الفاظ کا من وعن یاد ہونا ضروری نہیں اور عین ممکن ہے کہ کسی بات کی غلط نسبت آپؐ کی طرف ہو جائے تو باعث وبال ثابت ہو، اس لئے انہوں نے روایات کا ذخیرہ بہت زیادہ بڑھانے کی فکر واہتمام نہیں کیا، لہٰذا ان کے پاس یہ ذخیرہ کم رہا، انہیں جو مسائل صریح نصوص سے مل سکے، وہ لئے اور جو نہیں ملے ان کے حق میں قیاس کیا، یعنی کتاب وسنت کے مسائل میں غور وخوض کر کے ایک ایک حکم کی علت تجویز کی اور اس کی بناء پر دوسرے پیش آمدہ معاملات کے احکام بیان کئے اور چونکہ ان کے پاس روایات کا ذخیرہ بہت کم تھا، اس لئے یہ نوبت ان کے یہاں بہت آئی اور آتی ہے، حتیٰ کہ یہ ''اہل رائے'' کہے جانے لگے، البتہ بعد کے لوگ پہلے لوگوں کے فیصلوں کو بھی دیکھتے تھے، اگر پہلوں سے کچھ منقول ہوتا تو اسی کو لے لیتے، حضرات صحابہؓ وتابعین وتبع تابعین سب کے درمیان یہ دونوں مکاتب رہے، اشخاص کے اعتبار سے یہ جان لیں کہ اکثر اہل حجاز ''اہل حدیث'' مکتب فکر اور اکثر اہل عراق ''اہل رائے'' مکتب فکر کے حامی تھے، اول کے ائمہ ومقتدا حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت انس رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں اور دوم کے حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

بعد میں قائم ہونے والے تمام فقہی مذاہب کی بنیاد انہیں دونوں طریق کار پر ہے اور چونکہ ہر طریق کار کے مطابق کام کرنے والے بڑی تعداد میں تھے، نیز معلومات اور عقل و استدلال کے اختلاف اور کمی وزیادتی کی وجہ سے ایک طریق کے پابند بھی تمام آراء میں اتفاق نہیں کرتے تھے، پھر یہ کہ ابتدائی دور میں اعلیٰ درجہ کی فقہی واجتہادی صلاحیتیں رکھنے والے بھی بہت تھے، اس لئے فقہی مذاہب بہت بڑی تعداد میں سامنے آئے، لیکن چند کے علاوہ سارے کے سارے کچھ ہی عرصہ بعد ناپید ہو گئے؛ کچھ تو اس وجہ سے کہ بانی مذہب کے علاوہ کسی دوسرے نے اس کی پیروی نہیں کی، یا کی تو معمولی تعداد میں اور کچھ اس وجہ

سے کہ ان کے تمام مسائل کو جمع نہ کیا جاسکا، ایسے مذاہب جو برابر باقی رہے، خوب پھلے پھولے اور پھیلے، وہ پورے طور پر جمع بھی کئے گئے اور مشہور بھی ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں:

ظاہری، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، زیدی، اثناعشری، اباضی، ان میں سے اولین اہل حدیث مکتب فکر کا نمائندہ ہے جو عہد حاضر میں ''اہل حدیث'' یا ''سلفی'' کے عنوان سے معروف ہیں اور باقی سب کے سب اہل رائے مکتب فکر کے مذاہب ہیں اور ان میں سے پہلے چار اہل سنت و جماعت کے ہیں اور ''زیدی'' و ''اثناعشری'' روافض کے اور ''اباضی'' خوارج کا ہے۔

اہل حق کے مذاہب کا امتیاز قرآن وسنت سے استدلال اور حضرات صحابہؓ پر اعتماد اور من گڑھت احادیث سے احتراز ہے، ظاہریہ کا امتیاز حتی الامکان آیات وروایات کے ظاہری مفہوم پر اکتفا ہے، اہل رائے کے چاروں مذاہب قرآن وحدیث واجماع کے ساتھ قیاس سے بھی استدلال پر متفق ہیں، اگرچہ بیشتر مسائل کے حق میں طریق استدلال اور نتائج میں اختلاف رکھتے ہیں، حنبلی: ہر حدیث کو لائق عمل قرار دیتے ہیں، شافعی: سب سے صحیح حدیث کو لیتے ہیں، مالکی: اہل مدینہ کے قول وعمل کو فیصلہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور حنفی قائل ہیں کہ ایک مسئلہ سے متعلق متعدد ومختلف روایات کی روح کو سمجھا جائے، پھر خواہ تمام احادیث پر عمل کیا جائے، اگر کسی صورت سے ممکن ہو اور اگر سب پر عمل کرنے کی صورت ممکن نہ ہو تو اصول وقواعد کی بنیاد پر حسب موقع کسی کو لیا جائے اور کسی کو چھوڑ دیا جائے، جیسے عقیدہ کے باب میں امت کی اکثریت اہل حق کی ہے، فقہ میں بھی یہی ہے اور چونکہ ائمہ اربعہ نے بالاتفاق قیاس کو لائق عمل قرار دیا ہے، اس لئے امت کا بڑا حصہ ہر عہد میں انہیں چاروں مذاہب کا پابند رہا ہے، اگرچہ ہر مذہب کی اکثریت کے علاقے جدا جدا ہیں، دنیا کے مشرقی علاقے تقریباً پورے کے پورے حنفی ہیں اور دوسرے اطراف کے بہت سے ممالک کے بھی لوگ بڑی تعداد میں حنفی ہیں، مشرقی مسلمانوں کا قومی مذہب یہی

رہا اور بہت سے علاقوں کا سرکاری مذہب بھی رہا، مالکی مذہب یوں تو بعض افریقی ممالک میں بھی خوب پھیلا مگر اصل عروج اس کو اندلس میں حاصل رہا، وہاں اسی کا سکہ اور اسی کی حکمرانی تھی، ان علاقوں کے علاوہ دوسرے ممالک یعنی اکثر عرب ممالک اور بعض دوسرے ممالک کے لوگ بڑی تعداد میں شافعی رہے ہیں اور ایک تعداد حنبلی المسلک ہے، خاص طور سے سعودی اکثر حنبلی ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ

امام ابوحنیفہؒ: نام: نعمان بن ثابت، کنیت: ابوحنیفہ، لقب: امام اعظم، جد امجد جو کہ ایرانی تھے مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، پھر آزاد ہوئے اور مسلمان ہو کر کوفہ منتقل ہو گئے، حضرت علیؓ سے گہرے تعلقات تھے، امام صاحب ۸۰ سنہ ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، قرآن مجید حفظ کر کے ضروری علم دین وعلم حدیث حاصل کیا، گھریلو مشغلہ تجارت تھا، آپ نے بھی معاش کیلئے اسی مشغلہ کو اپنایا اور پوری زندگی شرعی اصول کے مطابق بلکہ نہایت تقویٰ کے ساتھ تجارت کی، ذرا بھی شبہ گوارا نہ فرماتے اور آمدنی سے جہاں اپنی ضروریات پوری فرماتے، مالی وسعت کی وجہ سے آن بان سے رہتے، وہیں اہل علم وطلباء وعلماء کی بھی خوب خدمت کرتے، البتہ ایک مدت تک تو پورے طور پر اپنے کاروبار کو دیکھتے تھے، مگر جب علم کی طرف توجہ اور علمی مشاغل بڑھ گئے تو خود صرف ضروری حالات معلوم کرتے اور اصل کام نائبوں سے لیتے۔

کوفہ جو آپ کا مسکن تھا وہ اس وقت کا ایک بڑا شہر تھا، وقت کا ایک بڑا شہر بصرہ بھی تھا اور دونوں کا تعلق عراق سے تھا اور عراق اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی علم وتحقیق اور تہذیب وتمدن کا مرکز تھا، اس میں اکابر اہل علم بھی رہے اور بہت سے باطل پرست بھی، امام صاحب کا مزاج معقولی تھا، اس لئے اہل باطل سے بحث ومباحثہ اور مناظرہ سے آپ کو کافی دلچسپی تھی، بچپن سے ہی یہ مشغلہ پسند تھا، تجارت کے ساتھ بھی فارغ اوقات میں جاری رہا، ایک طرف یہ مناظرے دوسری طرف شہر کے اکابر اہل علم کے یہاں آمد ورفت اور ان سے علمی گفتگو، ان چیزوں نے آپ کی طرف علماء کی خصوصی توجہ مبذول کرائی اور انہوں نے آپ کے اندر علم کا ایک قیمتی جوہر محسوس کیا، جس کے ضیاع کو وہ برداشت نہ کر

سکے، چنانچہ امام صاحب کو اپنا علمی شغف ومشغلہ بڑھانے کی طرف توجہ دلائی، امام صاحب نے بھی اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تجارت سے اپنے تعلق کو بقدر ضرورت وابستہ کرلیا، لیکن شروع میں یہ خصوصی توجہ بھی کلامی مسائل سے متعلق رہی، اسی کی بابت اہل حق سے مذاکرہ اور اہل باطل سے مناظرہ فرماتے، کچھ عرصہ گذرنے پر شہر کی دوسری علمی دلچسپیوں پر نظر کی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی دلچسپی حضرات صحابہؓ وتابعین سے مختلف ہے کہ ان حضرات کا خصوصی شغف قرآن وحدیث اور فقہی مسائل سے تھا، اگرچہ علم ان کو ہر چیز کا تھا، یہ احساس پیدا ہونے پر امام صاحب نے بھی اپنی توجہ کا رخ پھیر دیا، حتیٰ کہ کلامی مسائل سے خود بھی صرف نظر فرمالیا اور دوسروں کو بھی منع کیا، اب صرف فقہ وحدیث کو اپنا مرکز توجہ قرار دیا، توجہ کی یکسوئی، دوسرے علوم کی پختگی اور ذاتی صلاحیت واستعداد نے علمی بصیرت ووسعت کے ایسے مرتبے پر پہنچایا کہ دنیا کو آپ کی عظمت علم وشان کے سامنے جھکنا پڑا اور دنیا نے آپ کو ''امام اعظم'' کے لقب سے جانا و پہچانا۔

آپ نے اہل رائے واہل حدیث دونوں مکاتب سے متعلق معلومات بہم پہنچائیں اور بصیرت حاصل کی، تحصیل علم کی تگ ودو کوفہ تک منحصر نہیں رکھی بلکہ سرزمین حجاز اور بالخصوص مکہ مکرمہ کے علماء سے استفادہ کیا، حتیٰ کہ آپ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار تک بتائی گئی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ چونکہ آپ کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ''اہل رائے'' مکتب فکر کے علاقے میں اور اسی مکتب فکر کے علماء یعنی حضرت علیؓ وحضرت ابن مسعودؓ کے شاگردوں اور شاگردان شاگرد کے زیر سایہ گذرا تھا اور ایک مدت تک علم کلام سے خصوصی دلچسپی رکھنے کی بناء پر آپ خود بھی شرعی مسائل میں عقل ورائے سے کام لینے کے عادی تھے، مزید برآں یہ کہ کوفہ کے ایک ممتاز فقیہ جو کہ حضرت علیؓ وحضرت ابن مسعودؓ کے علوم کے خصوصی امین تھے اور اہل رائے مکتب فکر کے ایک نمایاں فقیہ تھے، یعنی حماد بن ابی سلیمان، ان کی اٹھارہ سالہ صحبت آپ کو میسر رہی، اس لئے آپ نے اہل رائے مکتب فکر کے طریقہ واصول کو ہی اپنایا اور اس

پختگی کے ساتھ کہ استاذ کے انتقال کے بعد اس مسند کے آپ ہی اہل سمجھے گئے۔

امام صاحب اپنی فقہی آراء کے سلسلہ میں کتاب وسنت کو ہی اصل بنیاد قرار دیتے ہیں مزید یہ کہ ضرورت پر اقوال صحابہؓ، قیاس واستحسان اور اجماع وعرف سے استفادہ کرتے ہیں، فقہ میں آپ کا مرتبہ روز اول سے مسلم رہا اور آپ کی حیات سے لے کر آج تک ہر عہد کے حق پسند ومخلص علماء نے اس میں آپ کے تفوق وامتیاز کو تسلیم کیا، خواہ امام مالک ہوں، یا امام شافعی، یا دیگر ائمہ وعلماء، یہی وجہ ہے کہ آپ کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تھا، جن میں وقت کے ممتاز محدثین وفقہاء بھی شامل تھے، بلکہ بعض ایسے حضرات بھی جن کا نام اکثر و بیشتر اکابر ائمہ کے ساتھ آتا ہے، جیسے امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر وغیرہ رحمہم اللہ، مذہب حنفی کے مشہور فقہاء میں جصاص رازی، خصاف کرخی، قدوری، قاضی خان، ابن ہمام اور طحاوی وغیرہ ہیں، اہم کتابیں امام محمد وامام ابو یوسف کی تالیفات ہیں، نیز بدائع الصنائع، البحر الرائق، ہدایہ وفتح القدیر، فتاویٰ عالمگیری، شامی، دیگر شروح ہدایہ، شروح کنز اور امام محمد کی تالیفات کے مجموعہ کی شروح بنام ''المبسوط'' یعنی مبسوط سرخسی اور مبسوط حلوانی وغیرہ۔

امام صاحب پر بہت سے لوگوں کو یہ خصوصی اعتراض ہے کہ ان کو حدیث سے کوئی خاص تعلق بلکہ حدیث کا کوئی خاص علم نہ تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ: ''حدیث میں دوسرے ائمہ کی طرح امام صاحب کی کوئی کتاب نہیں اور بہت سے مسائل حدیث کے خلاف یا ضعیف احادیث کے مطابق ہیں''، لیکن دوسرے مذاہب کے علماء محققین نے اس کا رد کیا ہے اور انہیں اعلیٰ درجہ کے محدثین میں شمار کیا ہے، امام صاحب سے اچھی خاصی تعداد میں احادیث مروی ہیں، جو ''مؤطا امام محمدؒ'' اور ''مسند ابی حنیفہ'' میں منقول ہیں، البتہ کثیر تعداد میں اس لئے نہیں ہیں کہ امام صاحب جس مکتب فکر کے پروردہ تھے وہ احادیث کی روایت د نقل میں بہت محتاط تھا، بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ: ''احادیث کو قبول کرنے کے سلسلہ میں امام صاحب کی شرطیں بہت سخت تھیں''، نیز شاہ ولی اللہؒ اور ابن قیمؒ نے صراحت

کے ساتھ لکھا ہے کہ: امام صاحب نے گذشتہ علماء وفقہاء کی پوری اتباع کی ہے، حتیٰ کہ امام صاحب اور ان کے شاگردوں کی آراء کو اگر جمع کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوفہ کے ممتاز فقہاء کے یہ لوگ پورے طور پر موافق ہیں، رہی احادیث کی مخالفت تو امام صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اکثر وبیشتر احادیث کے مقصد ومنشاء کو سامنے رکھ کر کوئی رائے اختیار کرتے ہیں، تا کہ ایک مسئلہ سے متعلق کئی مختلف احادیث پر عمل کی صورت نکل سکے، اس میں کبھی کبھی بہت سی احادیث کی ظاہری مخالفت معلوم ہوتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے ــــ اور جو احادیث ہمارے سامنے ضعیف ہیں، ان میں بہت سی امام صاحب کے عہد میں اس مرتبہ کی نہ تھیں، اس لئے کہ ان کا زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب تھا اور خیر کا زمانہ تھا، جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے تصریح کی ہے ــــ پھر جب کہ محققین کا اتفاق ہے کہ امام صاحب نے فقہی مسائل کی تحقیق کیلئے اپنے چالیس شاگردوں پر مشتمل ایک مجلس قائم کر رکھی تھی، یہ چالیس افراد تمام ضروری عربی واسلام علوم وفنون کے جامع وماہر تھے، اس مجلس فقہی میں کئی کئی دن بحثوں کے بعد کوئی فیصلہ ہوتا جسے اختیار کیا جاتا تھا، بعض بعض حضرات اپنی کوئی خاص رائے بھی رکھتے تھے، جیسے کہ کبھی امام صاحب اپنی وسعت علم وتجربہ کی بناء پر اپنی ہی رائے کو بطور فیصلہ کے صادر فرماتے۔

مزید براں یہ کہ اپنی طے شدہ رائے پر اصرار بھی نہ تھا، بلکہ صاف اعلان تھا کہ ہمارے سامنے یہ اچھی رائے آسکی ہے، اگر کوئی اس سے اچھی پیش کردے تو وہ راہ صواب پر ہوگا اور آپ کا یہ اعلان مشہور ہے ہی کہ: ''اگر میری رائے کے خلاف کوئی صحیح حدیث موجود ہو تو وہی میرا مذہب اور اسی کے مضمون کے مطابق میری رائے ہے''۔

امام صاحب اپنے علمی امتیاز کے ساتھ نہایت صابر وضابط اور بردبار وجفاکش تھے، عابد وزاہد اور متقی وپرہیزگار، بکثرت حج کرتے، مجبوراً ہی ترک کرتے، مشہور ہے کہ: 'چالیس سال تک عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز پڑھی، ہر رات میں ایک قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے'، آپ کی پیدائش: اموی دور حکومت میں ہوئی اور وفات: عباسی عہد ۱۵۰ھ میں ہوئی۔

امام مالک رح

نام: مالک بن انس اصبحی یمنی، کنیت: ابوعبداللہ، لقب: امام دارالہجرۃ، ولادت بمقام: مدینہ سنہ ۹۳ھ اور وہیں وفات سنہ ۱۷۹ھ میں حج کے سفر کے علاوہ زندگی بھر مدینہ منورہ سے کہیں اور نہیں گئے، گھرانہ اہل علم کا تھا، دادا یمن سے مدینہ منتقل ہو گئے تھے جو کہ بڑے تابعین میں سے تھے، گھر والوں نے ان پر پوری توجہ دی، بالخصوص والدہ نے تحصیل علم کیلئے ہر قربانی دی، حتیٰ کہ گھر کی چھت کی لکڑیاں بیچ دیں، وقت کے تمام مروّج علوم وفنون حاصل کئے اور چونکہ مدینہ منورہ تمام مسلمانوں عوام وخواص سب کا مرجع تھا اور بڑا علمی مرکز تھا، دنیا جہان کے علماء وفضلاء وہاں آتے رہتے تھے، نیز مختلف قسم کے فتنوں کی کثرت نے بہت سے علماء کو مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا، اس لئے ان کو تحصیل علم کیلئے کہیں اور نہیں جانا پڑا، فقہ وحدیث کے خصوصی استاذ ''ربیعۃ الرائی رح'' تھے، جو عقل و رائے سے کام لینے میں خاص امتیاز رکھتے تھے، اس لئے حدیث کے ساتھ فقہ میں مہارت وبصیرت کی، پھر ابوبکر عبداللہ بن ہرمز رح کی صحبت میں طویل مدت رہ کر حدیث کی تحصیل کی اور ان سے روحانی فیض بھی حاصل کیا، اساتذہ میں وقت کے مایہ ناز محدث ابن شہاب زہری رح بھی شامل ہیں، مدینہ میں چونکہ عقائد سے اختلافات اور کوفہ والا ماحول نہ تھا، اس لئے ان امور پر زیادہ توجہ نہیں کی، ویسے چونکہ فرق ضالّہ اور ان کے عقائد کی شہرت ہر جگہ تھی، اس لئے اپنے استاذ خاص ابن ہرمز سے بھی جو اس کے امام تھے؛ پوری معلومات حاصل کیں، لیکن اس میں خود کو زیادہ مشغول نہیں کیا اور جب کبھی کسی نے اس سلسلہ کا کوئی سوال کیا تو نہایت سادہ سا جواب دے کر بات ختم کر دی۔

تحصیل علم کے بعد مدینہ کے اکابر اہل علم سے مشورہ کر کے مجلس درس قائم کی اور اس

کے لئے وہ جگہ منتخب کی جہاں حضرت عمر رض بیٹھا کرتے تھے اور چونکہ حدیث کا احترام بچپن سے دل میں پیوست تھا، اس لئے کھڑے کھڑے روایت بیان نہ فرماتے اور روزانہ مجلس درس میں غسل کر کے نیا جوڑا زیب تن فرما کر اور عطر کے ساتھ تشریف لاتے اور نہایت سکون ووقار کے ساتھ بیٹھتے، اثناء درس میں کبھی ہنسے نہیں، بڑے پر ہیبت تھے، ایک دفعہ کپڑوں میں بچھو گھس گیا، جس نے سبق کے دوران سولہ مرتبہ ڈنک مارا، مگر حرکت نہیں کی، مشغلہ تجارت تھا جسے بھائی دیکھتے تھے، خلفاء وقت سے جو عطیہ وہدیہ ملتا اسے طلبہ وغیرہ پر خرچ کر ڈالتے، نہایت صاف ستھرے وعمدہ کپڑے پہنتے اور اچھے سے اچھا کھاتے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رض وتابعین کی روایات کو نقل کرتے اور ان کی روشنی میں خود بھی اجتہاد کرتے ــــــ بہت محتاط تھے حتیٰ کہ خود فرماتے کہ: ''احتیاط کی وجہ سے میں نے بہت سے صحابہ رض پر توجہ نہیں کی''؛ اس لئے جو مسائل پیش آتے تھے انہیں کا جواب دیتے اور مہلت لے کر بڑے غور وفکر کے بعد، روایت بھی بہت زیادہ بیان نہیں فرماتے تھے، حدیث میں بہت تحقیق اور کاٹ چھانٹ کرتے، اسی لئے آپ کے سلسلہ کو بہت عالی شمار کیا گیا ہے۔

اپنے کام سے کام رکھا، حکومت اور اس کے کارندوں کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا، پھر بھی اہل حکومت نے نہیں بخشا، منصور عباسی کے عہد میں کوڑے لگائے گئے، پہنچے اتروا دیئے گئے، مگر آپ نے پھر بھی اثر نہیں لیا، آخر غلطی کو محسوس کر کے معذرت کی گئی، اخیر عمر میں امراض کی کثرت کی بناء پر گھر میں ہی قیام کر لیا اور وہیں مجلسیں ہونے لگیں، شروع میں روز دو مجلسیں ہوتی تھیں؛ ایک حدیث کی اور ایک مسائل کی، بعد میں یہ مجلسیں دنوں کے حساب سے ہونے لگیں۔

فقہ میں خصوصی بصیرت کی بناء پر آپ کی فقہی آراء بھی ایک مذہب کی صورت اختیار کر گئیں، جو آج تک برابر امت میں رائج ہے، ماضی میں اسے سب سے زیادہ فروغ اندلس

میں حاصل ہوا، وہیں خوب پھولا و پھلا اور وہاں اس کا بڑا دور دورہ رہا۔

آپ کا سب سے اہم کارنامہ آپ کی کتاب ''مؤطا'' ہے، جسے وقت کے بڑے ممتاز علماء نے خود آپ سے پڑھا، مثلاً امام شافعیؒ، امام محمدؒ، امام ابو یوسفؒ، اس میں حضورؐ کے اقوال کے ساتھ صحابہؓ وتابعین کے اقوال اور فقہی آراء کو بھی ذکر کیا گیا ہے، مگر غلبہ احادیث نبویہ کو ہی ہے، یہ باضابطہ اور مرتب ومبوب سب سے پہلی حدیث کی کتاب ہے اور ساتھ ہی یہ کہ صحت کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، اسی لئے اسے ''ام الصحیحین'' بھی کہا گیا ہے، امام شافعیؒ نے اسے ''اصح الکتب'' (صحیح ترین کتاب) کہا ہے اور منقول ہے کہ: ''امام مالکؒ نے اسے مدینہ کے ستر فقہاء پر پیش کیا تھا''، اندلس میں قضا کیلئے اس کا حافظ ہونا شرط تھا، اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

آپ کے ممتاز شاگردوں میں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد، اوزاعی، امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، عبداللہ بن مبارک وغیرہم ہیں، فقہ مالکی کے بعض ممتاز فقہاء قاضی عیاض، ابوبکر بن عربی، قرطبی، عبداللہ بن وہب مصری، یحییٰ بن یحییٰ اندلسی، علی بن زیاد تونسی، عبدالملک بن عبدالعزیز الماجشون، اسماعیل بن اسحاق بصری، ابوالولید الباجی، سحنون اور ابن عبدالبر ہیں، شروح مؤطا کے علاوہ فقہ مالکی کی اہم کتابوں میں سے مدوّنہ، الجامع، المجموعۃ، مبسوط اسماعیل بن اسحاق، کتاب محمد بن ابراہیم اسکندری، الکافی وغیرہ ہیں۔

امام شافعیؒ

نام: محمد بن ادریس الشافعی، کنیت: ابوعبداللہ، والد خاندان قریش سے اور والدہ یمن کے مشہور خاندان ''بنوازد'' سے تعلق رکھتی تھیں، ولادت: ۱۵۰ ھ میں ہوئی، یتیم تھے، والدہ نے تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دیئے، شروع میں ان کو مکہ بھیجا، پھر خود بھی وہیں آگئیں، اعلیٰ درجہ کے ذہین وذکی تھے ہی، مختلف مکاتب ومذاہب کے علوم کے جامع ہوئے، وفات: ۲۰۴ھ میں بمقام مصر ہوئی۔

علوم عربیت کو حاصل کیا اور دیہاتوں میں جا کر اور وہیں رہ کر خالص عربی زبان کو سیکھا، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ میں بڑے ادیب وشاعر شمار کئے گئے، اگرچہ شعر وشاعری مشغلہ نہیں تھا، اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی مجلسیں لوگوں کیلئے مزید دلچسپی کا باعث تھیں، پھر فقہ وحدیث میں لگے، احادیث کا خوب علم حاصل کیا، امام مالک کی مؤطا زبانی یاد کی، پھر مدینہ جا کر باقاعدہ ان سے پڑھی اور نو سال تک ان کی صحبت وخدمت میں رہے، اس طرح ان کو وقت و مستقبل کے ایک اہم ووسیع فقہی مذہب سے براہ راست واقفیت کا موقع ملا اور ان کی فقہی بصیرت زائد سے زائد پختہ ہوتی گئی۔

امام مالکؒ کی وفات کے بعد چونکہ تحصیل علم کا سلسلہ ختم ہوگیا اور پوری زندگی یتیمی و غربت کی گذاری تھی، لہٰذا معاش کی فکر ہوئی، کسی سفارش کی بناء پر والیٔ یمن اپنے ساتھ لے گیا، لیکن یہ جانا بھی اس طور پر ہوا کہ اخراجات سفر کیلئے گھر کو رہن رکھنا پڑا، وہاں پہنچ کر علاقۂ نجران کے قاضی بنا دیئے گئے ـــــ چونکہ کتاب وسنت کے بڑے عالم اور ساتھ ہی بڑے عامل بھی تھے، اس لئے پورے عدل وانصاف سے کام کرتے، کسی کی پرواہ نہ

کرتے، حتیٰ کہ والی کی ظالمانہ حرکتوں پر بھی تنقید کی، ان چیزوں نے مصائب کے دروازے کھول دیئے، بغاوت کے الزام میں قید کر کے بغداد لے جائے گئے، اس سے پہلے کبھی بغداد جانا نہیں ہوا تھا ـــــ عباسی دور حکومت تھا، امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کا اس عہد کے خلفاء سے خصوصی تعلق تھا اور ان دنوں امام محمدؒ جن سے امام شافعیؒ کا خاص تعلق رہا تھا بغداد میں تھے، جب مقدمہ کی سماعت ہوئی، امام شافعیؒ نے صفائی پیش کی، امام محمدؒ نے سفارش فرمائی تو امام محمدؒ کے سپرد کر دیئے گئے، اس صورت حال کی بناء پر امام شافعیؒ نے اس کام کو ترک کر دینے کا فیصلہ کرلیا، بلکہ علم کو ہی اپنا مشغلہ بنالیا اور امام محمدؒ ان کو کیا ملے گویا انہیں علوم کا خزانہ اور فقہ واجتہاد کا دروازہ مل گیا، امام محمدؒ کے گھر میں رہ کر فقہ حنفی کی جملہ تصانیف کا مطالعہ کیا، ان سے نیز دوسرے ممتاز فقہاء سے براہ راست بھی کسب فیض کیا، امام محمدؒ سے فقہ کے ساتھ عراقی روایات حدیث بھی حاصل کیں، چونکہ اس سے پہلے جن مراکز سے آپ نے استفادہ کیا تھا وہ عراقی مکتب فکر ومذہب سے مختلف تھے اور آپ کو سابقہ مراکز کے مذاہب سے متعلق بصیرت حاصل تھی، اس لئے بغداد کے قیام کے دوران وہاں کے علماء سے مناظروں کی بھی نوبت آئی، یہاں رہ کر بالخصوص فقہ حنفی کے واسطے سے ان کو جو علم وبصیرت حاصل ہوئی تھی اس کی وجہ سے امام صاحب کی عظمت کے بڑے قائل تھے، حتیٰ کہ یہاں تک فرمایا کہ: ''فقہ میں تمام لوگ امام ابوحنیفہؒ کی آراء کے محتاج ہیں''، بہر حال اب امام شافعیؒ کو اہل رائے کے ایک دوسرے عظیم ووسیع مذہب سے متعلق کافی معلومات ہوگئیں، چند سال بعد آپ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر مسجد حرام کو اپنا ٹھکانہ بنالیا اور اپنی مجلس درس لگائی اور عالم اسلام کے تین مراکز: مکہ، مدینہ، عراق سے جن علوم کو حاصل کیا تھا ان کی روشنی میں تمام مذاہب کا ناقدانہ جائزہ لے کر خود اپنی مستقل آراء کا اظہار کیا ـــ نو سال قیام فرما کر دو سال کے لئے دوبارہ بغداد گئے، پھر مکہ تشریف لائے اور اس کے بعد پھر ایک مرتبہ بغداد کا سفر کیا، مدینہ منورہ کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور علاقے میں امام مالکؒ

کے علوم کے آپ ہی سب سے بڑے امین تھے، آپ کے قیام مکہ نے مکہ کو اطراف عالم کیلئے علمی مرکز بنادیا اور پھر یہاں سے آپ جہاں گئے، اس مرکزیت ومرجعیت کو لے کر گئے ـــ آپ کے شاگردوں میں امام احمد بن حنبلؒ جیسی عظیم المرتبت ہستی بھی ہے جو خود بھی ایک عظیم فقہی مذہب کے بانی مبانی تھے، مکہ سے بغداد کا دوسرا سفر کرنے کے بعد وہیں سے مصر تشریف لے گئے اور عمر کا آخری حصہ وہیں گذارا، مصر کے قیام کو آپ کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ حجاز سے دور دراز کا علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت سی معلومات ایسی تھیں جو حجاز تک نہیں پہنچتی تھیں، یہاں پہنچ کر امام شافعیؒ کو ان کا علم ہوا تو چند مسائل کو چھوڑ کر تمام مسائل میں اپنے سابقہ اقوال سے رجوع کرلیا اور جدید آراء کا اظہار کیا اور آپ کے ماننے والے عموماً انہیں بعد کے اقوال پر عمل کرتے ہیں، مختلف علاقہ وممالک کے سفر اور ہر جگہ تدریس وافادہ کے سلسلہ نے آپ کے مذہب کو کافی وسعت دی اور چونکہ یہ زمانہ عالم اسلام میں ہر قسم کے علوم کی تدوین کا زمانہ تھا، نیز یہ کہ بہت سے گمراہ فرقے زور پر تھے اور آپ اگرچہ علم کلام میں ماہر ہونے کے باوجود مناظروں سے بچتے تھے، لیکن ان کا رد کرتے تھے، ان چیزوں نے آپ کو اور آپ کی آراء کو مزید اہمیت عطا کی۔

آپ نے نہ صرف یہ کہ ایک فقہی مذہب کی بنیاد ڈالی، بہت سی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جو آج دنیا کے سامنے ہیں، آپ کا بڑا علمی کارنامہ علم اصول فقہ کے قواعد کا بیان اور ان کا ضبط تھا، آپ کی تصانیف میں: الرسالۃ، الأم، احکام القرآن وغیرہ ہیں۔

شافعی مذہب دنیا کے بہت سے ملکوں میں پھیلا، کہیں کم اور کہیں زیادہ، مصر میں ہر عہد میں اسے خاص اہمیت حاصل رہی، مشہور شاگردوں میں ابوثور بغدادی، احمد بن حنبل، حسن بن محمد زعفرانی، ابوعلی کرابیسی، یوسف بن یحییٰ مصری، اسماعیل بن یحییٰ مزنی، ربیع بن سلیمان مرادی ہیں اور فقہ شافعی کے ممتاز فقہاء میں: ابواسحاق مروزی، ابوبکر ضبعی، قفال کبیر، ابوسہل صعلوکی، ابوحامد اسفرائنی، ابواسحاق اسفرائنی، ابوالحسن ماوردی، امام الحرمین، امام غزالی،

رافعی، نووی، ابن حجر وغیرہ ہیں۔

اہم کتابیں:

امام شافعیؒ کی تصانیف کے علاوہ؛ بویطی اور مزنی کی تصانیف اور ان کی شروح ہیں اور نووی وابن حجر وغیرہ کی تصانیف ہیں۔

امام احمدؒ

نام: احمد بن محمد بن حنبل شیبانی، کنیت: ابوعبداللہ، لقب: ناصر السنۃ، اصل میں خراسان کے رہنے والے تھے، مگر خود ان کی ولادت ووفات بغداد میں ہوئی، ولادت: ۱۶۴ھ اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی۔

علوم عربیت کی تحصیل کے بعد حدیث میں لگے اور امام الحدیث اور استاذ الاساتذہ قرار پائے، حتیٰ کہ استاذ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: ''چونکہ آپ کو احادیث کا بہت علم ہے، اس لئے میری رائے کے خلاف اگر کسی صحیح حدیث کا علم ہو تو مجھے بتا دیجئے گا''، احادیث کے سلسلہ میں بڑی تحقیق اور چھان بین کرتے تھے، پوری اسلامی مملکت کے مشہور شہروں کا اس کیلئے سفر کیا اور اخیر عمر تک اس میں لگے رہے اور صرف الفاظ حدیث کا ہی علم نہیں حاصل کیا بلکہ فقاہت میں بھی مہارت پیدا کرتے رہے، حتیٰ کہ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: ''میں نے بغداد میں ان سے بڑا فقیہ وعالم نہیں چھوڑا''، اساتذہ میں امام ابو یوسفؒ شاگرد امام ابو حنیفہؒ بھی ہیں، بلکہ سب سے پہلے احادیث ان سے ہی حاصل کیں، سات سال تک بغداد میں حدیث کو حاصل کیا، پھر فقہ کی طرف توجہ کی اور اس میں کمال پیدا کیا، اس میں بھی امام ابو یوسف سے استفادہ کیا اور امام شافعیؒ کی صحبت نے خاص طور سے فائدہ پہنچایا اور یوں انہیں تینوں عظیم مذاہب کا علم حاصل ہو گیا اور اس تحصیل علم کے پیچھے اپنی عمر کا کوئی خیال نہ کیا حتیٰ کہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ جانے پر خود درس کا کام شروع کیا، چونکہ ان کے پاس احادیث کا ذخیرہ اتنا بڑا تھا کہ کسی دوسرے امام کو حاصل نہ ہو سکا تھا، اس لئے اول تو مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین سے کسی سے صحیح طور پر منقول مل جاتے اور بہت تھوڑے جو نہ ملتے ان کے حق میں قیاس سے کام لیتے، لیکن قیاس سے اتنا کم کام لیا کہ

اصحاب ظواہر واہل حدیث سے بہت قریب ہیں اور بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ ان کے یہاں قیاس ہے ہی نہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

مجلس درس میں ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار طلباء وسامعین ہوتے، دیکھنے والے الگ ہوتے، آنے والے ان سے علم بھی سیکھتے اور اخلاق بھی، دو علمی مجلسیں لگتی تھیں؛ ایک گھر میں طلباء وصاحبزادگان کیلئے، دوسری بعد عصر مسجد میں طلباء وعوام کیلئے، مطالبہ پر ہی روایت بیان فرماتے تھے اور نوشتہ سے، محض یادداشت سے بمشکل سو احادیث بیان فرمائیں، صرف احادیث کے لکھنے کی اجازت تھی، فتاویٰ کی نہیں، اس لئے کہ علم کا مصداق احادیث کو ہی قرار دیتے اور تاکید فرماتے تھے کہ عام لوگوں کی باتیں مت نقل کیا کرو، چنانچہ اپنے عظیم الشان علمی کارنامہ ''مسند'' کی تحریر پر بھی دوسرے مصنفین کی طرح توجہ نہیں کی، زندگی بھر اسے جمع کیا، اخیر میں صاحبزادگان کی خواہش پر اسے املاء کرایا اور بعد میں صاحبزادے عبد اللہ نے اسے مرتب کیا اور اس پر اضافہ کیا، اپنی فقہی آراء کو نہ خود جمع کیا نہ کسی کو جمع کرنے دیا، بعد میں شاگردوں نے یادداشت کی بنیاد پر ان کی فقہ کو جمع کیا اور چونکہ صاحبزادے عبد اللہ کو منصب قضاء ملا ہوا تھا، اس لئے انہوں نے اس کی عملی تنفیذ بھی کی۔

نہایت عابد وزاہد، متقی وپرہیزگار تھے، کسی کا عطیہ نہیں لیتے تھے، حکومت کا تو ایک پیسہ گوارا نہ تھا، صاحبزادے کی تنخواہ سے کچھ نہ کھاتے تھے، پوری زندگی غربت وعسرت میں گذاری، معمولی سی ایک جائیداد تھی، اس سے کام چلاتے، ضرورت کی بناء پر کھیتوں میں پڑا رہ جانے والا غلہ جمع فرمالیا کرتے تھے، یا پھر مزدوری یا بننے کا کام کر لیتے، بہت مجبور ہوتے تو کسی سے قرض لے لیتے، اگر مجبوراً خلفاء سے کچھ لینا پڑ جاتا تو ہاتھ لگائے بغیر خرچ کر ڈالتے، بڑے پاکدامن وباہیبت تھے، ہنسی مذاق سے بہت دور، نہایت صابر وضابط، اعلیٰ درجہ کے مجاہد، ان اوصاف نے اتنی مقبولیت عطا کر دی تھی کہ بوقت وفات بہت سے لوگ قبر کی زیارت کے مشتاق رہے، مگر شدت اژدہام کی وجہ سے محروم رہے۔

آپ کا زمانہ گمراہ فرقوں میں معتزلہ کے عروج کا زمانہ تھا حتیٰ کہ خلفاء وامراء بھی ان سے متاثر تھے اور اس درجہ کہ ایک مسئلہ میں ان کی رائے کا باقاعدہ سرکاری طور پر اعلان ہو گیا اور ہر عالم سے اس کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور نہ ماننے پر سزا رکھی گئی۔

فتنہ خیال کر کے بعض نے خود کو شروع سے بچالیا، بعض حضرات کچھ دنوں بعد پیچھے ہٹ گئے، لیکن امام احمدؒ کبرسنی اور ضعف کے باوجود اہل السنۃ کی رائے پر جمے رہے، قید کئے گئے، کوڑے مار مار کر بے ہوش کئے گئے، تلوار کے کچوکے لگائے گئے، مگر آپ باز نہ آئے، حتیٰ کہ ۲۸ مہینے کی قید وبند کے بعد آپ کو آزادی ملی، آپ زخموں سے نڈھال تھے، صحت ہونے پر کام کے لائق ہوئے تو کام سے روکا گیا، شدت احتیاط کی بناء پر اس حال میں اگر کوئی کچھ پوچھتا تو کہہ دیتے کہ مجھے روک دیا گیا ہے، آخر اللہ نے آپ کی قربانیوں کو قبول فرما کر اس فتنہ اور اس کے زور کو بلکہ کچھ عرصہ بعد اس فرقہ کو ہی ختم فرما دیا۔

آپ کے علمی کارناموں میں حدیث کی مشہور کتاب ''مسند'' ایک نمایاں چیز ہے، جس کا آپ نے پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب کیا ہے، آپ کی فقہ دوسرے تین مذاہب کے مقابلہ میں کم پھیلی، آج کل اس کا خاص علاقہ نجد وحجاز ہیں، مشہور شاگردوں میں آپ کے دو صاحبزادگان نیز ابوبکر الاثرم، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، امام بخاری ومسلم وغیرہ ائمہ محدثین ہیں، بخاری ومسلم کے علاوہ مذکورہ افراد فقہ حنبلی کے اساطین فقہاء میں سے بھی ہیں، نیز ابن عقیل، ابن جوزی، ابن قدامہ، ابن رجب، ابن قیم، ابن تیمیہ وغیرہ بھی اسی صف میں شامل ہیں، اہم کتابوں میں امام احمد کی تصانیف کے علاوہ مقنع اس کی شروح، اقناع اور کافی ومغنی وغیرہ ہیں۔

علم اخلاق

علم احکام کی تیسری قسم ''علم اخلاق'' ہے، جس کو مختلف ناموں سے ذکر کیا جاتا ہے؛ علم اخلاص، احسان، تزکیۂ نفس، علم طریقت وغیرہ، مشہور نام ''تصوف'' ہے، حکماء عالم اسی کو ''تہذیب نفس'' کا عنوان دیتے رہے ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ کسی آسمانی وغیر آسمانی مذہب نے اس سے بے توجہی نہیں برتی ہے، بلکہ ہر مذہب میں پائے جانے والے مجاہدات اسی کیلئے ہوتے ہیں۔

عام نقطۂ نظر کے مطابق اس کا حاصل قلب کی صفائی ہے؛ یعنی گندی عادات واخلاق سے اس کو پاک کر کے عمدہ اخلاق وعادات کا مخزن بنانا، تاکہ جسم سے نکلنے والے اعمال بھی اچھے سے اچھے ہوں اور انسان کی ذاتی وانفرادی زندگی میں صلاح پیدا ہو کہ صلاح افراد کے بغیر صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اور جب تک دل کو گندے اخلاق سے پاک نہ کیا جائے گا جسم سے نکلنے والے اعمال صحیح نہ ہوں گے، چنانچہ ایک مشہور حدیث میں ہے کہ: ''انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے؛ اگر وہ سدھرا رہے تو سارے جسم میں سدھار رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے''۔

شریعت میں اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تیسرا کام یہی شمار کیا گیا ہے، اسی لئے جن لوگوں کی کتاب وسنت پر کچھ نظر ہے وہ اس سے ناواقف نہیں کہ حضوؐر نے جس طرح اعتقادات واعمال کے حق میں اپنی تعلیم وہدایت اور عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے، اسی طرح آپؐ نے تزکیۂ قلب واخلاق کے متعلق بھی اہم ہدایات دی ہیں اور ان کا نہایت اعلیٰ ومثالی نمونہ امت

کے لئے چھوڑا ہے، مختصر یہ کہ یہ بھی دین وتعلیمات دین کا ایک مستقل واہم شعبہ ہے اور یہی اخلاق وتصوف کا خاص موضوع ہے۔

حضوؐر کی ذات تو ان تینوں شعبوں کی جامع تھی، کسی درجہ ایسی ہی جامعیت حضرات صحابہؓ کو بھی حاصل تھی لیکن بعد میں زیادہ تر ایسا ہوتا رہا کہ حضوؐر کے اکثر وارثین ونائبین اگرچہ ذاتی طور پر کم وبیش ان تینوں شعبوں کے جامع ہوتے تھے مگر اپنی اپنی صلاحیت و ذوق یا ماحول کے مطابق ان کا خاص تعلق کسی ایک شعبہ سے ہی ہوتا تھا، اس طرح امت میں الگ الگ تین اہم طبقات ہوگئے: متکلمین، فقہاء، صوفیاء۔

صوفیاء نے دین کے تیسرے واہم شعبے کی خدمت وحفاظت اپنے ذمہ لی اور اس سلسلہ میں حضوؐر کی جانشینی کی، علم اخلاق وتصوف کی اصل غرض اور صوفیاء کرام کی جد وجہد و مساعی کا اصل نصب العین یہی ہے، اسی لئے ہر دور میں حضوؐر کے نائبین اور دین کے نمائندہ طبقہ نے اس کو لیا اور امت کا کوئی ممتاز افراد اس سے خالی نہیں رہا، بلکہ اپنے درجہ ومنصب اور علم کے مطابق اس کی تعلیم وتلقین کرنے والا رہا ہے۔

البتہ یہ شعبہ محض نظری وفکری نہیں ہے کہ کتابی مطالعہ سے اس کو حاصل کرلیا جائے، جیسے کہ دوسرے بہت سے علوم ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ محض کتابوں کے ذریعہ اس فن کے مسائل کی حقیقت سے انسان واقف ہی نہیں ہوسکتا جب تک اس کیلئے اسی لائن کے کسی مخصوص شخص کی صحبت میں رہ کر اس کے احوال کو دیکھنے اور اس کے زیر تربیت وزیر نگرانی ان چیزوں کی عملی مشق اور قلب کو ان کا عادی بنانے کی نوبت نہ آئے۔

اور بغیر نگرانی اگر جد وجہد کی جائے تو بسا اوقات گمراہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس لئے کہ مشق کے زمانے میں شیطان طرح طرح کے وساوس وگمراہ کن خیالات پیدا کرتا ہے جن کی نشاندہی اور علاج کوئی فن کا کامل وماہر ہی کرسکتا ہے۔

عام نقطۂ نظر ومقصد اس میں لگنے کا محض دل کی صفائی ہوتی ہے، لیکن شریعت کی

رو سے یہ ایک ابتدائی چیز ہے اور اصل مطلوب ومقصود کے حصول کی تیاری ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ سے عشق ومحبت، تاکہ اعضاء جسم سے نامناسب، اس کی رضا کے خلاف اور معاشرہ کے حق میں ضرر رساں اعمال نہ صادر ہوں اور ساتھ ہی اللہ سے قرب وتعلق کو بڑھانے والے اعمال بھی ہوتے رہیں، اسی لئے ''اسلامی تصوف'' صرف قلب کی صفائی کا ہی کام نہیں کرتا بلکہ عمل کی لائن میں انسان کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتا ہے اور اس کا طالب و خواہاں ہمہ وقت اعمال کی فکر میں لگا رہتا ہے، وہ اس میں جتنا آگے اور فائق وکامل ہوتا ہے اتنی ہی اس میں فکر عمل اور اہتمام زیادہ ہوتا ہے، اس کیلئے حضورؐ اور حضرات صحابہؓ خصوصاً اکابر صحابہؓ اور امت کے منتخب وچنیدہ علماء وبزرگوں کی زندگیاں شاہد ہیں۔

یہ عشق ومحبت معمولی چیز نہیں، بلکہ یہی ایمان کا مقصود ومطلوب ہے اور یہی وہ طاقت ہے جو انسان سے بڑے سے بڑا کام کراتی ہے اور وقت کے دینی مطالبہ کے سامنے ہر چیز کو پس پشت ڈالنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ سرفروشی وجانبازی، جہاد وقربانی، تجدید وانقلاب، فتح وتسخیر کیلئے جس وجاہت وشخصیت، اخلاص وللٰہیت، حوصلہ وہمت، جذب وکشش کی ضرورت ہوتی ہے وہ اکثر بیشتر اس عشق ومحبت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اہم اصلاحی وتجدیدی اور مجاہدانہ کارنامے انجام دینے والے حضرات وہی ہوئے ہیں جن کو اس اعتبار سے بلند مقام ومرتبہ حاصل رہا، انہوں نے وقت پڑنے پر بڑے سے بڑے دینی فتنے کے سامنے خود کو سینہ سپر بنا کر ان کو بالآخر جڑ سے ختم کر دیا، خواہ وہ فتنۂ خلق قرآن کے موقع پر امام احمد ہوں یا ہندوستان میں دین اکبری کے فتنہ کا مقابلہ کرنے والے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور نہ صرف یہ بلکہ بڑی بڑی سیاسی تحریکات کے روح رواں بن کر مسلمانوں کو کفر اور اہل کفر کی ماتحتی اور غلامی کی زندگی سے نکالا اور حق یہ ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی سرفروشانہ ومجاہدانہ زندگی کا حقیقی عملی نمونہ یہی حضرات ہوتے ہیں، انہیں کو دیکھ کر ان کی بلندی کردار ومعیار کا پورا یقین حاصل ہوتا ہے۔

ان حضرات کے نمایاں کارناموں وخدمات میں یہ بھی شامل ہے کہ انہوں نے صدہا بستیوں اور لاکھوں لاکھ افراد کے قلوب میں ایمان کے چراغ روشن کئے، تنہا خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ نوے لاکھ افراد ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، یعنی اشاعت اسلام اور خاص طور پر ہندوستان اور اس کے اطراف میں ان کا بڑا نمایاں و عظیم الشان کارنامہ ہے۔

اصلاً تو یہ علم عملی ہے، برتے بغیر اسے سمجھا نہیں جا سکتا، لیکن علماء نے فکری ونظری طور سے اس پر یوں محنت کی ہے کہ نفس کی ایک ایک خباثت، اس کا علاج، ایک ایک اچھی عادت وخصلت اور اس کے حصول کی تدابیر کو بتایا ہے، کسی نے مختصراً، کسی نے تفصیل سے، کسی نے مستقل کتابیں لکھ کر اور کسی نے ضمنی طور پر، ویسے زیادہ تر اس کے اصول وجزئیات کا ابر صوفیاء کے ملفوظات میں ملتے ہیں اور فارسی وعربی میں محفوظ ہیں، بہرحال فکر ونظر کے اعتبار سے بھی یہ اہم فن ہے، اس کی اپنی اصطلاحات ہیں، مخصوص کتابیں ہیں اور اتنی بڑی تعداد میں کہ پورا ایک کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ہر عہد میں کام ہوتا رہا ہے۔

اصل سرچشمہ اس کا بھی کتاب وسنت ہی ہیں، علماء اس کے اصول وجزئیات کے بیان میں آیات وروایات کو ذکر کرتے ہیں اور بعض نے محض قرآن یا حدیث سے ماخوذ تصوف کے مسائل پر بھی کتابیں لکھی ہیں، کتابوں یا اس سلسلہ کے بڑوں کے ناموں کو کہاں تک شمار کیا جائے، یہ بات ضرور ذہن میں رہے کہ اختلاف فکر ونظر سے کوئی مسئلہ کم ہی خالی ہوتا ہے، اس علم کے حق میں بھی نظریات کا اختلاف رہا ہے، اس اختلاف کی بدولت جو لوگ حدود ایمان یا حدود سنت سے نکل گئے، ان سے قطع نظر خود اہل حق کے یہاں ان اختلافات کے نتیجہ میں تصوف میں بھی کئی مکاتب پیدا ہو گئے، جن کی بنیاد اصلاً تدابیر علاج وتزکیہ میں اختلاف پر ہے، یوں تو چھوٹے بڑے اہم وغیر اہم بہت سے مکاتب ہیں، مگر اصولی چار مانے جاتے ہیں اور وہی مشہور ہیں۔

۱-قادریہ ۲-سہروردیہ ۳-چشتیہ ۴-نقشبندیہ

پہلا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، دوسرا شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، تیسرا خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور چوتھا شیخ بہاء الدین نقشبندؒ کی طرف منسوب ہے۔

علوم عربیت وتاریخ

مسلمانوں کا علمی شغف صرف علوم دینیہ میں ہی منحصر نہیں رہا، بلکہ دوسرے علوم سے بھی انہوں نے پوری دلچسپی رکھی، ان دوسرے علوم کو آپ بنیادی طور سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، علوم عربیت اور عام علوم۔

علوم عربیت سے مراد وہ علوم ہیں جن کا عربی زبان وادب سے تعلق ہے، یہ علوم آج دسیوں کی تعداد میں ہیں اور ان کے مسائل وقواعد ہزارہا کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور نہ صرف عربی میں بلکہ دوسری بہت سی زبانوں میں بھی مثلاً فارسی، اردو، انگریزی وغیرہ، ان علوم کے موجد قرآن وحدیث اور قدیم کلام عرب جو اصل عربی زبان کا نمونۂ کامل سمجھا جاتا ہے، ان سب سے ان علوم کے اصول وقواعد کو چھانٹ ونکھار کر اور ہر علم وفن کے مسائل کو ممتاز کر کے پیش کرنے والے اور ان کو ترقی دے کر موجودہ وسعت تک پہنچانے والے مسلمان ہی ہیں، اگرچہ یہ سارے علوم عربی زبان سے متعلق ہیں، لیکن ظہور اسلام کے وقت عرب معمولی لکھنے پڑھنے کے بعد عربی علوم وفنون میں بس شاعری وخطابت سے واقف تھے، جس میں یہ سارے علوم آتے اور ان سے کام لیا جاتا اور انہیں کی بنیاد پر فصاحت وبلاغت کا معیار متعین کیا جاتا، مگر ذوق علمی چونکہ پختہ نہ تھا اس لئے کچھ امتیاز نہیں تھا اور ہر علم وفن کے مسائل کو نکھار کے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں نے چونکہ عربی سے کئی وجوہ سے دلچسپی لی، بالخصوص اس وجہ سے کہ قرآن وحدیث جو دینی ضرورت کا اصل سرچشمہ ہیں؛ وہ عربی میں ہیں اور اولین مسلمان عرب ہی تھے، جن کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام مدتوں ہوا اور دوسروں تک پہنچا، اس لئے دوسروں کو زبان سے پورے طور پر واقف کرانے اور خود اپنوں کو زبان کے اعتبار سے

قرآن وحدیث کے بلند معیار سے آشنا کرانے کیلئے ان علوم کی ایجاد وتحقیق کی ضرورت محسوس کی گئی اور پھر عربی زبان کے اصول وقواعد کی تدوین ہوئی، لغت، معانی، بیان، بدیع، اشتقاق، صرف، نحو، عروض، قافیہ، شعرگوئی، انشاء، مقالہ نویسی وغیرہ علوم وجود میں آئے اور ہر ہر علم وفنِ میں آج بے شمار چھوٹی وبڑی اور اکثر عربی میں کتابیں موجود ہیں اور ان فنون میں امامت کا منصب مسلمانوں کو ہی حاصل رہا اور آج تک حاصل ہے، آج بھی یہ فن انہیں کے سمجھے جاتے ہیں اور اسی حیثیت سے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، دنیا میں جہاں جہاں مسلمان ہیں اور ان کا تعلیمی نظم ہے، کسی نہ کسی صورت میں ان علوم کا پڑھنا، پڑھانا وہاں رائج ہے، اس لئے کہ اس زبان سے مسلمانوں کو مذہبی وجذباتی ہر قسم کا تعلق ہے۔

تاریخ میں بھی مسلمانوں کے کارنامے بے مثال ہیں، بلکہ تاریخ کا جو اہتمام مسلمانوں میں رہا کسی دوسری قوم میں نہیں رہا، مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم دنیا میں ایسی نہیں گذری جس کی تاریخ اس کے روز اول سے لے آج تک پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہو، یہ شرف مسلمانوں کو ہی حاصل ہے کہ انہوں نے ہی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے حالات کو محفوظ کیا بلکہ اپنی تاریخ کے کسی دور وکسی دن کو تاریکی میں نہیں چھوڑا اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس ذوق وجذبہ اور کاوش میں ترقی ہی ہوتی رہی، آپ نے علوم حدیث میں ''اسماء الرجال'' کے متعلق پڑھا ہے کہ اس کا موضوع حدیث کے راویوں کے ضروری احوال کا جمع کرنا ہے، یہ علم تاریخ کا ہی ایک حصہ ہے، اگرچہ عام تاریخ کو قوت واعتماد کا وہ درجہ حاصل نہیں جو اس کو حاصل ہے، اس لئے کہ اسماء الرجال کے سلسلہ میں جس تحقیق وجستجو اور کانٹ وچھانٹ سے کام لیا گیا ہے، عام تاریخ کے جمع کرنے میں اس کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے، اسی لئے محض تاریخی روایات کی بنیاد پر کسی کے حق میں کوئی فیصلہ دشوار ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی ہوتی ہیں۔

تاریخ کی ایک شاخ ''سیر وسوانح'' بھی ہے، یعنی اکابر اہل علم واہل دین کے حالات

زندگی، یہ مسلمانوں کی ایک امتیازی چیز ہے کہ محض ایک ایک فرد کے حالات میں صدہا اوراق کی کتابیں ترتیب دی گئی ہیں، جو ان کے ذاتی حالات وکمالات اور علوم کی جامع ہونے کے ساتھ وقت کے سیاسی ودیگر حالات کے حق میں بھی ایک دستاویز ہوتی ہیں اور مختلف ذوق کے لوگ ان سے مختلف فائدے حاصل کرتے ہیں، سب سے بڑا فائدہ بعد والوں کا ان کے احوال زندگی سے سبق حاصل کرنا ہے۔

اس کے علاوہ عام تاریخ کی کتابیں جن میں مسلمانوں اور اسلامی ممالک وحکومتوں کے حالات کو تفصیل سے جمع کیا گیا ہے، چھوٹی وبڑی بے شمار ہیں، ان کی ترتیب وتالیف مختلف انداز پر ہوئی ہے، کوئی علاقہ وملک کے اعتبار ہے، کوئی سال وسن کے اعتبار سے، کوئی حکومت وزمانہ کے اعتبار سے، اصل ذخیرہ عربی میں ہے، پھر فارسی وارد و میں اور اس کے بعد مسلمانوں میں رائج دنیا کی دوسری زبانوں میں، ممتاز مؤرخین میں مسعودی وطبری کی ابن بطوطہ، ابن خلدون وغیرہ ہیں، خاص طور سے مسعودی وطبری کی تالیفات بہت ضخیم ہیں، ابتدائی عہد کے مؤرخین میں واقدی اور ابن اسحاق مشہور ہیں۔

عام علوم وفنون

دوسرے علوم جو یونان وہند وغیرہ کا علمی سرمایہ تھے اور وہی ان کے اجارہ دار وعلمبردار تھے اوران کی وجہ سے یہ علمی تفوق وبرتری کے دعویدار تھے؛ یعنی فلسفہ، طب، جراحی، ہیئت، فلکیات وریاضت، طبیعیات وغیرہ، ان کو عام کر کے دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے فکر ونظر سے آگے بڑھا کر تجربہ کی حد میں لانے اور موجودہ علمی عہد کے مانے جانے والے امام یورپ کو ان علوم وفنون سے روشناس کرانے کا سہرا مسلمانوں کے ہی سر ہے، مسلمانوں نے ان کو پڑھا، حاصل کیا، ان کے ماہروں کی خدمات حاصل کیں، ان کو عربی میں منتقل کیا، ان کے مسائل کی تحقیق میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو لگا دیا حتیٰ کہ آج دنیا ان علوم سے ان کی موجودہ صورت میں استفادہ کر رہی ہے۔

انگریز محققین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ: ''یورپ کے قرون وسطیٰ کے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کی بقدر کسی قوم نے انسانیت کی ترقی میں دلچسپی نہیں لی''، اس لئے صدیوں تک پوری متمدن دنیا میں عربی زبان ہی علوم وفنون اور فکر ونظر کی ترقیوں کا ذریعہ بنی رہی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں تک عربی زبان میں فلسفہ، طب، تاریخ، فلکیات وجغرافیہ وغیرہ کی بابت جو کچھ لکھا گیا وہ دوسری تمام زبانوں کی کوشش وکاوش پر فائق ہے، جس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اپنی دلچسپیوں کو محض بحث ونظر تک محدود نہیں رکھا جبکہ یونان کا یہی طریقہ تھا، بلکہ ان علوم کو تجربات کی حد میں پہنچایا، تجربہ کو علمی تحقیقات کا مدار وآلہ کار انہوں نے ہی بنایا، جسے بعد میں دوسروں نے اپنایا اور اہم انکشافات کا ذریعہ بنایا۔

ان علوم کی طرف صرف عوام کی ہی توجہ نہیں بھی بلکہ خلفاء وامراء کی بھی بڑی توجہ تھی،

چنانچہ ہارون ومامون کے عہد میں بغداد میں قائم کردہ فلکیات کے مدرسہ نے بہت سی نئی تحقیقات پیش کیں اور قدیم نظریات کی غلطیاں ظاہر کیں اور سورج وچاند سے متعلق تجربات کی روشنی میں وہ تحقیقات اختیار کیں جو آئندہ کے لئے محنت وکاوش کی بنیاد بنیں۔

علماء فلکیات میں ممتاز البستانی، ابوالوفاء، ابن یونس، حسن، ابن ہیثم بیرونی، طوسی وغیرہ ہیں جنہوں نے فلکی تحقیقات کیلئے ایسے آلات ایجاد کئے کہ ان کی بدولت بغداد وقاہرہ کی تحقیقات چین ویورپ تک پہنچیں، اندلس میں بھی اس پر بڑی توجہ رہی۔

ریاضیات میں حساب، الجبرا اور ہندسہ کے بہت سے اصول مسلمانوں نے وضع کئے بلکہ ''الجبرا'' تو مسلمانوں کی ہی ایجاد ہے اور محمد بن فرید باطنی، ثابت بن جراح، خوارزمی اس سلسلہ کے ممتاز لوگوں میں شمار کئے گئے۔

علم ''فنیریا'' مسلمانوں نے ایجاد کیا، ''کیمیا'' میں ابوموسیٰ، جعفر کوفی، ابوبکر رازی کو خصوصی شہرت حاصل رہی۔

طب تو مرکز توجہ تھا ہی، چنانچہ رازی، ابن سینا اور ابن زحد کی تصانیف صدیوں یورپ کی یونیورسٹیوں میں تحقیقات کی بنیاد بنی رہیں، علم جراحی وسرجری میں بھی نمایاں حیثیت حاصل کی، اس کے نئے اصول وضع کئے، ''ابن رشد'' کی کتاب ''کلیات'' اس سلسلہ میں نہایت اہم ہے، آج تک یورپ میں رائج ہے، دوران خون کی مکمل تحقیق ''ابن نفیس سوری'' نے پیش کی ہے۔

جغرافیہ کی معلومات میں بڑی وسعت پیدا کی اور اپنے اسفار کی بناء پر جس سے عربوں کو مزاجاً بڑی مناسبت تھی، وافر معلومات جمع کیں، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ: ''عرب بہت پہلے امریکہ پہنچ چکے تھے''، مسعودی نے چین ومڈغاسکر تک کا دورہ کیا تھا، مامون کے عہد میں خوارزمی اور اس کے رفقاء نے آسمان وزمین کا نقشہ بنا کر کرۂ ارض کی پیائش کی تھی اور اسی نے آسمانی کرہ بنایا، سب سے زیادہ نامور یاقوت حموی ہیں، جن کی مرتب کردہ

معلومات چھ جلدوں میں بنام "معجم البلدان" دستیاب ہیں، بیرونی اور اصطخری نے بھی بڑا کام کیا ہے، مسلمانوں کے مرتبہ کردہ بحری نقشے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے، حتیٰ کہ "واسکوڈی گاما" نے انہیں کو استعمال کیا تھا۔

فلسفہ کے سلسلہ میں ایک خاص کام یہ کیا کہ فلسفیانہ مسائل کو دینیات کے ساتھ تطبیق دی، یہ کام خاص طور سے فارابی وابن رشد نے انجام دیا، ابن سینا اپنے افکار میں افلاطون وارسطو کی نظیر سمجھا گیا، ابن رشد ارسطو کا سب سے بڑا شارح اور اہل یورپ سے اس کا تعارف کرانے والا قرار پایا۔

ذکر کیا جاچکا ہے کہ ان علوم میں عربوں کا سب سے بڑا امتیاز تجربہ ومشاہدہ رہا ہے جسے آج عصری تحقیقات ومعلومات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، یہی اس کے موجد اور اولین اپنانے والے تھے، جب کہ یورپ صدیوں تک بس اساتذہ کی آراء کو دہراتا رہا۔

اور جیسے عربوں نے دینی وعربی علوم کو خوب پھیلایا، ان تمام علوم کی بھی خوب نشر و اشاعت کی، حتیٰ کہ انگریزوں کو کہنا پڑا کہ صدیوں تک وہ تن تنہا اساتذہ تھے، جن سے عیسائی دنیا واقف تھی، قدیم یونانی ولاطینی علوم سے واقفیت انہیں کی مرہون منت ہے، یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی کتب کے ترجمہ پر اعتماد ختم ہوگیا اور ان کی اپنی کتابوں نے ان کی جگہ لے لی، ورنہ مسلمانوں کی کتابیں ہی ترجمہ کے ذریعہ پڑھی وپڑھائی جاتی تھیں، اسی سے اندازہ لگایئے کہ ابن ماجہ اندلسی کی ۲۶، امام رازی کی ۶۸، ابن رشد کی ۸۹ کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا، ابن زبیر زہراوی کی کتابوں سے یورپ نے آپریشن وجراحی کا فن سیکھا۔

مسلمانوں کے صنعتی وتمدنی کارنامے

دور حاضر کا انسان بلکہ خود مسلمان بھی قوم مسلم کو ایک پسماندہ ذہن وصلاحیت کی قوم قرار دیتا ہے، جس کا کام دوسروں کی جدوجہد پر گذر کرنا ہے، خود کچھ کرنا دھرنا نہیں جانتی، جس کی وجہ یہ ہے کہ آج صنعتی اور بالخصوص مشینی ترقیوں میں اس کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا بہترین دماغ ہر دور وعہد میں دین اور علوم دین کی خدمت لگا رہا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کے کارنامے بے مثال وبے نظیر ہیں، لیکن جیسے علوم دینیہ کے علاوہ دوسرے بے شمار علوم وفنون سے اس درجہ دلچسپی لی کہ دنیا نے ان کی تحقیقات وخدمات کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے، حسب موقع صنعتی ومشینی ترقیوں سے بھی دلچسپی رکھی اور خوب رکھی بلکہ اس حد تک کہ بہت سی چیزوں کی ایجاد کا سہرا ان کے سر ہے اور اس سلسلہ کے کئی کارنامے انہوں نے اس وقت انجام دیئے جب کہ امریکہ و روس ویورپ کا نہ تو کوئی نام تھا اور نہ ہی کوئی کام، ان کی یہ دلچسپیاں چھوٹی چھوٹی گھریلو ضروریات سے لے کر بڑی بڑی ملکی وعالمی ضروریات تک سے متعلق تھیں اور آپ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جس خطہ وملک میں کچھ عرصہ اس قوم نے امن وسکون سے گذارا ہے، اس خطہ وملک میں آج تک اس سلسلہ کی یادگاریں قائم ہیں، خواہ آج وہاں ان کی حکومت قائم ہو یا نہیں، اس سلسلہ کی عام وامتیازی چیز وہ تعمیری شاہکار ہیں جو دنیا کے طول وعرض میں بے شمار ممالک میں موجود ہیں اور آج تک دنیا والوں سے اپنے معماروں کے حق میں خراج عقیدت وصول کر رہے ہیں، خواہ مساجد ومقبرے و مینار ہوں، یا قلعے ومحل، خواہ ٹرکی، مصر، شام وسعودیہ میں ہوں یا اسپین وہندوستان میں۔

اسی طرح عام انسانی ضروریات کی تیاری وفراہمی کے امتیازی کام وکارخانے ہر ملک

میں پائے جاتے رہے، البتہ ''اندلس'' (حال اسپین) جسے علم وفن میں یورپ کا استاذ ہونے کا شرف حاصل ہے، اسے ان چیزوں میں خصوصی امتیاز حاصل رہا ہے، وہاں کے ایک شہر ''اشبیلیہ'' میں اعلیٰ قسم کے کپڑے تیار کرنے والے سولہ ہزار کارخانے تھے، جن میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی کام کرتے تھے اور بعض دوسرے شہروں میں ریشم واطلس اور بانات کے کپڑے تیار کرنے والے چھ ہزار کارخانے اور آٹھ سو کارخانے کشیدہ کاری اور چادروں پر بیل بوٹے بنانے والے تھے، شہر مالقہ کے چینی اور شیشے کے برتن اور دوسری چیزیں صدیوں پہلے شہرت رکھتی تھیں، حتیٰ کہ آج تک عربوں میں عمدہ پلیٹ وبرتن کو ''مالقی'' کہتے ہیں، کاغذ کی صنعت کو ترقی دینے والے ''اہل شاطبہ'' ہیں، بلکہ طباعت کی سب سے پہلی مشین اندلس میں ہی بنائی گئی تھی، منقول ہے کہ: چوتھی صدی ہجری میں سلطان ناصر کے وزیراعظم عبد الرحمٰن بن بدر شاہی مضامین کو لکھ کر چھپنے کیلئے بھیجتے تھے اور چھپنے کے بعد اس کی ایک ایک کاپی اپنی قلم رو میں بھیجتے تھے، عباس بن فرناس اندلسی نے ایک مکان میں آسمان وزمین اور ستاروں کی ہیئت بنائی تھی جس میں کڑک، بجلی اور بادل وبارش وغیرہ کی پوری کیفیت دکھائی گئی تھی، اسی نے انسانوں کے فضا میں اڑنے کیلئے پر ایجاد کئے تھے، جن کو بازو سے باندھ کر آدمی فضا میں اڑسکتا تھا، زمین کی آبپاشی، شہر کی صفائی، روشنی کا مکمل انتظام، جہازوں کی آمدورفت کا باقاعدہ نظام، یہ تمام چیزیں اہل اندلس بہت پہلے کر چکے تھے، قرطبہ میں اتنی روشنی ہوتی تھی کہ شہر کے باہر آٹھ نو میل تک لوگ شہر کی روشنی میں چلتے تھے، مکانات کو ٹھنڈا وگرم رکھنے کا نظام بڑے اعلیٰ پیمانے کا تھا، پچھلے مضمون میں آپ نے پڑھا ہے کہ آج کی طبی تحقیقات دراصل مسلمانوں کی مرہون منت ہیں، طبی دنیا میں آپریشن جیسا اہم عمل ایک مسلمان کی کتاب سے ہی اہل یورپ نے سیکھا، جہاز رانی کے ماہر وامام عرب ہی سمجھے گئے، اسی لئے ان کے بحری نقشے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے، فلکیات وکونیات جن کے مسائل پر سائنس کی سب سے زیادہ توجہ ہے اور اصل کاوش ومحنت ان

کے پیچھے صرف کی جارہی ہے، مسلمانوں نے بہت پہلے ان کو مرکز توجہ بنایا اور سائنس کے بنیادی اصول ''تجربہ ومشاہدہ'' کی بابت انگریز محققین کا فیصلہ ہے کہ اس کے موجد اور اولین اپنانے والے عرب ہی تھے۔

ابوعبداللہ بن یوسف خوارزمی نے سیاروں کی دوری معلوم کرنے کا آلہ، ابوالقاسم اندلسی نے قطب نما، عمر خیام نیشاپوری نے جنتری وکلنڈر، حکیم فتح اللہ نے آٹا چکی وبارود کی بندوق، حکیم احمد بن یونس نے گھڑی، ابن ماجہ اندلسی نے شکر بنانے کی مشین ایجاد کی، توپ عربوں نے ایجاد کی، فلکیات کے ماہر مسلمان علماء نے فلکی تحقیقات کے لئے متعدد آلات ایجاد کئے۔

اسلام میں اجتماعیت

انسانی زندگی میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ انسان اپنی فطرت اور طبعی ضرورتوں کی وجہ سے اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور ہے، انسانیت تہذیب وتمدن سے خواہ کتنی ہی دور رہی رہو، لیکن حکماء ہر زمانے میں عملی حکمت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے رہے، تہذیب نفس (ذاتی اصلاح)، تدبیر منزل (گھریلو نظم)، سیاست مدُن (شہری وملکی نظم)، تہذیب نفس کا تعلق اگرچہ ذاتی وانفرادی زندگی سے ہے اور اجتماعی زندگی سے باقی دو کا، ایک کا گھر کی حد تک دوسرے کا اس کے باہر سے جتنی بھی وسعت ہوتی جائے خاندان وقبیلہ، گاؤں وقصبہ، شہر وملک، سب اس کے تحت آتے ہیں، لیکن اول بھی اس سلسلہ میں بے سود نہیں ہے، بلکہ بقیہ دو کا حاصل ہونا اسی پر موقوف ہے، اس لئے کہ جب تک کوئی انسان اپنی ذاتی وانفرادی زندگی میں اپنے احوال واعمال کو ایک لائن کا پابند نہ بنائے؛ باہر کی زندگی میں بھلا ایسا کیوں کر کر سکتا ہے، بہرحال انسان ہر دور میں اس سے واقف، اس کا قدردان اور اس کا پابند وعادی رہا ہے، گذشتہ عہد کا، قبائل و خاندانی نظام جواب بھی دنیا کے بہت سے حصوں میں موجود وبرقرار ہے وہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

دوسری طرف انسانوں میں مزاج وذوق کا اختلاف بھی ایک فطری وطبعی چیز ہے، جس سے اس اجتماعیت میں خلل وانتشار پیدا ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات اسی اختلاف ذوق ومزاج کی وجہ سے اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں بہت سی انسانی ضروریات و مصالح ضائع وبرباد ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ اجتماعیت کے بغیر باہمی وآپسی تعاون حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ تعاون انسانی زندگی کے گذران کا ایک اہم رکن ہے، اس لئے انسان کو

اس اجتماعیت کا پابند بنانے کی غرض سے وحدت واتفاق کے مختلف نُقاط ونکات تلاش کئے جاتے ہیں اور اس کے کندھے پر مختلف جوئے رکھے جاتے ہیں، خواہ وہ اخلاقی اصول و معاشرتی آداب ہوں، یا سیاسی نظام وقوانین وغیرہ۔

اسلام اس اہم ضرورت سے کیسے صرف نظر کر سکتا تھا، اس لئے اسلام نے نہ صرف یہ کہ اجتماعیت کو برقرار رکھا بلکہ اس کی تائید وتقویت کی اور اس کو قائم ودائم رکھنے کے ذرائع میں اضافہ ہی کیا، ''اخلاقی نظام'' کی بنیادیں گہری ووسیع کیں، ''معاشرتی نظام'' کو نکھارا اور سنوارا، ایک ہمہ گیر مضبوط ومستحکم ''سیاسی نظام'' برپا کیا اور اس کی اہمیت کو جتلایا وبتلایا اور اصولاً ایسے امور کو وحدت واتفاق کا نقطہ قرار دیا جو ہر ایک کے اختیار میں ہوں، اسی لئے لباس اور کھانے پینے وغیرہ میں کسی خاص شکل ومخصوص اشیاء کا پابند نہیں بنایا، اسی کے پیش نظر عبادات میں بھی ایسی صورتیں اختیار کیں جو اجتماعیت کا ذریعہ بنیں اور اسے تقویت دیں، چنانچہ دن میں پانچ وقت کی نماز رکھی اور وقت کی تعیین کردی، وقت کے انتخاب وتعیین کو ہر ایک کی رائے پر نہیں چھوڑا، پھر مسجد میں جماعت کے ساتھ ادائیگی کا حکم دیا، اس کے اہتمام پر زور دیا، حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا کہ مسجد کے پڑوسی کو تو مسجد میں ہی نماز پڑھنی چاہئے اور وہ بھی اس طور پر کہ جماعت میں شریک تمام افراد ہر عمل کو ایک وقت میں، یکساں ہیئت کے ساتھ، ایک ہی جانب رخ کرکے اور ایک ہی آواز پر ادا کریں، یہ تو شب وروز کا پنجوقتہ نظم ہے، ہفتے میں علاقے علاقے کی کئی کئی مسجدوں کے لوگوں وجماعتوں کو یکجا ہو کر جمعہ کی ادائیگی کا حکم دیا اور سال میں دو مرتبہ پورے شہر وبستی کے لوگوں کا یکجا دوگانہ عید وبقرعید کی ادائیگی اور حج کے موقع پر سال کے مخصوص دنوں میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک خاص ہیئت کے ساتھ اجتماع، سب اسی اجتماعیت کی کڑیاں، اسی کی صورتیں اور اسی کے قیام وبقاء کی تدبیریں ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کو اس سے سمجھئے کہ جماعت سے ذرہ برابر علاحدگی

کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت مذمت فرمائی ہے، ہر حال میں اجتماعیت و جماعت کا پابند رہنے کا حکم فرمایا ہے، خواہ انسان حضر میں ہو یا سفر میں، دو یا اس سے زائد آدمی سفر کریں یا کہیں کھیت وغیرہ پر کام کے سلسلے میں اکٹھا ہوں تو بھی کسی کو امیر و ذمہ دار تجویز کر لیں تا کہ اجتماعیت قائم رہے، حضر میں بستی اور شہر و ملک کے نظام کیلئے تو یہ حکم ہے ہی، گھریلو مصالح کی حفاظت و رعایت کے پیش نظر مرد کو پورے گھریلو نظام کا سربراہ بنایا گیا ہے اور عورت کو گھر کے اندرونی نظام کا، ارشاد ربانی ہے:

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ـــــــــ

اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی نہ کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی تو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کیلئے امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اسکو جہنم میں داخل کر دیں گے۔

احادیث میں یہ مضمون بکثرت آیا ہے، ایک حدیث میں ہے: ''جو شخص ایک بالشت کی بقدر بھی مسلمانوں کی جماعت سے علاحدگی اختیار کرتا ہے وہ اہل جاہلیت (یعنی اہل کفر

وشرک) کی موت مرت ہے''، ایک حدیث میں ہے: ''اگر کوئی آدمی اس امت کی اجتماعیت کو پراگندہ و منتشر کرنا چاہے تو اسے قتل کر ڈالو''، ایک حدیث میں ہے کہ: ''جس شخص نے ایک بالشت کی بقدر بھی جامعیت سے علاحدگی اختیار کی اس نے اپنی گردن سے اسلام کے پٹکے کو جدا کر دیا، ہاں یہ کہ اس حرکت سے باز آ جائے''، ایک حدیث میں ہے: ''امت کے سواد اعظم (یعنی بڑے حصہ) کی اتباع کرو اور اسی کے ساتھ رہو، اس لئے کہ جو الگ ہوا وہ الگ ہو کر جہنم میں گیا''۔

اسلام کا سیاسی نظام

اسلام چونکہ ایک ہمہ گیر مذہب اور انسانی زندگی کا مکمل دستور ہے، اس لئے انسانی زندگی کے کسی پہلو و شعبے کو دین سے الگ نہیں قرار دیتا ہے اور احکامات وہدایات کے حق میں کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، ''سیاسیات'' جسے ہر دور وعہد میں اجتماعی زندگی کے قیام اور بقاء وحفاظت کیلئے نہایت اہم اور مؤثر سمجھا جاتا رہا، اس لئے کہ دینی، اخلاقی، معاشرتی دباؤ کے علاوہ کوئی دوسرا دباؤ اگر انسان محسوس کرتا ہے، بلکہ یوں کہئے کہ جس دباؤ کو ہر کس و ناکس اور سرکش سے سرکش آدمی بھی محسوس کرتا ہے، وہ سیاسی دباؤ اور زور حکومت ہے، اسلام نے اس کے بھی مکمل اصول انسانیت کو عطا کئے ہیں اور کسی مرحلہ میں سیاسی معاملات کو دین سے علاحدہ کرنا پسند نہیں کیا ہے، بلکہ بقول شاعر ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

قرآن وسنت اور علماء امت نے اس کو نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے اور اس کے قیام کی ضرورت ومصالح، اس کے نفاذ کے اصول وقواعد اور اس کی بقاء وحفاظت کے ذرائع کو بڑی تاکید وتفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ———— اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی۔

علماء تفسیر کی ایک بڑی جماعت نے ''اُولِي الْاَمْرِ'' کا مصداق ارباب حکومت کو بتایا ہے، روایات تو بے شمار ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

۱. جو میری اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور جو میری نافرمانی کرتا

ہے وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور جو سربراہ کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے اور جو سربراہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے، امیر، سربراہ تو ایک ڈھال ہوا کرتا ہے جس کو جنگ وقتال کے موقع پر آڑ بنایا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ (آفات ومصائب اور دشمنوں سے) بچا جاتا ہے۔

۲. سنا کرو اور مانا کرو اگرچہ کوئی حبشی غلام تمہارا امیر وسربراہ کیوں نہ بنا دیا جائے۔

۳. جو آدمی اپنے سربراہ کی جانب سے کوئی ایسی چیز دیکھے جو اسے ناگوار گذرے تو صبر کرے اس لئے کہ جماعت سے ایک بالشت کی بقدر بھی علاحدگی کی حالت میں مر جانا جاہلیت کی موت مرنا ہے۔

۴. خبردار اگر کوئی آدمی اپنے امیر کو کوئی معصیت کرتے دیکھے تو اس معصیت کو ناپسند کرے مگر اپنا ہاتھ اس کی اطاعت سے نہ کھینچے۔

۵. اگر تمہارے سربراہ تم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور تمہارے حقوق ادا نہ کریں تو بھی ان کی سنو اور مانو اس لئے کہ وہ اپنے ذمہ دار ہیں اور تم اپنے ذمہ دار ہو۔

۶. جو آدمی اپنے سربراہ کی اہانت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد ہے کہ: ''حضورؐ کو جہاں جانا تھا تشریف لے گئے، اب دین کی بقاء وحفاظت کیلئے کوئی ایسا آدمی ضروری ہے جس کے ذریعہ اس کا قیام ہو''، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اجتماعیت کے بغیر اسلام نہیں اور اجتماعیت حکومت کے بغیر نہیں''، ابن خلدونؒ کا بیان ہے کہ: ''شرعاً کسی امام وامیر کو متعین کرنے کا وجوب صحابہؓ وتابعین کے اجماع سے ثابت ہے''، ابن تیمیہؒ کا بیان ہے کہ: ''انسانوں کی باہمی احتیاج وضرورت کی بناء پر اجتماعیت کے بغیر ان کے مصالح نہیں پورے ہو سکتے اور اجتماعیت کیلئے کوئی سربراہ ضروری ہے''، محققین نے تصریح کی ہے کہ: ''چونکہ بہت سے شرعی احکام اور ملی مسائل بغیر کسی سربراہ اور اجتماعی نظم کے پورے نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی سربراہ کی تجویز وتعیین پر پوری

امت کا اتفاق ہے''، یہی وجہ ہے کہ امت اس کی اہمیت سے غافل نہیں رہی، حضورؐ کے عہد میں تو حضورؐ ہی سب کچھ تھے، لیکن آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی تدفین سے زیادہ اہم اس کو قرار دیا، چنانچہ سب سے پہلے اس کو حل کرنے کی فکر کی، حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے حضرت عمرؓ کو جانشین کیا اور حضرت عمرؓ سخت زخم و تکلیف سے دوچار ہونے کے باوجود اپنے بعد کے لئے چھ افراد کو نامزد کر گئے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انتشار کے باوجود ارباب حل وعقد صحابہؓ نے انہیں چھ میں سے ایک کو اپنا سربراہ بنالیا اور برابر یہ نظم وسلسلہ ہر خطہ وعلاقے میں چلتا رہا۔

سربراہ کے انتخاب کے شرعی طریقے تین ہیں: ایک جس کے ذریعہ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ہوا یعنی ضرورت پر اہل حل وعقد کا باہمی مشورے سے کسی ایک کو طے کرلینا، دوم جس کے ذریعہ حضرت عمرؓ کا انتخاب ہوا کہ سابق سربراہ کسی کو نامزد کر جائے، سوم جس کے ذریعہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا کہ سابق سربراہ ایک کے بجائے چند افراد کو نامزد کر جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو طے کرلیا جائے ـــــ اور اگر اس کے بجائے چوتھی صورت پیش آئے کہ کوئی زور وزبردستی سے خود سربراہ بن جائے تو فتنہ وفساد سے بچنے اور امن وامان کی خاطر اس کو ہی سربراہ مان لیا جائے گا، جس کو سربراہ منتخب کیا جائے مسلمان، عاقل و بالغ، مرد ہونے کے ساتھ صالح ومتقی بھی ہونا چاہئے اور عالم ہو تو کیا پوچھنا، سربراہ اعلیٰ کے لئے خاندان قریش سے ہونا بھی ضروری ہے ـــــ سربراہ منتخب ہونے والا حقوق میں دوسروں کے برابر ہی ہوتا ہے، محض سربراہی کی وجہ سے دوسروں سے زائد استحقاق نہیں رکھتا اور سربراہی کے باوجود نظام کار شورائی ہوگا، یعنی ارباب حل وعقد کی ایک مجلس شوریٰ ہوگی، جس کے تعاون سے وہ کام کرے گا اور اس سے مشورے لے کر مسائل کو حل کرے گا، یہ شوریٰ خاص بھی ہوتی ہے جس کے ممبران بڑے اہل علم واہل دانش ہوں گے اور عام بھی کہ ضرورت پر ان کے علاوہ دوسروں سے بھی مشورہ لیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء کا عمل رہا، البتہ یہ ضروری نہیں کہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے مشورہ کا ہی وہ پابند ہو، بلکہ مشورہ لے کر حسب مصلحت خود اپنی رائے پر بھی عمل کرسکتا ہے، ایسے ہی اس کے فیصلوں پر حدود شرع میں رہتے ہوئے دوسروں کو حق اعتراض بھی حاصل ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ خود اپنی رائے پر عمل کرنا یا امیر کے کسی فیصلے پر اعتراض اور رد وقدح شر وفساد کی نیت سے نہ ہو ـــــ ساری رعایا پر اس کی اطاعت ضروری ہے، شرط یہ ہے کہ صادر کردہ حکم شریعت کے خلاف نہ ہو، خلاف شریعت اطاعت جائز نہیں، لیکن ایسے کسی حکم کے صادر کرنے یا سربراہ کی بدکرداری پر بغاوت برپا کرنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ جہاں تک ہوسکے نباہا جائے گا، ہاں اگر مصالح کا تقاضا یہی ہو کہ اب وہ اس منصب پر نہ رہے اور کسی فساد وبڑے انتشار کے بغیر یہ مقصد حاصل ہوجائے تو ایسا کیا جاسکتا ہے، حالات کے پیش نظر خود بھی وہ علاحدہ ہوسکتا ہے۔

جہاں تک سوال ہے شعبہ جات اور نظام کار کی تقسیم کا، تو شریعت نے جیسے دیگر بہت سے معاملات میں اصول کو پیش کیا ہے اور جزئیات وصورتوں کا پابند نہیں بنایا ہے، اس میں بھی یہی کیا ہے، بلکہ اس میں خاص طور سے چند اصولی چیزوں کا پابند بنا کر نظم وانتظام اور تقسیم کار کی صورتوں میں آزاد رکھا ہے، بس بنیادی طور پر اس امر کا پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اقتدار اعلیٰ اور حکومت دراصل اللہ کی ہے، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور بندوں کو اس نے محض اپنا نائب بنا رکھا ہے، ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلَائِفَ فِی الْاَرْضِ (وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب وجانشین بنایا ہے) اس لئے تمام شعبہ جات وکار ہائے نظم وحکومت میں فیصلہ کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی بنایا جائے گا یا ان کی روشنی میں حاصل ہونے والے احکام کو اور اگرچہ کیسی ہی شدید ضرورت ہو مگر ان سے سرمو انحراف کی گنجائش واجازت نہیں۔

نظم مملکت جتنا وسیع ہوگا اتنی ہی شعبہ جات کی وسعت اور کارکنندگان کی کثرت ہوسکتی

ہے تاکہ جولوگ اس کے زیر سایہ رہنے والے ہیں بحسن وخوبی ان کی ضروریات پوری ہو سکیں، خواہ اقتصادی ومعاشی ہوں، یا اخلاقی ومعاشرتی، یا دینی ومذہبی اور علمی وعملی ہوں یا مالی وجانی ہوں۔

اسلامی مملکت میں رہنے والی رعایا اصولاً تین حصوں میں منقسم ہوتی ہے، اول مسلمان جو اس کے اصل باشندے وکارندے ہوتے ہیں، دوم ذمی غیر مسلم باشندے جو سکونت کا ٹیکس ادا کرتے ہیں اور پابند ومطیع بن کر رہتے ہیں، سوم مستامن کسی غیر مسلم مملکت کا غیر مسلم باشندہ جو کسی ضرورت سے عارضی طور پر اجازت کے ساتھ قیام کرتا ہے ور ہتا ہے۔

اسلامی حکومتیں

انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت ومحنت کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ سارے انسان اللہ کے احکام کے پابند بن کر یا کم از کم اس کے سامنے دب کر رہیں، اس کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام اپنے ماننے والوں کی پوری نگرانی بھی کرتے ہیں اور حالات ومصالح کا لحاظ فرما کر نہ ماننے والوں کی مدافعت وسرکوبی بھی، یہی نگرانی ومدافعت کبھی کبھی حکومت کی صورت اختیار کرلیتی ہے، اس لئے کہ ماننے والے افراد کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ نگرانی کے دائرہ میں بھی وسعت ہوتی جاتی ہے، حتیٰ کہ جب پورے ایک علاقے، شہر وملک کے لوگ ماننے والے بن جاتے ہیں تو یہ نگرانی خود بخود حکومت وسلطنت سے بدل جاتی ہے، جو اپنے حدود کے اندر رہنے والوں کی نگرانی اور باہر والوں کی مدافعت کرتی ہے، جس سے مزید قوت و وسعت حاصل ہوتی ہے، حتیٰ کہ نہ ماننے والوں کے سر پر مسلط ہو کر منواتے ہیں اور سر نہ جھکانے والوں سے زبردستی سر خم کراتے ہیں اور مقصد صرف اللہ کی اطاعت اور اس کے نام وکلمہ کی سربلندی ہوتی ہے۔

دنیا میں اسلامی حکومت اسی ترتیب سے قائم ہوئی ہے، حکومت کو مقصود بنا کر کوئی محنت نہیں کی گئی ہے، نہ اس کو مقصود بنایا گیا ہے، پہلے افراد پر محنت کی گئی، اس محنت کے نتیجہ میں افراد اور ان سے جماعت بنی، جماعت سے معاشرہ بنا، یہ معاشرہ حکومت میں تبدیل ہو گیا، جس نے ترقی کرتے کرتے اتنی قوت ووسعت حاصل کرلی کہ سلاطین عالم اس کے سامنے سرنگوں ہوئے اور دنیا کی ممتاز ترین طاقتیں اس کے سامنے زیر ہو گئیں۔

قرآن کریم نے انسانوں کی پیدائش کا اصل مقصد عبادت خداوندی کو بتایا ہے اور پھر اس کی انجام دہی پر قیام حکومت کا وعدہ کیا ہے، ارشاد ہے:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا

اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ــــــــــــ کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ــــــــــــ

تم میں جولوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کیلئے پسند کیا ہے اس کو ان کیلئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کردے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا، جس سے افراد اور پھر ان کی جماعت تیار ہوئی جو بندشوں و پابندیوں کے باوجود انفرادی و اجتماعی طور پر احکام شرع کو انجام دیتے رہے ـــ پھر آپؐ مع صحابہؓ مدینہ تشریف لے گئے تو چونکہ وہاں کی اکثریت نے آپؐ کی دعوت کو قبول کرلیا تھا، اس لئے یہاں پہلا آزاد اسلامی معاشرہ وجود میں آیا اور پھر اولین اسلامی مملکت کا قیام وقوع میں آیا، جس میں باقاعدہ اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا، حکومتی سطح وطرز پر قرب وجوار کے لوگوں سے معاملات کئے گئے، تبلیغی جدوجہد بھی جاری رہی، کفار مکہ کے حملہ آور لشکروں سے مقابلے ہوئے، قرب وجوار کی بستیوں میں دعوت اور بعض مرتبہ ان کی سرزنش وتنبیہ کیلئے صحابہؓ کی جماعتیں اور لشکر بھی حضورؐ کی سرکردگی میں اور کبھی آپؐ کے بغیر آتے جاتے رہے، یوں قبیلے کے قبیلے اور علاقے کے علاقے مسلمان ہوتے رہے یا مسلمانوں کے ماتحت آتے رہے، جگہ جگہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہوتی رہی اور اس کی بنیاد پر اسلامی حکومت کا نظم وقیام ہوتا رہا، حتیٰ کہ آپؐ کی وفات تک تقریباً پورا جزیرۃ العرب اسلامی مملکت کے حدود میں داخل ہوگیا اور آپؐ نے مختلف علاقوں میں اپنے گورنر وحکام متعین فرمائے، آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء اور سلاطین اس سلسلہ کو وسعت

دیتے رہے، حتیٰ کہ پچاس سال کے قلیل عرصے میں نصف سے زائد دنیا پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی، ایرانی حکومت پاش پاش ہوگئی، رومی حکومت کو عرب علاقوں سے دور پناہ لینی پڑی، پورا براعظم؛ ایشیاء، افریقہ، یورپ کا بڑا حصہ نہ جانے کتنے جزائر ان کے ہاتھ میں رہے اور صدیاں گذر جانے کے بعد اور حکومتوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ آج اس کی ہے، کل اُس کی، ان سب کے باوجود آج تک دنیا کے بہت بڑے حصہ پر مسلمانوں کا تسلط ہے اور کچھ حصہ وخطہ ایسا ہے کہ جو روز اول سے آج تک مسلمانوں کے ہاتھ سے نہیں نکلا، حالانکہ بڑے سے بڑے طوفان آکر گذر گئے؛ صلیبی طوفان بھی آیا اور تاتاری طوفان بھی، مگر حرمین تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔

یوں تو انتظامی مصالح کے علاوہ دیگر حالات کی بناء پر بھی اسلامی حکومت چھوٹے بڑے مختلف حصوں میں منقسم رہی اور مختلف زمانوں وعلاقوں میں، مختلف عناوین کے ساتھ یاد کی جاتی رہی، لیکن اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اجتماعیت کا جو سبق پڑھایا اس کی بناء پر بہت کم عرصہ ایسا گذرا ہے جس میں اسلامی حکومت اجتماعیت اور کسی نہ کسی مرکز سے خالی رہی ہو، خواہ یہ اجتماعیت ومرکزیت رسمی ہی کیوں نہ رہی ہو، خلافت راشدہ، خلافت بنوامیہ، خلافت عباسیہ، پھر خلافت عثمانیہ، یہ اسی مرکزیت کے عناوین رہے ہیں، سوء اتفاق کہ یہ صدی اس رسمی مرکزیت واجتماعیت سے بھی محروم ہے۔

مرکزی اسلامی حکومتیں

خلافت راشدہ وحکومت بنی اُمیہ

یوں تو چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں وحکومتیں بہت ہوئیں ہیں اور آج بھی ہیں، مگر بڑی ومرکزی حکومتیں خلفاء راشدین کے عہد سے لے کر آج تک جو گذریں وہ حسب ذیل ہیں، خلافت راشدہ کا عہد، مرکزی اموی حکومت، اندلسی اموی حکومت، مرکزی عباسی حکومت، مصری عباسی حکومت، ترکی کی عثمانی حکومت، ہندی حکومتیں۔

خلافت راشدہ کا عہد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن یعنی ۹/ربیع الاول ۱۱ ہجری سے شروع ہو کر حضرت حسنؓ کی ششماہی خلافت پر یعنی ربیع الاول ۴۱ھ پر ختم ہوتا ہے، کل عرصہ تیس سال، اس عرصہ میں پانچ حضرات نے اس منصب کو شرف بخشا (۱) حضرت ابوبکر، عرصۂ حکومت: دو برس، تین مہینہ، دس دن (۲) حضرت عمرؓ، عرصۂ حکومت: ساڑھے دس سال (۳) حضرت عثمانؓ، عرصۂ حکومت: دس دن کم بارہ سال (۴) حضرت علیؓ، عرصۂ حکومت: چار سال، آٹھ ماہ، ۲۷ دن (۵) حضرت حسنؓ، عرصۂ حکومت چھ ماہ، اصلاً صحیح اسلامی حکومت کا نمونہ عہد خلافت راشدہ میں دیکھنے میں آیا اور اس عہد میں پوری آب وتاب کے ساتھ اسلامی حکومت قائم رہی، جزیرۃ العرب تو پہلے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں آچکا تھا، حضرت عمرؓ کے عہد میں ایرانی حکومت کا بالکل خاتمہ ہوگیا، شام ومصر سے رومن حکومت ختم ہوگئی، مشرق میں سندھ وچین تک اسلامی حکومت پہنچ گئی، مغرب میں مسلمان افریقہ کو فتح کرتے ہوئے یورپ تک پہنچ گئے، مرکز مدینہ منورہ رہا، حضرت علیؓ نے کوفہ کو مرکز بنایا، حضرت عثمانؓ کے عہد میں پہلی بحری جنگ ہوئی، حالات کو دیکھ کر حضرت حسنؓ نے یہ منصب حضرت معاویہؓ کے سپرد کر دیا۔

بنو امیہ کا عہد ربیع الاول ۴۱ھ سے لے کر ذی الحجہ ۱۳۲ھ تک رہا، کل عرصہ ۹۲ سال، جس میں چودہ حکمراں ہوئے، آغاز حضرت معاویہؓ سے ہوا اور اختتام ''مروان الحمار'' پر، حضرت معاویہؓ کے علاوہ ان کے صاحبزادے یزید، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبد الملک اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بہت مشہور ہوئے، حضرت عمرؓ کے کارناموں کی وجہ سے ان کو پانچواں ''خلفیہ راشد'' کہا جاتا ہے، حضرت معاویہؓ چونکہ مدتوں سے شام کے علاقہ میں تھے، اس لئے انہوں نے دمشق کو ہی مرکز قرار دیا، بحری جنگ پر ان کی ہمیشہ توجہ رہی، حکومت ملنے پر اسے کافی ترقی دی، حتیٰ کہ تقریباً پچاس لڑائیاں لڑی گئیں، جہاز سازی کے کارخانے قائم کئے گئے، ڈاک کے شعبہ کی ایجاد ہوئی، یزید کے عہد کا سب سے اہم واقعہ حضرت حسینؓ کی شہادت ہے، عبدالملک نے اسلامی سکہ رائج کیا، فتوحات کا سلسلہ اس عہد میں بھی رہا، خاص طور سے ولید کے زمانے کو امتیاز حاصل ہے، روس وچین کے علاقے نیز صوبہ سندھ ملتان تک اور یورپ کا مشہور ساحلی علاقہ اندلس (موجودہ اسپین) اسی عہد میں فتح ہوئے، اسی عہد میں دمشق کی مشہور مسجد ''جامع اموی'' تعمیر کی گئی، جس کی دلکشی آج بھی برقرار ہے، اس وقت دنیا جہاں کے لوگ اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کو دیکھنے آیا کرتے تھے، ان کی حکومت کا خاتمہ بنوعباس کے ذریعہ ہوا۔

عباسی حکومت

تیسرے مرحلے میں اسلامی حکومت بنوعباس کو ملی اور وہ یوں کہ حضرت علیؓ کے محبین و متعلقین بنوامیہ کے خلاف کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے، بنوعباس کا بھی ان سے تعلق ہوگیا، کام ہوتا رہا حتیٰ کہ ان کی تحریک وخفیہ دعوت نے اتنا زور پکڑ لیا کہ اموی حکومت کو زیر کرلیا، یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا حضرت عباسؓ کی اولاد تھے، ان کی حکومت دو حصوں میں رہی، ایک مرکزی حکومت: جس کا تعلق پورے عالم اسلام سے رہا، دوسری علاقائی حکومت جو مصر میں قائم رہی۔

مرکزی حکومت کا آغاز ذی الحجہ ۱۳۲ سنہ ھ سے ہوا اور اختتام ۶۵۶ سنہ ھ میں، کل مدت ۵۲۳ سال، چند دن شمار کی گئی ہے، اس عرصہ میں ۳۷ سلاطین ہوئے، ابتدائی سبھی حکمراں نامور اور مختلف اعتبار سے نمایاں رہے، لیکن چند پشتوں کے بعد ان کا وہ رعب ودبدبہ اور نظم واقتدار باقی نہیں رہا، بلکہ صرف نام رہ گیا، کام کے معاملہ میں درباری امراء اور ریاستی حکمرانوں نے غلبہ حاصل کرلیا اور حکومت کا سارا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن اس کے باوجود جو عظمت اس کو حاصل رہی اس عہد اور اس کے بعد کی کسی حکومت کو حاصل نہ ہو سکی، جب تک اس کا نام باقی رہا؛ مرکزیت اسی کو حاصل رہی، حتیٰ کہ جب یہ صرف حدود بغداد تک محدود تھی اس وقت بھی تمام مسلم حکومتیں اس کی سیادت کو تسلیم کرتی تھیں اور اس سے قطع نظر مسلمانوں کی ساری دماغی ترقیاں، علمی کارنامے، اکابر علماء اور علم وفن کے بہترین ذخائر اسی عہد کی یادگار ہیں۔

اولین حکمراں عبداللہ بن محمد سفاح اور آخری عبداللہ مستعصم باللہ، ابتدائی خلفاء جو در اصل اس سلسلہ کے مشہور حکمراں ہوئے ہیں، منصور، مہدی، ہارون رشید، مامون، معتصم و

متوکل ہیں، اس عہد میں اندرون مملکت کی مصروفیات زائد رہیں، اس لئے کہ مملکت نہایت وسیع ہوچکی تھی اور علاقے علاقے میں مختلف عنوانوں سے بغاوتیں وشرارتیں سامنے آتی رہتی تھیں، اس لئے خارجی فتوحات کا سلسلہ بہت مختصر رہا اور اسی لئے چند ہی پشتوں کے بعد زوال کے آثار ظاہر ہوگئے۔

اس حکومت کا خصوصی امتیاز اسلامی علوم وفنون کی تدوین وترویج اور وسیع پیانہ پر نشر و اشاعت اور دوسرے غیر اسلامی وغیر عربی علوم وفنون کا عربی میں ترجمہ ہے، جس کے لئے دنیا کے کونے کونے سے علماء وفضلاء جمع کئے گئے اور ان تمام کاموں میں خود حکومت نے اور ابتداء عہد کے بعض نامور حکمراں مثلاً ابوجعفر منصور، ہارون، مامون نے دلچسپی لی، ہارون نے بیت الحکمت کے نام سے ادارہ قائم کیا، مامون نے رصدگاہ تعمیر کرائی، صنعتی ترقی کے عروج کا اندازہ اس سے لگایئے کہ سردی وگرمی میں مکانات ومحلات کے گرم وٹھنڈا رکھنے کا نظم کیا جاتا تھا، برف کی سلوں کے ذریعہ اتنی ٹھنڈک پیدا کی جاتی کہ گرم کپڑوں کی نوبت پیش آتی۔

اس کا پایہ تخت ''بغداد'' تھا جسے دوسرے عباسی خلیفہ منصور نے دجلہ وفرات کے درمیان آباد کیا تھا، بعد میں معتصم کا آبادہ کردہ شہر ''سامرا'' بھی دارالخلافت بنا مگر زیادہ استعمال ''بغداد'' کا رہا، اختتام تاتاریوں کے ہاتھوں ہوا، اس کے ختم ہونے پر سارا عالم اسلام لرز اٹھا، اس لئے کہ جن حالات میں اس کا اختتام ہوا تھا وہ تو دردناک تھے ہی مزید یہ کہ امت کے نظم وانتظام کیلئے واسطہ در واسطہ صورۃً جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت چلی آرہی تھی وہ ختم ہوگئی۔

اسلامی اندلس

اندلس کا محل وقوع یورپ کا وہ جنوبی علاقہ ہے جس کی ایک جانب سمندر پار مشرقی افریقہ کے ممالک ہیں، یہیں سے مسلمان وہاں تک پہنچے تھے، اندلس کی فتح کا واقعہ اسلامی فتوحات کا ایک زریں واقعہ ہے، اس ملک پر آٹھ سو برس تک مسلمانوں کی حکمرانی رہی یعنی ۹۲ھ سے لے کر ۸۹۸ھ تک، جس کی ابتداء بنوامیہ کی مرکزی حکومت کی ماتحتی سے ہوئی اور انتہا غرناطہ کی بنی احمر کی حکومت پر، ۱۳۲ھ میں جب مرکزی اموی حکومت ختم ہوئی تو مشہور اموی خلیفہ عبدالملک کا پرپوتا "عبدالرحمٰن الداخل" کسی طرح اندلس پہنچا، وہاں مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا تھے، اس نے حسن تدبیر سے کام لے کر سارے ملک کو قبضہ میں کرلیا اور از سرنو اموی حکومت قائم کرلی جو ۱۳۸ھ سے لے کر ۴۲۲ھ تک باقی رہی، اس عرصہ میں پندرہ حکمراں ہوئے، جن میں محمد بن عبدالرحمٰن (از ۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ) اور عبد الرحمٰن بن محمد (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ) کا عہد حکومت سب سے تابناک شمار کیا گیا۔

۴۸۳ھ سے لے کر ۵۴۲ھ تک مراکش کے حکمراں یوسف بن تاشفین اور اس کی اولاد حکمراں رہی، پھر افریقہ کے حکمراں دوسرے خاندان موحدین کی حکومت ہوئی جو ۶۲۸ھ تک رہی، ان کے بعد ۸۹۸ھ تک بنواحمر کی حکمرانی رہی، حتیٰ کہ ان کے آخری حکمراں ابوعبداللہ پر اندلس کی اس اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوگیا؛ جو وقت کی متمدن ترین حکومت شمار ہوتی تھی، امویوں کے آخری دور میں اندلس میں بہت سی ریاستیں ہوگئی تھیں، یہی حشر خاندان یوسف کے نصف دور میں رہا اور موحدین کے آخری عہد میں ہوا حتیٰ کہ نوبت یہاں تک آئی کہ بنی احمر کی حکومت صرف ایک صوبہ غرناطہ میں محدود تھی مگر حکمت عملی و حسن تدبیر سے کام لے کر انہوں نے ڈھائی سو سال سے زائد عرصہ تک مسلمانوں کی شان و

شوکت کو باقی رکھا، لیکن باہمی نااتفاقی نے وہ دن دکھایا کہ اس سرزمین میں اللہ کا نام لینا اور مسلمان کہلانا جرم قرار پایا۔

مسلمانوں نے اس ملک پر اپنی خصوصی محنت وصلاحیت صرف کی حتیٰ کہ اس کے زمانہ عروج میں اس کی علمی وصنعتی شان کا مقابلہ کوئی دوسری حکومت نہ کرسکی، بلکہ علم وصنعت میں اسی کو یورپ کی قیادت واستاذی کا شرف حاصل ہے، اس کا دوست ودشمن سب کو اعتراف ہے، اسی سے اندازہ لگایئے کہ حَکَم دوم اموی کے کتب خانہ میں کئی لاکھ کتابیں تھیں جن کی فہرست ہی چوالیس جلدوں میں تھی اور ہر کتاب پر اس کی رائے ودستخط موجود تھے، تعمیرات ملکی انتظامات ورفاہی کاموں میں بھی یہاں کا اسلامی دور ایک تابناک دور ہے، غرناطہ کا قصر الحمراء، قرطبہ کی مسجد، زہرا کے محلات تعمیری سلسلہ کی لاجواب یادگاریں ہیں اور ملکی انتظامات ورفاہی کاموں میں یورپ وامریکہ نے صدیوں بعد جو کچھ کیا ہے اور ہزارہا سہولتوں کے مہیا ہونے کے بعد، اس ملک میں مسلمان بہت پہلے کر گئے، ایک شہر قرطبہ میں اسی ہزار سے زائد دکانیں، سات سو مسجدیں، نوسو حمام، چار ہزار تین سو گودام تھے، دس لاکھ سے اوپر آبادی تھی، جگہ جگہ پارک وباغ، قدم قدم پر سنگ مرمر کے فوارے، راستوں اور گلیوں میں پتھر کا فرش، سڑکوں پر سایہ وآرام حاصل کرنے کیلئے شامیانے، بڑی بڑی سرائیں سیکڑوں اسکول وکالج اور ہزاروں کی تعداد میں کپڑے وغیرہ کے کارخانے تھے۔

مصر کی عباسی حکومت

بغداد کی تباہی کے بعد عباسی خاندان کے دو شخص وہاں سے کسی طرح بھاگے، ایک ابو القاسم احمد بن ظاہر باللہ، دوسرا ابو العباس احمد مسترشد باللہ، ابو العباس تو حلب میں رہ گیا، ابو القاسم ۶۵۹ھ میں مصر پہنچا، اس زمانہ میں ''ملک بیبرس'' مصر کا بادشاہ تھا اور مصری حکومت عروج پر چل رہی تھی، اس نے بڑا اعزاز کیا، بڑا دربار منعقد کیا اور جب یہ تحقیق ہوگئی کہ ابو القاسم واقعی عباسی ہے تو چونکہ نسبت خلافت کی بناء پر عباسی حکومت اور عباسیوں سے مسلمانوں کا ایک خاص قلبی لگاؤ و تعلق تھا اس لئے اسی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلی گئی اور تباہی بغداد کے تین سال بعد مصر میں یہ سلسلہ قائم ہوگیا اور برابر چلتا رہا، اس کا اختتام پندرہویں خلیفہ متوکل سوم پر ۹۲۳ھ میں ترکوں کے ہاتھوں یوں ہوا کہ مصر و خلیفۂ مصر سب ان کے قبضہ میں چلے گئے تو یہ اعزاز متوکل نے ترکوں کی طرف منتقل کردیا، یعنی تقریباً سوا دو سو سال تک اس کا قیام رہا، اس عرصہ میں پندرہ خلفاء ہوئے، البتہ چونکہ دینی لگاؤ و تعلق کی وجہ سے ہی ان کو یہ منصب دیا گیا تھا، اس لئے بس اسی حد تک یہ محترم رہے، دنیاوی طاقت وحکومت ان کو کچھ حاصل نہیں تھی، نظم و اقتدار سب مصری حکمرانوں کا ہوتا تھا، یہ ان کے ماتحت و وظیفہ خوار ہوتے تھے، تاہم جہاد و جنگوں میں شریک ہوتے تھے، چنانچہ ابو القاسم چند ہی ماہ بعد تاتاریوں سے مقابلہ کے دوران شہید ہوگیا اور اس کے بعد مصریوں نے حلب سے ابو العباس کو بلاکر اسے یہ منصب دیا۔

بغداد کی عباسی حکومت کا بھی چند پشتوں کے بعد یہی حال ہوگیا تھا کہ حکمراں و خلفاء، درباری امراء اور اثر رسوخ رکھنے والے رؤسا کے زیر احسان و زیر کرم ہوتے تھے، یہی معاملہ عثمانی سلاطین کا بھی ہوا جیسا کہ آپ پڑھیں گے، البتہ چونکہ ''خلافت'' کے عنوان کی

عظمت تھی اس لئے کہ اس کو بالواسطہ حضورؐ کی نیابت سمجھا جاتا تھا، اس لئے یہ سلسلہ قائم رہتا اور چلتا رہتا تھا حتیٰ کہ اسی نسبت کی وجہ سے ان حکومتوں کے ماتحت نئے ریاست دار و امراء اور غیر ماتحت سلاطین بھی اپنی ریاست وحکمرانی کی ان سے سند حاصل کرنے کو اعزاز و فخر شمار کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ متعدد سلاطین ہند نے اپنے اپنے عہد میں عباسی و عثمانی خلفاء سے باضابطہ سند و دستار حاصل کی اور اسی چیز نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے دلوں میں عثمانی حکومت کی وہ محبت و عقیدت رکھی تھی کہ ''خلافت عثمانیہ'' کے اختتام کا ذکر بھی ناگوار تھا، خلافت کی حفاظت وبقاء کیلئے ہی ہندوستان کی مشہور سیاسی تحریک ''تحریک خلافت'' اٹھی، جس کے قائد ''علی برادران'' یعنی مولانا محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی تھے اور ذیل کا مشہور شعر اسی سے متعلق ہے ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

عثمانی حکومت

مدینہ وکوفہ اور دمشق و بغداد جن مرکزی اسلامی حکومتوں کے پایۂ تخت اور ان کے جاہ و جلال کا مظہر تھے، ان حکومتوں کے اختتام کے بعد پوری مسلم قوم کی نگاہ میں جو احترام اور مرکزیت ترکی کی عثمانی حکومت کو حاصل ہوئی، کسی دوسری حکومت کو نہیں حاصل ہو سکی، نہ ہی مصر کی عباسی حکومت کو اور نہ ہند کی ہزاروں میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی مسلم حکومتوں کو۔

عثمانی ترک: ترکستان کے رہنے والے تھے، چنگیز خاں کے حملوں نے انہیں ترک وطن پر مجبور کیا، اسی اثناء میں ان کے ایک فرد ''ارطغرل بن سلیمان'' نے سلجوقی حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے میں مدد کی اور انعام کے طور پر کافی جاگیر حاصل کی، بہادر تو تھے ہی، اس زمانے میں مسلمانوں کا معرکہ تاتاریوں اور رومیوں دونوں سے تھا، اس نے دونوں کو زیر کیا اور اپنے علاقے کو بڑھاتا رہا حتیٰ کہ ۶۷۷ھ میں وفات پائی، لڑکا عثمان جانشین ہوا، اسی کے نام سے ترک ''عثمانی'' کہلاتے رہے ۷۰۰ھ میں جب تاتاریوں نے سلجوقی حکومت کو بالکل ختم کر دیا تو اس نے بھی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور یوں عثمانی سلطنت کا آغاز ہوا، جس کا سکہ چودھویں صدی کے آغاز تک یعنی چھ سو سال سے زائد تک قائم رہا اور بنیادیں اس عہد میں گہری و وسیع ہوئیں جب کہ یورپ کے جنوبی حصہ میں مسلمانوں کا اقتدار آخری لمحات سے گذر رہا تھا اور یہ شمالی حصہ میں دن بدن اپنے اقتدار و حکومت کے رقبے کو بڑھاتے رہے تھے، اس حکومت کو ''خلافت عثمانیہ'' کا لقب ملا، اس لئے کہ اس نے سابق مرکزی حکومتوں کی طرح پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کی سرپرستی کی کوشش کی، اختتام اڑتیسویں حکمراں سلطان عبدالمجید دوم پر ہوا، ان کا ابتدائی عہد تاتاریوں کے عروج کا تھا، انہوں نے اُن کو قدم قدم پر دسیوں معرکوں میں شکست دی، رومی بھی عرصۂ دراز سے

مسلمانوں کو تنگ کئے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے انہیں موقع بھی خوب ملتا تھا، ان کا بھی اس درجہ زور توڑا کہ مجبور ہو کر صلح کی حتیٰ کہ اس سلسلہ کے آٹھویں نوجوان حکمراں محمد فاتح کے ہاتھوں فتح قسطنطنیہ کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہوئی اور صدیوں کی جدوجہد دسیوں حملے کے باوجود فتح نہ ہونے والا اور فطری محافظین سے گھرا ہوا، رومیوں کا مرکزی شہر و مقام بالآخر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آ گیا، چونکہ اس سلطنت کے ابتدائی معرکے رومیوں اور تاتاریوں سے رہے تھے اس لئے جہاں شرق میں ایشائے کوچک ان کے قبضہ میں آیا مغرب میں یورپ کے بہت سے ممالک ان کے قبضے میں آتے چلے گئے، اگرچہ اہل یورپ سے سخت ترین معرکے بھی ہوتے رہے اور فاتح قسطنطنیہ محمد فاتح تو اٹلی کے دار السلطنت رومہ کا بھی عزم کر چکا تھا مگر موت نے مہلت نہ دی، تاہم صدیوں ترکوں کا یورپ پر رعب و دبدبہ قائم رہا، سلطان سلیم اول کے عہد میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے عثمانی حکومت کو مسلمانوں میں احترام و تقدس کا مقام حاصل ہوا، ترکوں نے اس وقت تک صرف تاتاریوں و رومیوں سے تعرض کیا تھا یا اپنے ماتحت بغاوت کرنے والے مسلمان روٴسا سے مگر اتفاقاً مصر کی ایک ریاست نے ایک شرارت کی تو ترکوں کا رُخ ادھر ہو گیا اور شام و فلسطین و مصر سب ترکوں کے قبضے میں آ گئے، یہی نہیں بلکہ مصر کا عباسی خلیفہ متوکل سوم بھی ان کے قبضہ میں آ گیا جسے وہ قسطنطنیہ لیتے گئے، جہاں اس نے تبرکات خلافت: تلوار، چادر، علم نبوی سلطان سلیم کے حوالہ کر دی اور یوں سلطان ترکی سارے مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیا گیا، لیکن سابق اسلامی حکومتوں کی طرح عثمانیوں کا زور فتح اور رعب و دبدبہ بھی ان کے ابتدائی چند سلاطین تک رہا، درمیان درمیان امید کی کرنیں ضرور پھوٹتی رہیں، مگر خود اپنی کمزوریوں نے نہ صرف یہاں تک پہنچایا کہ اس صدی کی پہلی چوتھائی ختم ہوتے ہوتے ''خلافت عثمانیہ'' یعنی آخری محترم اسلامی حکومت جس کو ساری دنیا کے مسلمان بنظر تقدیس دیکھتے تھے ختم ہو گئی،

بلکہ نوبت تو یہاں تک آچکی تھی کہ ''ترکی'' نام کا کوئی ملک وحکومت دنیا کے نقشہ پر نہ رہ جائے، اس لئے کہ ترک ومسلم دشمن اقوام نے ترکوں کا سارا علاقہ آپس میں بانٹ لیا تھا، مگر کچھ جیالے ترکوں نے ہمت سے کام لے کر جنگ کا وہ میدان گرم کیا کہ جس کے طفیل آج بھی ''ترکی'' نام کی ایک عظیم الشان مسلم سلطنت موجود ہے، اگرچہ اس کے وہ سارے حالات جو آپ نے مختصراً پڑھے اب ایک خواب وخیال بن چکے ہیں۔

اسلامی ہند

ہندوستان کی چونکہ ہر عہد میں شہرت رہی اور وہ بڑا ملک شمار ہوتا رہا، اس لئے یہاں کی اسلامی حکومت بھی دنیا کی اہم ترین اور وسیع ترین اسلامی حکومتوں میں شمار کی گئی، ہندوستان میں اسلام تو کئی راستوں سے آیا اور ہندوستان پر اسلامی حملے حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہوئے، مگر اس کی فتح کا آغاز محمد بن قاسم کے حملوں سے ہوا، ۹۳ھ میں صوبہ سندھ وملتان کو اس نے فتح کیا اور وہ اسلامی حکومت کے ماتحت چلا گیا، عباسی دور زوال میں اس علاقے کے مسلم حکمرانوں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں، پھر چوتھی صدی کے آخر میں محمود غزنوی نے ان علاقوں پر قبضہ کر کے پنجاب کو بھی شامل کرلیا اور کاٹھیاواڑ کو بھی فتح کرلیا، شروع کی ہندی اسلامی حکومت انہیں علاقوں تک محدود تھی، صدر مرکز لاہور تھا، پہلی حکومت غزنوی خاندان کی رہی جو ۵۸۲ھ میں ختم ہوئی، یعنی تقریباً دو سو سال رہی، اس عرصہ میں بارہ سلاطین ہوئے، ۵۸۲ھ میں شہاب الدین غوری نے اس حکومت کو ختم کیا اور حملہ کر کے دہلی، اجمیر وقنوج تک کے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور یوں ہندوستان کا بڑا حصہ ان کے قبضہ میں آگیا اور شہاب الدین غوری کا غلام قطب الدین ایبک سب سے پہلا حکمراں بنا، اس کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت رہی، ہاں مملکت کی حدود میں آگے چل کر مزید وسعت ہوئی حتیٰ کہ اسلامی ہند موجودہ تین ملکوں (ہند، پاک، بنگلہ دیش) کے مجموعہ بلکہ برما، تبت، لنکا اور دوسرے بہت سے جزائر پر مشتمل تھا، ۸۵ سال تک غلاموں کی حکومت رہی، جن کی تعداد دس ہوئی، جن میں ایبک، شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن مشہور ہوئے، پھر تقریباً تینتیس سال (۶۸۷ھ تا ۷۲۱ھ) خلجیوں کا دور سب سے تابناک اور مشہور رہا، اسی عہد میں ایرانی، ترکی، افغانی،

تاتاری، ہندی وغیرہ مختلف اقوام کے باہمی میل وجول سے اردو زبان وجود میں آئی، ۷۲۱ھ سے ۹۳ سال تک (۸۱۵ھ) خاندان تغلق حکمراں رہا، اس عرصہ میں ان کے آٹھ حکمراں ہوئے، جن میں محمد تغلق، فیروز تغلق بڑے نامور گذرے، ۸۱۵ھ سے ۸۵۵ھ تک ۳۷ سال سیدوں کی حکومت رہی، جن کے چار حکمراں ہوئے، ۸۵۵ھ سے ۹۳۳ھ تک ۷۶ سال لودھیوں کی حکمرانی رہی، جن کے تین حکمراں ہوئے، ان میں سکندر لودھی بہت مشہور ہوا، پھر مغلوں کا دور دورہ آیا جو ۹۳۳ھ سے ۱۲۷۶ھ تک رہا، درمیان میں ۱۵ سال کی مدت ۹۴۷ھ تا ۹۶۲ھ سوریوں کی حکومت رہی، جن کے تین حکمراں ہوئے، شیر شاہ سوری سب سے زیادہ مشہور ہوا، ہندوستان کی مشہور شاہراہ گرانٹ ٹرنک روڈ (از پشاور تا کلکتہ) اسی کی بنوائی ہوئی ہے، سب سے طویل عرصۂ حکومت مغلوں کا رہا، ۹۳۳ھ سے ۱۲۷۶ھ تک یعنی ۳۱۸ سال، اس عرصہ میں ۱۵ سلاطین گذرے اور متعدد بڑے نامور ہوئے، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب، یہ ترتیب وار ایک دوسرے کے بعد ہوئے اور باپ بیٹے تھے، شاہجہاں کی یادگار: آگرہ ودہلی کی متعدد اہم عمارتیں ہیں اورنگ زیب بلکہ مغلیہ عہد کا مایہ ناز کارنامہ ''فتاویٰ عالمگیری'' ہے جو بیرونی دنیا میں ''فتاویٰ ہندیہ'' کے نام سے مشہور ہے، یہ تو ہندوستان کی مرکزی حکومت کے مختصر حالات ہیں، یہاں کی صوبائی وعلاقائی حکومتوں میں بھی علم وفن اور صنعت وحرفت میں ترقی کے اعتبار سے کئی مشہور حکومتیں گذری ہیں، مثلاً جونپور کی مشرقی حکومت، شاہان مالوہ وشاہان گجرات کی، نیز دکن کی بہمنی سلاطین کی حکومت۔

عہد حاضر کی مسلم حکومتیں

اگرچہ اب نہ تو وہ مرکزی اسلامی حکومتیں رہ گئی ہیں، نہ ہی سابق اسلامی مملکت کے حدود، پھر بھی مسلمانوں کی حکمرانی دنیا کے بہت بڑے حصے پر ہے، جو تقریباً ایک تہائی یا اس سے زائد ہے، ایشاء وافریقہ کا تو بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، اس کے علاوہ یورپ کا وہ حصہ جو ٹرکی میں شامل ہے، نیز روس کی بعض ریاستیں، ملیشیا وانڈونیشیا وغیرہ سب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔

مجموعی طور پر چھوٹی بڑی پچاس سے زائد حکومتیں وممالک ہیں، جن میں وسیع وشہرت یافتہ پاکستان، ملیشیا، انڈونیشیا، سعودی عرب، شام، عراق، افغانستان، ایران، بنگلہ دیش، لبنان، امارات، مصر، لیبیا، ٹیونس، مراکش، الجزائر، سوڈان، ٹرکی، صومالیہ، یوگنڈا، الجیریا، اردو، کویت، بحرین، مسقط وعمان، مالدیپ، نائیجریا، مالی وغیرہ ہیں۔

ان میں چند کے علاوہ سب حکومتیں موجودہ عہد کے جمہوری طریق کار کے مطابق انتخابی ہیں یا فوجی انقلابی، بڑی حکومتوں میں سعودی عرب وامارات ومراکش اور مزید اردن وکویت اور چند ریاستوں کا نظام شاہی ہے اور بڑی آبادی والے ممالک چند ہی ہیں، جیسے انڈونیشیا، پاکستان، سوڈان، نائیجیریا، مصر، ٹرکی۔

ویسے یہ عہد افراد واقوام اور ممالک سبھی کی ترقی کا ہے اور سب کا معیار ہر اعتبار سے بلند ہوتا جا رہا ہے، اس لئے مسلم حکومتیں بھی تیزی سے اس راستہ پر گامزن ہیں، اللہ نے ان کو بہت سے وسائل بھی دے رکھے ہیں، مگر تمام اقوام کا عام دستور چند کے سامنے جھکنے اور محتاج بنے رہنے کا چلا آرہا ہے، اس لئے ان کی ترقی دوسروں کی مرہون منت اور ان کے رحم وکرم پر موقوف ہے، اللہ تعالیٰ موجودہ تمام اسلامی ممالک کی حفاظت فرمائے اور ان کو ہر لائق ومناسب ترقیات سے نوازے۔

جہاد

''جہاد'' کے معنی بھرپور کوشش کرنا ہے، شریعت میں اس کا مفہوم ہے؛ دین کی سر بلندی کیلئے ہر ممکن کوشش وسعی کرنا، خواہ جس صورت وجس شکل میں ہو، تقریر وتحریر کے ذریعہ ہو یا جنگ ولڑائی کے ذریعہ، جنگ کو عربی میں ''قتال'' کہتے ہیں، البتہ جہاد کا مشہور و متعارف مفہوم ''دین کے لئے جنگ کرنا ہے''، لیکن یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ:

اسلام دین رحمت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی رحمت ہیں، آپؐ کی لائی ہوئی پوری شریعت اور سارے احکامات رحمت وراحت ہی ہیں، یہ ضرور ہے کہ کبھی راحت وآرائش کے حصول کیلئے تکلیف دہ صورتیں بھی اختیار کی جاتی ہیں، لیکن وہ مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ مقصود راحت ہوتی ہے، پھوڑے اور ناسور کا آپریشن ہوتا ہے، جسم کے سڑے وگلے حصہ کو جسم سے کاٹ کر الگ کیا جاتا ہے، جس سے بظاہر انسان کو تکلیف مگر انجام کار راحت ہوتی ہے، بالکل یہی معاملہ اسلامی جنگ وجہاد کا ہے کہ اس کا مقصد محض قتل وقتال اور جان ومال کا ضیاع یا ان پر اپنی ملکیت کا جمانا نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا مقصود ہوتا ہے، اس کیلئے یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور کرنا پڑا، بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کیلئے ایک معاشرتی ضرورت کے طور پر اور حصول خیر کے تمام راستوں کے بند ہو جانے کے بعد یہی واحد راستہ (جو صورۃ برا ہے) رہ جانے پر اس کو اختیار کیا جاتا ہے، اس کی وضاحت جہاد کے اصول وآداب سے بھی ہوتی ہے اور جہاد کی تاریخ سے بھی۔

اسلامی لشکر جب کسی علاقے میں اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت لے کر جاتا ہے یا ان پر حملہ آور جماعت کے مقابلہ میں تو اپنے مدمقابل کے سامنے تین باتیں رکھتا ہے کہ جو چاہے اختیار کرلو، اول تو یہ کہ ہمارا مقصد اللہ کے کلمہ ودین کو بلند کرنا اور مخلوق کو خالق سے جوڑنا ہے

لہٰذا ہماری دعوت کو مان کر دنیا وآخرت کی عزت حاصل کرو، اگر وہ اسے مان لیں تو ان پر تلوار کا اٹھانا حرام ہو جاتا ہے، ان کا جان ومال سب کچھ محفوظ ہو جاتا ہے، البتہ اس پر ان کو مجبور نہیں کیا جاتا، بلکہ اپنا پیغام ان کو سنا دیا جاتا ہے، متعدد آیات وروایات میں یہ مضمون موجود ہے۔

دوم: اگر یہ تسلیم نہیں تو دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے والوں کے سامنے سرنگوں ہو جاؤ اور اپنی عاجزی اور ان کی برتری تسلیم کرلو، ان کے زیرِ نگرانی وزیر حفاظت زندگی گذارو، اپنے دین پر قائم رہو، اس کے احکام پر عمل کرو اور مسلمانوں کو انتظامی امور کے مصالح کے تحت کچھ ٹیکس ادا کرتے رہو۔

سوم: اگر یہ بھی تسلیم نہیں تو جنگ ہی رہ جاتی ہے، مگر ان قیود کے ساتھ کہ جس کو لڑتا ہوا یا لڑنے کے لائق اور اس کیلئے تیار پایا جائے، اسی پر تلوار اٹھائی جائے، بچہ، عورت، بوڑھا، معذور، عبادت گذار کو نہ چھیڑا جائے کہ یہ مقصد میں مانع نہیں بنتے۔

عہد نبوی کی تاریخ جہاد دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے طویل تیرہ سالہ قیام میں باوجود اس کے کہ آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو نہایت وحشیانہ اور انسانیت سوز تکالیف دی گئیں، مگر انگلی بھی اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، مدینہ پہنچنے پر اجازت ملی بھی تو اس وقت جب کہ خود اہل مکہ چڑھ کر آئے، قرآن کا اعلان ہے: ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' (لڑنے کی ان کو اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا)، ''قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا'' (لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو)۔

حضورؐ کی سرکردگی میں مسلمانوں نے کئی اہم جنگیں لڑیں، مگر سب میں پہل دوسروں نے کی، غزوۂ بدر میں حضورؐ کفار مکہ کے اس قافلۂ تجارت کی نیت لے کر نکلے تھے جو شام

سے مسلمانوں سے جنگ کرنے کیلئے ساز وسامان لے کر لوٹ رہا تھا، اس کی حفاظت کیلئے مکہ سے جو لشکر چلا، مسلمانوں کو بجائے اس قافلہ کے اس سے لڑنا پڑا، غزوۂ احد میں کفار مکہ اور غزوۂ خندق میں کفار عرب چڑھائی کر کے مدینہ آئے، یہودیوں سے جو جنگیں ہوئی ان کی عہد شکنی کی وجہ سے، فتح مکہ کا واقعہ کفار مکہ کی عہد شکنی کی وجہ سے پیش آیا، غزوۂ تبوک و موتہ کی نوبت سرحدی علاقوں پر عیسائیوں کی چڑھائی کی وجہ سے آئی۔

چنانچہ ایک نومسلم انگریز "لارڈ ہیڈلے" لکھتا ہے کہ:

"اسلامی غزوات کے تین ابتدائی محل وقوع کو دیکھ کر خود فیصلہ کرلو کہ جنگ کی ابتداء کس نے کی؟ اور چڑھائی کون کس پر کر کے گیا تھا؟ حملہ اور جارحانہ اقدام کون کر رہا تھا اور حفاظت خود اختیاری و مدافعت میں کون لڑ رہا تھا؟ مکہ کے جنگجو؛ اہل فساد، یا مدینہ کے صابر وشاکر مومنین بدر مدینہ سے تیس میل دور ہے اور اُحد کل بارہ ہی میل ہے، غزوۂ خندق کے موقع پر خود مدینہ کا محاصرہ ہوا تھا، غرض ہر دفعہ قریش مکہ یا ان کے دوست ہی چڑھ چڑھ کر آئے"۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، دین کی نشر واشاعت اور فروغ وسربلندی کیلئے کی جانے والی ہر کوشش "جہاد" ہے، جو نہایت عظیم عمل ہے، لیکن چونکہ جنگ میں ہر قسم کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، جانی ومالی، جسمانی وروحانی، اسی لئے اس کو فرائض کے بعد سب سے بڑی عبادت شمار کیا گیا ہے اور اس کے انجام دینے والوں کا رتبہ بڑا بلند قرار پایا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں باہم فرق مراتب جنگوں کے اعتبار سے ہی مانا گیا ہے؛ اہل بدر، اہل احد، اہل خندق، اہل حدیبیہ، اہل فتح مکہ، ترتیب وار درجات قرار دیئے گئے ہیں۔

اگر یہ ضرورت اس طور پر پوری ہوجائے کہ ہر ہر فرد کو نہ لگنا پڑے بلکہ کچھ لوگ اپنے مشاغل میں مصروف رہیں اور کچھ اس کو انجام دیں تو یہ فرض کفایہ ہے کہ کچھ کے کرتے رہنے

سے پوری امت سے سوال نہ ہوگا اور اگر نوبت یہ ہو کہ ہر ایک کا لگنا ضروری ہو تو ہر ہر فرد امت؛ مرد وعورت، آقا وغلام پر فرض ہوگا۔

جنگ میں دو حالتیں پیش آتی ہیں: لڑنے والا زندہ واپس آیا تو "غازی" کہلاتا ہے، مر گیا تو "شہید"؛ جس کا مرتبہ اللہ کے یہاں بہت بلند ہے، دنیا میں بھی اس کا حکم یہ ہے کہ غسل دیئے بغیر بدن کے کپڑوں میں ہی نماز پڑھ کر دفن کر دیا جائے، اس کے متعلق قرآن کا بیان ہے کہ عام مرنے والوں کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ملتی ہے، وہ زندوں کی ہی مانند ہوتا ہے، جنگ میں خواہ فتح ہو یا ناکامی، دونوں صورتوں میں مجاہدین ثواب سے محروم نہیں رہتے۔

جنگ کے موقع پر کافروں کا جو مال مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اسے "مال غنیمت" کہتے ہیں، اگر مجاہدین باتنخواہ ملازم ہوں تو سب بیت المال میں جائے گا، ورنہ پانچ حصے کر کے ایک بیت المال میں اور باقی مجاہدین کو دے دیا جائیگا اور اس سے خاص کارنامہ انجام دینے والوں کو انعام بھی دیا جاسکتا ہے۔

اصولی طور پر تو جہاد کی جو بنیاد ہوتی ہے اس کی وضاحت کر دی گئی، ہاں ظاہری طور پر مختلف اوقات میں اس کے حسب ذیل مقاصد ہوسکتے ہیں۔

۱. جان ومال اور دین ووطن کی جانب سے دفاع۔
۲. جن اہل ایمان کو کافر بہکانا چاہتے ہیں ان کے دین واعتقاد کو مامون پختہ کرنا۔
۳. دین کی دعوت کی سرپرستی تاکہ دور دراز تک پہنچ سکے۔
۴. عہد شکنوں یا باغیوں وفسادیوں کی تادیب وسرزنش۔
۵. مظلوم اہل ایمان کی مدد وغیرہ۔

اسلام کا نظام عدالت

اسلام نے انسانیت کو جو چیزیں عطا کی ہیں ان میں بے مثال نظام عدالت بھی ہے، اسلام نے ایک باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے انسانوں کے درمیان پائی جانے والی ہر قسم کی طبقہ واریت وفرقہ واریت کو ختم کیا ہے، فرق اگر ہے تو مومن وکافر ہونے کا، یا صالح وبدکردار ہونے کا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافر یا فاجر انسانیت کے حقوق واحترام سے محروم ہے، بلکہ ہر ایک کے حقوق ہیں، جن کے حصول کیلئے ہر قسم کی جدوجہد کی پوری آزادی عطا کی گئی ہے، حق کا دبانا سخت ترین گناہ اور حق کا دینا و دلانا محبوب ترین عمل وعبادت ہے، حتیٰ کہ مملکت اسلامیہ کا معمولی سے معمولی انسان مملکت کے سربراہ اعلیٰ کو بھی عدالت میں اپنا فریق بنا سکتا ہے اور مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر سکتا ہے اور اس صورت میں اس کے ساتھ بھی عدالت کے عام نظام کے مطابق سلوک ہوگا اسلامی تاریخ میں اس قسم کے متعدد واقعات منقول ہیں۔

چھوٹا وبڑا، امیر وغریب، اجنبی ورشتہ دار، آزاد وغلام، مسلمان وکافر اپنے حقوق کے مطالبہ کے سلسلہ میں عدالت کے نزدیک سب برابر ہیں، ہر ایک کے حقوق، ہر ایک عدالت کی کنڈی کھٹکھٹانے کا مجاز، حتیٰ کہ معمولی سے معمولی فرد سربراہ مملکت کو بھی اپنا فریق بنا کر عدالت میں لے جا کر مجرموں کی بیچ پر کھڑا کر سکتا ہے اور عدالت کے لئے یہ جائز نہیں کہ سربراہ ہونے کی بناء پر ایک نگاہ کا بھی اس کے ساتھ فرق کرے، تمام فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سربراہ اعلیٰ اگر کوئی جرم کرے گا تو حسب ضابطہ سزا کا مستحق ہوگا، قصاص لیا جائیگا، کوڑے لگیں گے، ہاتھ کٹے گا، تاوان لیا جائیگا، سربراہی کی بنا پر اسے کسی پر ایک انگلی کی بقدر بھی ظلم کا حق نہیں۔

قرآنی ہدایات ملاحظہ ہوں:

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ______ ::::: بے شک اللہ تعالی انصاف اور احسان کا حکم فرماتے ہیں۔

اور

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ______ اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو۔

ان سے بڑھ کر یہ دو آیات ملاحظہ ہوں، جن میں عام طور سے جانبداری کا باعث بننے والی دو وجہوں کو صراحت کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ______ ::::: اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کیلئے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔

اور

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ______ اے ایمان والو! اللہ تعالی کے لئے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے

ارشادات نبوی ملاحظہ ہوں:

۱. جو آدمی مسلمانوں کا حکمراں ہو اور پھر ان کی حق تلفیاں کر کے مرے تو اللہ تعالی اس پر جنت کو حرام کر دیتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

۲. اگر کوئی آدمی دس آدمیوں کا بھی امیر بنایا جائے تو قیامت کے دن اس حال میں حاضر کیا جائیگا کہ اس کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوئے ہوں گے پھر یا تو اس کا انصاف اس کو کھول دے گا یا اس کا ظلم اس کو تباہ کر دے گا۔

۳. قیامت کے دن اللہ کے نزیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے قریب انصاف ور حاکم ہوگا اور سب سے زیادہ مبغوض مستحق نفرت اور سخت عذاب کا مستحق یا سب سے زیادہ دور ظالم حکمراں ہوگا۔

۴. سربراہ وحکمراں زمین میں اللہ کا سایہ ہوتا ہے، اس کے مظلوم بندے اس سایہ کی پناہ لیا کرتے ہیں، جب وہ انصاف کرے تو اس کیلئے اجر ہوگا اور رعایا پر اس کی شکر گذاری لازم ہے اور اگر ظلم کرے تو اس پر گناہ ہوگا اور رعایا پر صبر لازم ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ یہ ربانی وخداوندی نظام ہے، انسانی نظام میں نقص، علم اور عقل کی کمی کی بناء پر ضروری ہے پھر یہ کہ ہزار احتیاط کے باوجود کسی نہ کسی مرحلہ میں جانبداری بھی آجاتی ہے۔

اور اسلامی تمام تعلیمات وہدایات کی طرح یہ نظام بھی صرف فکری ونظری طور پر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ عملی طور پر بھی دنیا نے اس کا بار بار مشاہدہ کیا ہے، عہد نبوی میں بھی، خلفاء راشدین وصحابہ کے عہد میں بھی اور اس کے بعد بھی، اس سے زائد کیا ہوگا کہ حضوؐر نے اپنے مرض وفات میں تقریر فرمائی:

> "اے لوگو! میں نے اگر کسی کی پیٹھ پر کوڑے لگائے ہوں تو میری پیٹھ حاضر ہے؛ کوڑے لگالے، میں نے جس کی آبرو کی بابت کچھ کہا ہو؛ وہ میری عزت وآبرو کو کہہ لے، میں نے جس کا مال لیا ہو؛ وہ میرا مال لے لے اور میری جانب سے بغض وعداوت کا خدشہ نہ کرے، اس لئے کہ یہ میرا معمول ومزاج نہیں بلکہ صاف سن لو کہ تم میں وہی مجھے

> سب سے زیادہ محبوب ہوگا جو اگر اس کا کوئی حق ہے تو لے لے یا پھر معاف کر دے کہ میں اللہ کے سامنے اس حال میں حاضر ہوں کہ بالکل پاک وصاف ہوں"۔

حضوؐر کے عہد میں قریش کی ایک معزز خاتون نے چوری کی، بڑا زور لگایا گیا، مگر ہاتھ کاٹا گیا، ایک معزز انصاری خاتون نے کسی کے دانت توڑ دیئے، حضوؐر نے معاف نہیں فرمایا، حضرت عمرؓ کے عہد میں حضرت علیؓ پر دعویٰ کیا گیا، اپنے سامنے کھڑا کر کے دوسرے فریق کی طرح جواب طلب کیا، حضرت علیؓ خود اپنے عہد خلافت میں اپنے قاضی حضرت شریح کے سامنے بحیثیت مدعا علیہ کھڑا کئے گئے، مصر کا مشہور شہر اسکندریہ جب فتح ہوا تو مفتوح رعایا نے ایک بت کی ایک آنکھ توڑ دینے پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، مشہور عباسی خلیفہ مامون نے ایک اجنبی، پردیسی عورت کی پکار پر اپنے بیٹے عباس کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔

یہ دین؛ دین رحمت ہے، اس کے رحم وکرم کی کرشمہ سازیاں کسی نظام، کسی زبان، کسی عہد اور کسی انسان کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔

معاشرتی نظام

معاشرت کے معنی ہیں: رہن سہن، معاشرتی مسائل ونظام سے وہ حالات مراد ہوتے ہیں جن سے انسان کا اپنی شب وروز کی عام زندگی میں سابقہ رہتا ہے، ان چیزوں میں مزاج وماحول کے فرق کی وجہ سے اکثر افراط وتفریط کی صورت ہی پیش آتی ہے، شریعت نے اس کے بھی اصول وقواعد متعین فرمائے ہیں، معاشرتی نظام اصولاً دو حصوں میں منقسم ہیں: ایک اہل وعیال سے متعلق جسے ''عائلی نظام'' کا عنوان دیا جاتا ہے، دوسرا ان تمام افراد سے متعلق ہے جن سے کسی وجہ سے بھی معاشرہ یعنی باہمی رہن سہن میں سابقہ پڑتا ہے، خواہ یہ سابقہ وقتی وعارضی ہو یا دائمی ومستقل، جیسے اعزہ، پڑوسی، دوست ساتھی، مہمان، آقا وغلام، چھوٹا وبڑا، حاکم ومحکوم، امیر وغریب، یتیم ومسکین حاصل اس کا یہ ہے کہ مذکورہ تعلقات کی بنیاد پر ہمارا آپسی برتاؤ ایک دوسرے سے کس قسم کا ہو اور ان تعلقات کی رو سے کسی پر کیا حقوق لازم ہیں۔

دین کے نقطۂ نظر سے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے، بلکہ اس حیثیت سے بہت بڑھی ہوئی ہے کہ اس باب میں دنیوی منفعت ومصلحت وخواہش نفس اور اللہ کے احکام کی باہمی کشمکش دوسرے شعبوں سے زیادہ ہوتی ہے، قدم قدم پہ جذبات وخواہشات کا تقاضا کچھ ہوتا ہے اور خدا ورسول کا کچھ، دوسرے یوں بھی اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ عبادات میں صرف اللہ کا حق ہے، جس کا دریائے عفو وکرم بہت وسیع ہے اور معاشرتی مسائل میں بندوں کے حقوق ہیں، جنہیں وہ خود معاف کریں تو معافی ہوگی ورنہ محض توبہ سے معاف نہ ہوں گے، اللہ تعالیٰ بھی معاف نہ فرمائیں گے۔

معاشرت کے تحت جتنے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے شریعت نے سب کے حقوق متعین

کر دیئے ہیں اور اتنی جامعیت کے ساتھ کہ کسی دوسرے دین ومذہب میں ایسی تعلیم ان کی نہیں پائی جاتی، ہر ایک کو اس سے متعلق حقوق کی ادائیگی کا مکلف بنایا ہے اور اس نظام کو ہر ممکن تقویت بخشی ہے، ان کا لحاظ کرنے والوں کی تعریف کی ہے، لاپروائی کرنے والوں کی بے انتہا مذمت کی ہے، آخرت کے اجر وثواب اور گرفت وعذاب کے تذکرہ کے ساتھ دنیاوی خیر وبرکت اور تنگی ومشقت کا بھی تذکرہ کیا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں دنیوی منفعت کا حصول یوں لازمی ویقینی بنا دیا ہے کہ اعزہ کے درمیان میراث جاری ہوتی ہے، یتیم جس کی پرورش وکفالت کا حکم اولاد کی مانند ہے، ضرورت پر اس کے مال سے نفع اٹھانے کا حق دیا ہے، ایک پڑوسی کو دوسرے پڑوسی سے جو مالی ومادی منافع پہنچتے رہتے ہیں وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔

معاشرہ میں جن مختلف قسم کے افراد سے سابقہ پڑتا ہے ان کے حقوق کے بیان میں ہم قرآنی ارشادات اور چند ارشادات نبویہ کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں۔

قرابت:

اس تعلق کا بڑا لحاظ وپاس رکھا گیا ہے، قرآن مجید میں جابجا قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے اور اس شخص کو بہت بڑا مجرم بتایا گیا ہے جو قرابت کے حقوق کو پامال کرے، حتیٰ کہ حضورؐ نے فرمایا: ''ایسا شخص جنت میں نہیں جائیگا'' اور حکم یہ ہے کہ دوسرا خواہ کتنا ہی حقوق سے صرف نظر اور احسان فراموشی کرے مگر خود کرتے رہنا چاہئے، اعزہ کے ساتھ بدسلوکی اور ان کے حقوق سے صرف نظر گناہ کبیرہ ہے، یوں تو سب کے ساتھ حسن سلوک، میل جول، محبت وتعلق، ملاقات وزیارت، ہدایا وتحائف کا معاملہ حسب موقع وحسب حیثیت رکھا جائے، مگر خاص قریبی رشتہ دار اگر ضرورت مند ہوں تو ان کا پورا خرچ برداشت کرنا بھی ضروری ہے جیسے بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، ان کی اولادیں کہ اگر یہ کسی وجہ سے معذور ومجبور ہوں تو ان کا پورا خرچ دینا واجب ہے۔

پڑوسی:

رشتہ داروں کے بعد ہمہ وقت کی قربت سب سے زیادہ پڑوسی سے ہوتی ہےاور پڑوسیوں میں پورا محلہ شمار ہوتا ہے، ہاں جو جتنا زیادہ قریب ہے اس کا حق اتنا ہی بڑھا ہوا ہے، پڑوس کا حق ہر اس شخص کا ہے جو پڑوس میں رہے، رشتہ دار ہو یا اجنبی، مسلمان ہو یا غیر مسلم، امیر ہو یا غریب، ہاں رشتہ دار مسلمان، ضرورت مند کا حق زیادہ ہے، قرآن وحدیث دونوں میں تاکید ہے حتیٰ کہ احادیث میں تو آیا ہے کہ مومن وہی ہے جو پڑوسی کو تکلیف نہ دے، جس کا پڑوسی بھوکا رہے اور وہ خود پیٹ بھر کھائے وہ پورا مسلمان نہیں، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ: ’’مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی وجہ سے خیال ہونے لگا کہ شاید اسے وراثت میں حصہ بھی ملے گا‘‘، اسی لئے فرمایا ہے کہ: ’’کچھ نہ ہو سکے تو شوربہ ہی بڑھا دیا کرو، کہ اسی سے پڑوسی کو خوش کر کے اللہ ورسول کو خوش کرو‘‘۔

یتیم:

بے باپ کے نابالغ بچے جو زیر کفالت ہوں، اگر رشتہ دار بھی ہوں تو دوہرا حق ہے، ورنہ ایک حق تو ہے ہی جس کی بار بار جگہ جگہ کتاب وسنت میں تاکید آئی ہے، فرمایا: ’’بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک ہوتا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کی حق تلفی ہوتی ہے‘‘، اصل تو یہ ہے کہ اس پر اپنے پاس سے خرچ کیا جائے اور اگر اسی کا مال خرچ کیا جائے تو پورے لحاظ کے ساتھ خود بلا ضرورت اور شریعت کی اجازت کے بغیر یتیم کے مال کا استعمال جہنم کی آگ کا استعمال ہے، ہاں جو ضرورت مند ہو بقدر ضرورت لے سکتا ہے، حکم یہ ہے کہ اس کے مال کو بڑھانے کی فکر کرو نہ کہ ختم کرنے اور گھٹانے کی۔

مہمان:

یہ بھی معاشرت کا ایک باب وجزء ہے، مہمان کا حق اس کے مرتبہ کے مطابق اعزاز و

اکرام اور خاطر ومدارات ہے، مومن کو مہمان کے اکرام کا حکم ہے، جس میں ہنس کر محبت سے پیش آنا، خندہ پیشانی سے ملنا، حسب حیثیت اچھے سے اچھا کھلانا سب داخل ہے، تکلف کی بھی گنجائش بلکہ پسندیدہ ہے اور مہمان پر میزبان کی حیثیت وحالات کا لحاظ ضروری ہے کہ زیادہ قیام کر کے یا خواہشات ومطالبات کے ذریعہ اسے زحمت میں نہ ڈالے، حدیث میں ہے کہ: ’’تین دن کے بعد کی مہمانی میزبان کی جانب سے صدقہ شمار ہوتی ہے اور اس سے پہلے کی اکرام واعزاز ہے، جس میں پہلے دن حسب حیثیت اہتمام پسندیدہ ہے‘‘۔

ساتھی:

یعنی ساتھ رہنے والا، خواہ دوست ہو یا رفیق سفر یا رفیق مشغلہ، یعنی تجارت، صنعت و حرفت کا ساتھی وہم پیشہ، سب کا ایک حق ہے، حسب قرب وسابقہ اس حق میں اعزاز واکرام میل ومحبت، خاطر وتواضع سب داخل ہے، حتیٰ کہ بے تکلف دوستانہ میں بے اجازت کھا لینے کی بھی اجازت ہے اور سامان کے استعمال کی بھی، حسب ضرورت وموقع ساتھی کا تعاون ضروری ہے اور رفقاء میں بڑا وسربراہ وہی ہے جو ساتھیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔

غلام وخادم ومحکوم:

غلام اگرچہ اپنا زرخرید ہوتا ہے اور خادم باتنخواہ یا بلاتنخواہ ضروریات کا انجام دینے والا مگر سب انسان ہیں، ان کا حق یہ ہے کہ کام میں ضرورت سے زائد ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے اور اگر ڈالا جائے تو خود بھی تعاون کیا جائے، حسب حیثیت پیٹ بھر کھلایا جائے اور پہنایا جائے اور بہتر یہ ہے کہ اپنے کھانے وپہننے کے سامان سے ان کی ضرورت پوری کی جائے، ان کی ضروریات کا پورا لحاظ وخیال رکھا جائے۔

حاکم وآقا:

ان کے حقوق کا خیال، بغاوت نہ کی جائے، شریعت وطاعت کے حدود میں ان کے

احکام کی بجاآوری کی جائے، حاکم کی اطاعت کے سلسلہ میں تاکیدات آپ کے علم میں ہیں، ''سیاسی نظام'' میں ان کا ذکر گذر چکا ہے، آقا کے حق میں یہ کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو غلام اللہ اور اپنے آقا دونوں کے حقوق کو پورے طور پر ادا کرتا ہے، اس کیلئے دوہرا اجر ہے''۔

ضرورت مند:

حسب ضرورت حق رکھتا ہے، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا، بیمار کی عیادت، مقروض کے قرضے کی ادائیگی، سفر سے رہ جانے والے کی مدد؛ تاکہ سفر پورا کر سکے، رفاہی و دینی کام کرنے والے کی خدمت اور ضروریات کا لحاظ، قیدی کو آزاد کرانا، مسلمان غلام کو آزاد کرنا و کرانا وغیرہ۔

مومن:

مومن کے اہم حقوق سلام کا جواب، چھینک کا جواب، دعوت کا قبول کرنا، بیماری میں عیادت، جنازہ کے ساتھ جانا، ہر حال میں اس کی خیر خواہی۔

غیر مسلم:

اگر ذمی ہے یعنی اسلامی حکومت کا باقاعدہ باشندہ ہے یا حربی ہے یعنی غیر مسلم حکومت کا باشندہ ہے مگر عارضی طور پر اجازت لے کر مسلم حکومت میں رہتا ہے، اس پر ظلم نہ ہو، تحقیر نہ ہو، طاقت سے زیادہ ٹیکس و مطالبہ نہ ہو، بغیر خوشی کے کچھ نہ لیا جائے، اگر کوئی معاہدہ ہو تو اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔

جانور:

جانوروں کے بھی حقوق بتائے گئے ہیں کہ بے ضرورت ان کو مت پالو، جنہیں پالو ان کی ضروریات، راحت و آرام کا پورا خیال رکھو، ان کے جسم و ضرورت و راحت کا خیال کر

کے ان سے کام لو، ان کو مت مارو، بے ضرورت باندھ کر، نشانہ بنا بنا کر جان نہ لو، بے ضرورت ذبح نہ کرو اور جب ذبح کرو تو ان کے آرام کا لحاظ رکھو، پہلے سے بدکاؤ مت، چھری تیز استعمال کرو۔

عائلی نظام

''عائلی نظام'' سے مراد گھریلو نظام ہے، جس سے انسان کا پوری زندگی اور رات ودن واسطہ رہتا ہے، اس لئے کہ گھوم پھر کر انسان اپنے گھر میں ہی آتا ہے۔

اس نظام کے اجزاء یعنی وہ افراد جن سے یہ نظام متعلق ہوتا ہے اور جن کے باہم ایک دوسرے پر حقوق ہوتے ہیں وہ شوہر، بیوی اور بچے ہیں بالخصوص نابالغ یا غیر شادی شدہ بچے جو عموماً والدین کے ساتھ ہی رہا کرتے ہیں، کبھی بھائی، بہن بھی اس نظام میں شامل ہو جاتے ہیں، اگر وہ بھی نابالغ یا غیر شادی شدہ یا معذور ومجبور ہوں، جیسے کہ کبھی کبھی والدین بھی اس نظام میں شریک وحصہ دار ہوتے ہیں، اس نظام کو بھی شریعت نے یوں پختہ کر دیا ہے کہ ہر ایک کے دوسرے پر اہم حقوق رکھے ہیں اور اخروی نتائج وفوائد کے ساتھ دنیا کے مادی منافع بھی آپس میں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیئے ہیں، چنانچہ مذکورہ افراد کو ایک دوسرے کا ترکہ ملتا ہے، شوہر بیوی کے تمام ضروری اخراجات کا ذمہ دار ہے اور باپ بالغ و خود کفیل ہونے سے پہلے پہلے اولاد کے تمام ضروری اخراجات کا اور والدین اگر ضرورت مند ہوں ایسے ہی بھائی بہن وغیرہ تو ان کے اخراجات بھی انسان کے ذمہ لازم ہیں، البتہ اولین حق بیوی اور اولاد کا ہے۔

انسان پر بیوی واولاد کی ذمہ داری صرف دنیا کی ضروریات کی حد تک نہیں بلکہ بیوی و اولاد کی دینی ضروریات کی نگہداشت بھی اس کے ذمہ ہے، اس لئے وہ بیوی کو بھی اسلامی احکام وحدود کا پابند بنانے کی سعی کرے گا اور اولاد کی تربیت وتعلیم کا ذمہ دار تو ہے ہی، دین کے وہ ضروری مسائل جن کا علم حاصل کئے بغیر آدمی مسلمان قرار نہیں پا سکتا اور جن سے ہر مسلمان کا سابقہ پڑتا ہے، ان کی تعلیم تو فرض اور لازم ہے، ہاں اس سے زائد کا انتظام

ضروری نہیں ہے حتیٰ کہ دینی تربیت کیلئے بیوی کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے اور اولاد کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ جب لڑکے سات سال کے ہوجائیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور دس سال کے ہوجائیں تو نماز نہ پڑھنے پر مارو، اپنے اہل وعیال کے حق میں برائی کو گوارا کرنے والے کی بڑی مذمت آئی ہے اور ان کی اصلاح کی برابر فکر رکھنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی ہے اور فکر رکھنے والے کیلئے دعا فرمائی ہے، جس کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ گھر والوں کو خوف میں رکھنے کیلئے کوڑا گھر میں رکھا جائے۔

چونکہ گھریلو نظام کا قیام وآغاز شادی کے ذریعہ ہوتا ہے، جس کے شروع میں دو جزء ہوتے ہیں؛ یعنی شوہر وبیوی اور آئندہ پھر اولاد کا اضافہ ہوتا ہے، رہے دوسرے اجزاء تو کبھی ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ـــــ اس لئے اس نظام کے بنیادی رکن وذمہ دار یہی دونوں قرار دیئے گئے ہیں اور ہر ایک کے قویٰ وصلاحیتوں کے پیش نظر ذمہ داریوں کے حدود بھی بٹے ہوئے ہیں، یوں تو مرد ہی اس پورے نظام کا سربراہ ہوتا ہے، مگر گھریلو ضروریات کی ادائیگی کے حق میں عورت اندرونی نظم اور مرد بیرونی نظم کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اور اس نظام کا نقطۂ آغاز چونکہ نکاح ہے، اس لئے شریعت نے بڑی تفصیل وتاکید کے ساتھ اس کی حقیقت، ضرورت، مصالح، دنیوی واخروی فوائد اور احکام کو بیان کیا ہے، یہی نہیں بلکہ جب کسی وجہ سے بنیادی ارکان اس نظام کے چلانے سے عاجز ہو رہے ہوں تو ایک دوسرے سے علاحدگی کی اجازت دیتے ہوئے اس کی صورتیں واحکام بھی بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں، قرآن وحدیث اور کتب فقہ میں آپ نکاح اور طلاق کی بڑی تفصیل پائیں گے، نکاح وہ تعلق ہے جو دو اجنبی مرد وعورت جن کا ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص تعلق جائز نہ تھا ان کو زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے سے قریب اور ان کا ہمراز بناتا ہے، اس کی پختگی وبقاء کے پیش نظر شریعت نے مرد کے ذمہ مہر اور عورت کے ضروری اخراجات کو لازم کیا ہے اور مرد کو عورت کے ساتھ حسن معاملہ کی سخت ترین ہدایات کی ہیں، دوسری

طرف عورت کو ہدایت کی ہے کہ وہ مرد کو اپنی کل کائنات سمجھے، نہ صرف یہ کہ اس کو اپنی دنیا سمجھے بلکہ اپنی آخرت بھی اسی کو سمجھے کہ اپنے آپ کو اسی کا پابند بنا کر رکھے۔

بڑی تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ کن کن عورتوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے، نیز یہ کہ ایک عورت کا بیک وقت ایک ہی شوہر ہوسکتا ہے، البتہ ایک مرد چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے بشرطیکہ سب کے حقوق یکساں طور پر ادا کرے، اس سے زائد بیویاں نہیں رکھ سکتا۔

نکاح نہ صرف زوجین بلکہ پورے معاشرہ کی عفت و پاکدامنی کا ذریعہ ہے اور ہمارے اندر پائے جانے والے ایک فطری تقاضے کو پورا کرنے کا جائز اور ہر فساد سے خالی حل ہے، نسل انسانی کے بقا اور اس کے اضافہ کا ذریعہ ہے اور اولاد والدین کے نام و نسل کے بقا کا ذریعہ اور اگر صالح و دیندار ہے تو آخرت میں ترقی درجات کا باعث، اس کے علاوہ بھی فوائد ہیں۔

اور اتنی اہمیت و فوائد کے باوجود اس رشتہ کو قائم کرنے میں نہ تعب و زحمت، نہ کوئی بار، دو گواہوں کی موجودگی میں مرد و عورت خود یا ان کے وکیل، ایک دوسرے کو منظوری دیدیں؛ رشتہ ہوگیا، نہ بارات کا حکم ہے، نہ جہیز کا، نہ دعوت ضروری ہے نہ ولیمہ، ہاں وسعت ہو تو ولیمہ حسب وسعت سنت ضرور ہے اور خدانخواستہ اگر اس رشتہ کو ختم کرنا ہے تو گواہوں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، مرد جب چاہے علاحدگی کا اعلان کرسکتا ہے، خواہ عورت چاہے یا نہ چاہے، سنے یا نہ سنے، اگرچہ یہ ضرور ہے کہ بے ضرورت ایسا کرنا ناپسندیدہ ہے، تین سے زائد طلاق دینا منع ہے، اس لئے کہ بے سود ہے اور یہ بھی حکم ہے کہ تینوں بیک وقت نہ دی جائیں، ضرورت ہو تو ایک ہی دے کر کام ختم کر دیا جائے یا پھر ایک ایک ماہ کے فصل سے تینوں طلاقیں دے دی جائیں، اگر تینوں دیدیں تو یہ تعلق پورے طور پر ٹوٹ جاتا ہے اور اگر ایک دو طلاقیں دیں تو اس درجہ برقرار رہتا ہے کہ اگر چاہیں تو قاعدے کے مطابق پھر ساتھ رہ سکتے ہیں۔

عائلی نظام کے اراکین کے حق میں قرآن وحدیث کی بعض اہم ہدایات ملاحظہ ہوں،

قرآن کریم نے متعدد مواقع پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کو کسی بھی قسم کی تکلیف دینے سے منع کیا ہے حتیٰ کہ ان کی کسی بات پر ''اُف'' تک کہنے سے بھی روکا ہے، وہ اگرچہ کافر و مشرک ہوں ان کے ادب و احترام اور خدمت کا حکم ہے، ایمان و اصلاح کی دعوت بھی حد درجہ ادب کے ساتھ دی جائے گی، حد یہ ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت اور باپ کی رضاء کو اللہ کی رضاء بتایا گیا ہے۔

اولاد وعیال کے حق میں ارشاد ہے کہ سب کو آگ سے بچاؤ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''اولاد کے حق میں ان کی اچھی تربیت سے بہتر کوئی عطیہ نہیں''، لڑکی و لڑکا ہر ایک کی تربیت و پرورش کا حکم یکساں ہے اور چونکہ لڑکی پر اکثر توجہ کم ہوتی ہے، اس لئے اس کی تاکید زیادہ اور اس پر خاص اجر کا ذکر فرمایا گیا ہے اور مرنے کے بعد جن چیزوں کی وجہ سے انسان کے حق میں ثواب کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے ان میں نیک اولاد کو بھی بتایا گیا ہے۔

قرآن وحدیث نے زوجین میں سے ہر ایک کے دوسرے پر بڑے حقوق بتائے ہیں، قرآن کا بیان ہے کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں عورتوں کے مردوں پر ہیں؛ ہاں مردوں کو فوقیت ضرور حاصل ہے، اسی وجہ سے اسے عائلی نظام کا سربراہ بنایا گیا ہے، حتی الامکان بیوی کے ساتھ بھلائی کے معاملہ کی تاکید ہے اور شوہر کے متعلق یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو اپنے شوہروں کے لئے سجدہ کا حکم کرتا، شوہر اگر سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کرنے کا حکم دے تو بھی عورت کو ماننا چاہئے، بس یہ کہ کسی نافرمانی کا حکم نہ ہو۔

جو بھائی بہن ساتھ رہ رہے ہوں اور بالخصوص چھوٹے ہوں ان کی دینی و دنیوی ضرورتوں کا لحاظ بھی اولاد کی مانند کیا جائے گا، ایسے ہی چھوٹے بھائی بہنوں کو سمجھنا چاہئے، حتیٰ کہ ارشاد نبویؐ ہے کہ: ''بڑا بھائی والد کے درجے میں ہوتا ہے''۔

اسلام کا نظامِ اخلاق

معاشرتی واجتماعی زندگی کے بنانے وسنوارنے میں اخلاق کو نمایاں وبنیادی حیثیت حاصل ہے، بلکہ معاشرت واجتماع کی پہلی اینٹ ''اخلاق حسنہ'' ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے حکماء نے انسان کی منظم زندگی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے پہلا مرحلہ ''تہذیب نفس'' کو قرار دیا ہے، جس کا حاصل اخلاق حسنہ کو اختیار کرنے اور اس کا عادی بننے وبنانے کے علاوہ کچھ نہیں، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حسن اخلاق کے بغیر انسان نہ صرف یہ کہ انسان نہیں رہ جاتا بلکہ درندگی وبہیمیت پر اتر آتا ہے، انسانیت کا زیور ولباس ہی حسن اخلاق ہے، کسی ملک وملت اور عہد وزمانے میں معاشرہ وماحول پر برا اثر ڈالنے والی عادات واخلاق کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا، بلکہ اس قسم کی ہر حرکت کو ہر آسمانی وغیر آسمانی مذہب میں حرام وممنوع قرار دیا گیا ہے، شرط یہ ہے کہ اس کی بنیاد نفسانیت اور خواہشات پر نہ ہو، شراب، چوری، ڈاکہ، زنا، قتل وخوں ریزی، غارت گری ولوٹ مار، غیبت وبدگوئی، چغل خوری وبہتان، کینہ وحسد وغیرہ تمام امور اخلاق حسنہ کی حدود سے گرے ہوئے اور انسانیت کا کوڑھ ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ عمدہ اخلاق کیا ہیں اور ان کا علم کیسے ہو؟ تو اس سلسلہ کی بہت سی چیزیں عقل سلیم، پاکیزہ شعور اور صحیح تجربہ کے ذریعہ جان لی جاتی ہیں، مگر شرعی ذریعۂ علم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو انسانوں میں پائے جانے والے اخلاق وعادات میں نیک وبد کی تمیز کرکے بتاتے ہیں اور جن ضروری امور وپہلوؤں کی طرف انسان کی توجہ نہیں جاتی، ان کا اضافہ کرتے ہیں اور اعتبار انہیں کے قائم کردہ معیار کا ہے، بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ ازل سے حضرات انبیاء کرام علیہ السلام کے ذریعہ ہی انسانوں کو اس کے حقیقی

مفہوم کا علم ہوتا رہا ہے، اس لئے اسلام کے دائرہ تعلیم وتشریع سے یہ چیزیں کیسے باہر ہوسکتی تھیں، خود حضورؐ کی بابت فرمایا گیا ہے: ''اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ '' (بے شک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں)۔

بلکہ حضورؐ نے اپنی زبان مبارک سے یہاں تک فرمایا ہے: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ '' (مجھ کو اس لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ میں عمدہ اخلاق کو کمال تک پہنچادوں) یعنی اپنی زبان سے تمہارے سامنے ان کو بیان کروں اور عمل سے برت کر بھی دکھادوں)۔

اسلام کے نظام اخلاق کا حاصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو ومرحلہ میں اعلیٰ کردار کو اپنایا جائے، اسی کی اشاعت کی جائے، اسی کی تعلیم دی جائے اور اس سب سے صرف اللہ کی رضاء جوئی کا قصد وارادہ کیا جائے۔

قرآنی آیات وروایات میں بے شمار مواقع پر اخلاق حسنہ اور اخلاق کے اعتبار سے کامل مومن وحقیقی انسان کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ پورا قرآن اور مجموعۂ احادیث اخلاق حسنہ کا مرقع وپیکر ہے، ارشاد نبوی آپ نے ملاحظہ فرما ہی لیا ہے، جس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ حضورؐ کی ساری قولی وعملی جد وجہد اخلاق حسنہ کا ہی بیان ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ: حضورؐ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: ''آپؐ کے اخلاق، چلتا پھرتا قرآن تھا'' یعنی قرآن پڑھو، تم آپؐ کے پیکر اخلاق کو اپنے سامنے پاؤ گے، اسی لئے تو علامہ اقبال فرماگئے ہیں ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

اسی سلسلہ کی خصوصی آیات سورہ اعراف رکوع ۸، سورہ اسراء رکوع ۳ و ۴ اور سورہ حجرات اور سورہ ممتحنہ ہیں۔

حسن اخلاق میں امتیازی امور یہ ہیں: وقار و سنجیدگی، سادگی وصفائی، خوش کلامی و نرم کلامی، الفت ومحبت، عدل وانصاف، سچائی وایفاءعہد، مظلوم کی حمایت ومدد، دیانت و امانت، صبر وتحمل، تواضع وانکساری، اخلاص وللٰہیت، شجاعت ودلیری، جود وسخاوت، حق کی حمایت، مصیبت زدہ وپریشان حال پر ترس، بڑے کا احترام، چھوٹے پر شفقت، عفت و پاکدامنی، خوش روئی وخندہ پیشانی، خوش مزاجی وخوش مزاحی۔

اس کے بالمقابل: بے حیائی وڈھٹائی، فخر وغرور، تکبر وحسد، چغلخوری وبہتان، بیہودہ گوئی وسخت کلامی، غیبت وعیب جوئی، ظلم وحق تلفی، جھوٹ و بدعہدی، خیانت وچوری، جھوٹ ووعدہ خلافی، ناجائز حمایت وبے جا تعریف، جھوٹی گواہی، گندا مذاق، بدظنی وبد نگاہی، دوسری کی مصیبت پر خوشی، بڑوں کی بے ادبی وبے احترامی، چھوٹوں کے ساتھ سختی و درشتی وغیرہ برے اخلاق ہیں۔

اقتصادی ومعاشی نظام

ہر عہد وزمانے اور ہر ایک ملک وملت میں اقتصادی ومعاشی مسئلہ یعنی مالیات کا نظام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے، اس لئے کہ تقریبا تمام تر انسانی ضروریات مال پر ہی موقوف ہیں، خواہ تمدنی وثقافتی ہوں، یا تعلیمی وصنعتی، اندرونی نظم ونسق کی ہوں یا بیرونی دفاع کی، حتیٰ کہ فطری ضروریات جن پر پوری نسل انسانی کا باقی ومحفوظ رہنا موقوف ہے، ان کے پورا کرنے میں بھی عام طور سے مال کی احتیاج رہتی ہے، دوسری طرف مال کے اعتبار سے انسانوں میں فرق مراتب قانون فطرت وقدرت ہے، ارشاد خداوندی ہے: ''وَاللهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٍ فِي الرِّزۡقِ'' (اور اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق میں فضیلت دی ہے) نہ تو ہر ایک کو مال کے کمانے کے یکساں وسائل میسر ہیں اور نہ ہر ایک میں یکساں صلاحیت واستعداد، اسی لئے کسی ملک ومعاشرہ کے تمام افراد کے پاس مساوی دولت نہ کبھی رہی ہے نہ رہے گی، جن تحریکات نے اس قسم کا کوئی نظریہ اپنا کر کامیابی کا دعویٰ کیا ہے، انہوں نے دراصل انسانیت کو دھوکا دیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے قانون فطرت سے بغاوت کی ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، کامیاب وہ نظام ہے کہ جس کو اپنانے والے ملک وملت نے دوسری صدی ہجری کے سب سے پہلے سال میں وہ دن بھی دیکھے ہیں کہ دولت منداپنی زکوٰۃ لئے پھرتے تھے کہ کوئی مستحق اس کو لینے والا مل جائے مگر کوئی نہ ملتا تھا، یہ اسلام کا معاشی واقتصادی نظام ہے جسے آپ ذیل کی چند دفعات میں یوں سمجھ سکتے ہیں:

۱. وسائل وذرائع اگر جائز ہیں تو کسی کے حق میں نہ تو اسباب کی تحدید ہے اور نہ مال کی کسی مقدار کی، جو کچھ بھی کمایا جائے گا تنہا کمانے والے کی ملکیت ہوگا اور حکومت

وقت بھی اس کی مرضی کے بغیر اس میں تصرف کی مجاز نہ ہوگی۔

۲. حصول مال کیلئے کی جانے والی ساری تگ ودو صرف ایک ظاہری صورت ہے ورنہ مال کا آنا جانا سب اللہ کی طرف سے ہے اور اس سلسلہ میں بندہ اسی کا مرہون منت ہے۔

۳. قناعت (ضروریات پر اکتفاء) اور کفایت شعاری (ضروریات کو محدود کرنا) ہی کامیاب معاشی زندگی کے اصول ہیں۔

۴. اپنے ہم جنس سے ہمدردی انسانی ہی نہیں بلکہ حیوانی فطرت ہے جس کا مقتضی یہ ہے صرف اپنی ہی ضروریات پر نظر نہ رکھی جائے اور اللہ کی جانب سے ملی ہوئی دولت کو صرف اپنے ہی تقاضوں کیلئے نہ سمجھا جائے بلکہ دوسرے کی ضروریات کو اپنی سمجھ کر اس پر بھی توجہ کی جائے اور خود کو دوسروں کی ضروریات کے پورا کرنے کے حق میں ذریعہ ووسیلہ سمجھا جائے۔

یہ تو چند فکری ونظریاتی دفعات ہیں آگے عملی دفعات ملاحظہ ہوں جن کا عملاً تجربہ کیا جا چکا ہے اور ان کا نتیجہ خیر بھی دیکھا جا چکا ہے۔

۱. جو لوگ اہل وسعت ہیں ان سے سالانہ کچھ معمولی مطالبہ ہے جس کو زکوٰۃ کہتے ہیں؛ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جس کے پاس:

(الف) کم از کم ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی ہے (ب) یا اسی مالیت کا سامان تجارت (ج) یا اتنی ہی مالیت میں ضرورت سے زائد روپے، ان سے سال گذرنے پر، اتنی مالیت کے چالیسویں حصے یعنی ڈھائی فیصد کا مطالبہ ہے، اس مالیت پر جو اضافہ ہو اس پر اسی حساب سے زیادتی ہوگی (د) مخصوص مقدار میں اگر پالتو جانور: اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، ہیں تو ان میں بھی کچھ شرطوں کے ساتھ معمولی سا مطالبہ ہے (ہ) کھیت وغیرہ کی پیداوار میں کچھ شرط و تفصیل کے

ساتھ ہر فصل کے موقع پر دسویں یا بیسویں حصہ کا مطالبہ ہے (و) اوپر ذکر کردہ مالیت یا اسی مالیت کا ضرورت سے زائد دوسرا سامان مثلاً کپڑے، برتن وغیرہ جس کے پاس ہوں، اس سے ہر عید الفطر کے موقع پر خود اپنی اور اپنے نابالغ بچوں میں سے ہر ایک کی جانب سے دو سیر کے قریب گیہوں یا اس کی قیمت کا مطالبہ ہے۔

۲. بعض صورتوں میں خود اپنے کسی قول وفعل کے نتیجے میں مخصوص مقدار میں کوئی مال ضرورت مندوں کو دینا پڑتا ہے، مثلاً کفارۂ قسم میں کھانا یا کپڑا، کفارہ ظہار میں کھانا نذر کی صورت میں جو کچھ نذر مانی گئی ہو، نماز وروزہ کا فدیہ، حالت احرام میں شکار کا فدیہ ـــــ اسی طرح مختلف مواقع پر جانور کو ذبح کرنے کا مطالبہ وحکم اور فقراء پر اس کا صرف مزید برآں ہے، جیسے حج کی بعض صورتیں، حج کی بعض غلطیاں، قربانی، عقیقہ۔

۳. نظام وراثت جس کے تحت مرنے والا اگر کچھ مال چھوڑ کر مرے تو چند اصول وقواعد کی رعایت کے ساتھ اس کے قریبی اعزہ مرد وعورت، شوہر وبیوی اولاد، والدین، بھائی، بہن وغیرہ اس کے مالک ہوتے ہیں۔

۴. نظام نفقہ یعنی مخصوص افراد کے تمام ضروری اخراجات کی ذمہ داری ان سے متعلق بعض قریبی افراد پر، مثلاً بیوی ونابالغ بچے ان کے خرچ کی ذمہ داری تو حسب وسعت ہر حال میں ہے، نیز ضرورت کی بناء پر والدین وبھائی وبہن یا بعض دوسرے نہایت قریبی اعزہ کی ذمہ داری بھی رکھی گئی ہے۔

۵. ان لازمی اور غیر اختیاری مطالبات ونظام کے علاوہ مختلف عنوانوں سے ایک انسان کو دوسرے کے ساتھ ہر قسم کی ہمدردی کی تاکید ہے قرابت، پڑوس، یتیمی، غربت، رفاقت، ضرورت، قرض، قید، سفر، خدمت دین، اسلام، انسانیت اس کیلئے نہ تو مال کی کوئی مقدار متعین کی گئی ہے کہ کتنا مال ہو تو یہ مطالبہ ہے اور کتنا دے اور نہ افراد

متعین ہیں کہ کون کرے۔

۶. جمہوری وعوامی مصلحت وضرورت کی چیزیں حکومت کے زیر نگرانی رکھی گئی ہیں اور سب کو ان سے یکساں طور پر فائدے کا حق دیا گیا ہے، مثلاً پانی، دریا (نہر وچشمہ وغیرہ)، چارہ، لکڑی (گھاس وجنگل) شکار۔

۷. حکومت کیلئے بھی مالیات کی فراہمی کی کچھ صورتیں رکھی گئی ہیں جس کے ذریعہ وہ ملک وملت کی ہر قسم کی ضروریات کی دیکھ بھال کر سکے، ضرورت مندوں کی ضرورت رفع کرے، رفاہی کام کرے، دفاعی ضروریات میں لگائے، دوسرے تمدنی وثقافتی میدانوں میں کام کر سکے، مثلاً کفار سے حاصل ہونے والا مال خواہ جنگ کے ذریعہ حاصل ہو یا صلح کے ذریعہ، لاوارث مرنے والے کا ترکہ، لاوارث مقتول کا خون بہا بعض صورتوں میں زکوۃ، حکومت کے تحت "بیت المال" کا شعبہ، عہد نبوی وعہد صحابہ سے اسی کیلئے قائم کیا جاتا ہے۔

اسلام کا نظام سزا

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہ تو فرشتوں کی طرح معصوم (بے گناہ) پیدا کیا ہے اور نہ شیطانوں کی طرح محروم کہ گناہ ہی کرتے رہیں، بلکہ ان کو خیر وشر دونوں کا جامع بنایا ہے، ان میں خیر کی صورت میں ملکی (فرشتوں کے) خواص بھی رکھے ہیں اور شر کی صورت میں شیطانی اثرات بھی، ان کو گوشت و پوست کا جسم عطا کر کے اور کھانے پینے وغیرہ فطری ضروریات پر ان کے بقاء کو موقوف کر کے اور ان کے استعمال پر مجبور کر کے ان کو اس مادی دنیا سے باندھا ہے اور جسم کے نظام کو روح کے ہاتھ میں دے کر ان کو ملأ اعلیٰ سے وابستہ کیا ہے اور ہمیشہ سے ان دونوں کے اثرات ان میں ظاہر ہوتے رہے ہیں، جب خیر کا غلبہ ہوتا ہے تو انسان، انسان، مومن، ولی، شہید، نبی ورسول ہوتا ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت میں اس مقام تک پہنچتا ہے کہ جہاں تک فرشتوں کی بھی رسائی نہیں اور جب شر کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ فاجر، فاسق، کافر ومشرک بلکہ فرعون ونمرود کی صورت میں خدائی کا دعوے دار، عبداللہ بن ابی وغیرہ جیسے منافقوں کی صورت میں جہنم کے سب سے نچلے طبقے کا حقدار بلکہ تمام دنیا کے حیوانات سے بھی بدتر وبدکردار بن بیٹھتا ہے۔

اور چونکہ شر اس کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے جہاں خیر کی طرف اس کو توجہ دلانے اور کھینچنے کیلئے وحی والہام، نبوت ورسالت، کتب وصحائف وعظ ونصیحت کا سلسلہ رکھا گیا ہے وہیں شر کی طرف دعوت دینے کیلئے نفس وشیطان، فطری ضروریات ونفسانی خواہشات، بدطینت وسرکش انسان بھی موجود ہیں۔

حاصل یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام تو چونکہ گناہوں سے بالکل پاک وصاف ہوتے ہیں، اس لئے ان کے علاوہ تمام انسانوں سے خیر وشر دونوں ہی ظاہر ہوتے ہیں، جہاں وہ

اللہ کے احکام کی بجا آوری میں مصروف و مشغول رہتے ہیں؛ وہیں ان سے حکم عدولیاں و نافرمانیاں بھی ہوتی ہیں اور فطری چیز ہونے کی وجہ سے محض حکم عدولی و نافرمانی اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ و مذموم بھی نہیں، بلکہ ناپسندیدگی و مذمت تو اس کی ہے کہ انسان اپنی حکم عدولی و نافرمانی کا احساس نہ کرے، اس پر معذرت نہ پیش کرے بلکہ ناز کرے اور اصرار کرے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر بھول کر بغیر قصد و ارادہ کوئی نافرمانی ہوجائے تو اس پر کوئی گرفت و پکڑ نہ ہوگی، ہاں اگر جان بوجھ کر کوئی حرکت کی جاتی ہے تو ہر حرکت آخرت کو تو نقصان پہنچاتی ہی ہے، دنیا پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور یہ دو طرح: ایک تو یوں کہ ایسی حرکتیں اللہ کی ناراضگی کا ذریعہ بن کر اس کے رحم و کرم کی بارش کا سلسلہ روک دیتی ہیں اور ساری دنیا میں قسم قسم کا بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ـــــ خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں۔

دوسرے یوں کہ بہت سی حرکتیں خصوصیت سے کسی ایک انسان یا چند انسانوں کے نقصان یا نظام عالم اور امن عالم کی تباہی و بگاڑ کا باعث بنتی ہیں انسانیت کی بقاء کیلئے دونوں کا تدارک ضروری ہے، پہلے تدارک کی صورت تو بارگاہ خداوندی کی طرف رجوع، ندامت اور توبہ و استغفار ہے، ارشاد ہے:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ـــــ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ بے شک بڑا بخشنے والا ہے، کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگادے گا اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا۔

توبہ و استغفار سے نہ صرف دنیا کے فساد و مصائب دور ہوتے ہیں بلکہ بگڑی ہوئی آخرت بھی بن وسدھر جاتی ہے، یہ چیز اللہ کے نزدیک اتنی محبوب ہے کہ ہمہ وقت اس کے دروازے اس کیلئے کھلے ہیں، شرط یہ ہے کہ سچائی و اخلاص کے ساتھ ہو، بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ اگر گناہ نہ کر کے تم توبہ کرنے والے نہ بنو گے تو اللہ دوسرے لوگ گناہ کر کے توبہ کرنے والے پیدا فرمائے گا۔

اور دوسرے تدارک کیلئے ایک تو یہ صورت رکھی گئی ہے کہ جو مالی یا جانی نقصان ہوا ہے، مجرم سے حسب موقع و شرائط اس کا معاوضہ لیا جائے، دوسرے یہ کہ مجرم کو کوئی ایسی جسمانی سزا دی جائے کہ آئندہ نہ تو خود وہ یہ حرکت دوبارہ کرے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس کی جرأت و جسارت ہو ـــ معاوضہ مالی نقصانات میں بھی لیا جاتا ہے، جیسے کسی نے کسی کا کوئی سامان اپنا لیا یا قصداً اسے ضائع کردیا اور جانی و جسمانی نقصانات میں بھی، جیسے کسی کی جان لے لی جائے، جسم کا کوئی حصہ کاٹ، پھوڑ، توڑ دیا۔

رہی جسمانی سزا تو اصول و قواعد کی رعایت رکھتے ہوئے حسب موقع کسی بھی شرارت پر کسی صورت میں دی جاسکتی ہے، ہاں چند شرارتیں ایسی ہیں کہ جن کی سزا شریعت نے متعین کردی ہے، غیر متعین سزا، شریعت کی اصطلاح میں ''تعزیر'' کہلاتی ہے، جو جھڑکی و گھڑکی کی بھی ہوسکتی ہے اور تیز نظر بھی ہے، لعنت و ملامت بھی ہوسکتی ہے اور ہاتھ، چھڑی، کوڑے کی مار بھی، جس کی مقدار کی تعیین حاکم کی رائے پر ہے اور ضرورت سمجھنے پر وہ قتل کی سزا بھی دے سکتا ہے اور متعین سزائیں ''حدود'' کہلاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱. قتل یا اتلاف اعضاء کی سزا، قتل یا جو عضو ضائع و تلف کیا گیا اس کو ضائع کردینا (کچھ تفصیل کے ساتھ)۔
۲. ڈکیتی و بغاوت، اگر صرف ڈرانا دھمکانا ہو تو قید یا جلا وطنی، صرف مال لوٹ لیا ہو تو ایک ہاتھ پیر کاٹا جائے گا، اگر صرف جان لی تو قتل کیا جائے گا، اگر لوٹا بھی اور جان

بھی لی تو بھی جان لی جائیگی، خواہ قتل کر کے یا سولی دے کر، ساتھ ہی ہاتھ پیر بھی کاٹے جاسکتے ہیں۔

۳۔ ارتداد یعنی اسلام سے بغاوت کی سزا قتل ہے اور عورت مرتد ہو تو قید کر دی جائے گی۔

۴۔ زنا کرنے والا اگر شادی شدہ اور چند دوسری شرطوں کے ساتھ متصف ہے تو پتھر مار مار کر اسے ختم کر دیا جائے گا اور اگر کسی شرط کی کمی ہے تو سو کوڑے لگیں گے۔

۵۔ چور کا پہلی مرتبہ چوری کرنے پر گٹوں سے داہنا ہاتھ کاٹا جائے گا، دوسری مرتبہ بایاں پیر، پھر اگر چوری کرے تو قید کر دیا جائے گا۔

۷۔ شرابی کی سزا اسی کوڑے ہے۔

۸۔ جو آدمی کسی کو زنا کا جھوٹا الزام دے اس کی سزا بھی اسی کوڑے ہے۔

آج دنیا ان شرعی و اسلامی سزاؤں کو "وحشیانہ" کہتی ہے، حالانکہ خود نہ جانے کیسی کیسی وحشیانہ سزائیں دیتی ہے، پھر جب کہ ان سزاؤں کو نافذ کرنے کا نفع بھی دنیا کے سامنے ہے، حق یہ ہے کہ یہ سزائیں جس کسی ملک میں جاری ہوئیں وہاں عوام کو امن و امان سے رہنے کا موقع ملا اور جہاں جاری ہوں گی وہاں ملے گا، آج بھی جن ملکوں میں یہ سزائیں رائج ہیں وہاں ان جرموں کی مقدار کیا ہے؟ معلوم کر لیجئے اور پھر دنیا کے مہذب ترین ملکوں کے حالات معلوم کیجئے؟ آپ خود اسی فیصلہ پر مجبور ہوں گے۔

اسلامی مساوات

آج کی متمدن دنیا میں سب سے اہم معاشرتی مسئلہ "باہمی مساوات" کا ہے، مساوات کے معنی برابر ہونے کے ہیں، مشہور نظریاتی مفہوم یہ ہے کہ تمام افراد انسانی تمام حقوق میں یکساں ہوں اور باہم کسی اعتبار سے کوئی فرق و امتیاز نہ برتا جائے، اسی کو بروے کار لانے کیلئے دنیا میں بعض اقتصادی نظام بھی رائج ہیں، جیسے کمیونزم و سوشلزم اور اسی کی بنیاد پر آج دنیا کے متمدن ممالک میں کار ہائے زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتوں کو مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں اور ہر طرح سے اس کا پروپیگنڈہ اور اس کی دعوت دی جا رہی ہے۔

اسلام جو کہ دین فطرت اور دین رحمت دونوں ہے، اس نے آج سے سیکڑوں سال پہلے دنیا کو یہ سبق پڑھایا ہے اور اپنے پیروکاروں کو عملاً اس پر چلا کر دنیا کو اس کی کامیابی باور کرائی ہے، چنانچہ اس وقت رنگ و نسل اور مذہب و زبان کی بنیاد پر پائے جانے والے فرق کو معاشرہ سے یکسر ختم کر کے دکھایا، مگر یہاں بھی یہ بات لائق لحاظ ہے کہ اسلامی مساوات کا وہ مفہوم نہیں ہے جو آج سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے، اس لئے کہ رائج مفہوم نہ صرف یہ کہ فطرت کے خلاف ہے؛ بلکہ باعث فساد و انتشار بھی ہے؛ کیونکہ اس کا حاصل حقوق کا احترام نہیں بلکہ حق تلفی ہے، یہ ظاہر ہے کہ از روئے فطرت تمام انسانوں کی صلاحیتیں اور استعدادیں یکساں نہیں، نہ ان کی عقل و فہم برابر ہے، نہ ذمہ داریوں اور عہدوں میں سب ایک، مرد و عورت کے درمیان فطرۃً ایسا طبقاتی فرق ہے کہ عورت کبھی مرد کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی، یہ فطری فرق مراتب ہے جس سے صرف نظر کر کے کوئی نظام بنانا فطرت سے بغاوت ہے، اس لئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اسلامی مساوات کا مفہوم تمام افراد کا انسانیت کے سارے حقوق میں برابر ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ کسی فرد بشر کی حق تلفی نہ ہو، اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا کی ہر نعمت سے ہر ایک یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے اور ہر میدان میں کام کا اہل ہے، اگر اس کام کے مناسب شرطیں اس میں پائی جاتی ہیں اور نہ ہی کسی کے ساتھ ناجائز رعایت ہو کہ بڑے سے بڑا جرم کر بیٹھے اور پھر بھی رنگ ونسل، یا عہدہ ومنصب کی آڑ لے کر بچ جائے، آپ ''عدالتی نظام'' کے تحت اس سلسلہ کی بعض اہم چیزیں پڑھ چکے ہیں، حاصل یہ کہ مساوات کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ سب کیلئے قانون یکساں ہو بلکہ مساوات کا مفہوم یہ ہے کہ سب کے حق میں نفاذ یکساں ہو۔

اس لئے اسلام نے جہاں حقوق کی ادائیگی اور کسی جرم پر مواخذہ کے حق میں حاکم و محکوم، امیر وغریب، اجنبی ورشتہ دار، مرد وعورت، آزاد وغلام سب کی گرفت کی ہے، وہیں صلاحیت واستعداد اور عہدہ ومنصب کے اعتبار سے حقوق کی تقسیم بھی کی ہے، جہاں ایک طرف اشاد قرآنی ہے:

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ـــــ	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنا دیا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ خاندانی وقبائلی فرق، گروہ بندی وبرتری جتانے کیلئے نہیں، وہیں یہ بھی ہے: ''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاكُمْ'' (بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہ ہے جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے) کہ تقویٰ بہر حال انسان کو امتیاز عطا کرتا ہے، ارشاد نبوی جہاں یہ ہے کہ: ''سارے انسان برابر ہیں؛ کسی عربی کو کسی غیر عربی پر فضیلت حاصل نہیں''، وہیں یہ ہے: ''انسان بھی سونے وچاندی کی کانوں کی

طرح ہوتے ہیں، جو ان میں جاہلیت میں بہتر رہا ہو وہ اسلام کے بعد بھی بہتر ہی شمار ہوتا ہے''، جہاں یہ آیا ہے: ''فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو ہاتھ کٹے گا'' وہیں یہ بھی فرمان ہے: ''لوگوں کے ساتھ معاملہ ان کے مرتبہ کے مطابق کرو''، جہاں یہ فرمایا گیا ہے: ''اہل کتاب، اہل شرافت وریاست کو سزا دینے سے گریز کیا کرتے تھے''، وہیں یہ بھی ارشاد ہے کہ: ''اصحاب حیثیت اور ارباب وجاہت کی لغزشوں سے درگذر کیا کرو''، ان ارشادات کا حاصل وہی ہے جو ذکر کیا گیا کہ ہر فرد انسان کو جینے اور زندگی سے لطف اٹھانے کا حق حاصل ہے اور کسی کیلئے بے جا مراعات نہیں ہیں، اسلام نے معاشرہ میں عورت کو ایک اہم مقام عطا کر کے گھر کی اندورنی ذمہ داریوں کا اسے سربراہ بنایا اور مردوں کو اس کے حقوق سمجھائے اور عورتوں کیلئے مردوں کو ''سرتاج' بنا کر مردوں کے حقوق ان کو سمجھائے، آقا و حاکم کو یہ سمجھایا کہ تمہارے ماتحت بھی انسان ہی ہیں، تمہاری ضروریات کی طرح ان کی بھی ضروریات ہیں، گردش زمانہ نے ان کو تمہارا ماتحت بنایا ہے، لہٰذا ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کرو اور غلام ومحکوم کو یہ کہ یہ تمہارے بڑے ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی تم کو دنیا وآخرت دونوں جگہ کامیاب کرے گی اور بغاوت رسوا اور نامراد، حتیٰ کہ باغی بھاگے ہوئے غلام کی نماز مقبول نہیں ہوتی، امیر وغریب میں سے ہر ایک کو دوسرے کے حقوق سمجھائے اور ہر ایک سے اس پر عائد ذمہ داریوں کا سوال کیا ہے، ارشاد نبوی ہے: ''تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کا سوال ہوگا؛ پوری جماعت کا سربراہ ذمہ دار ہے، اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا، انسان اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا اور عورت اپنے گھر اور اولاد کی ذمہ دار ہے، اس سے ان کی بابت سوال ہوگا، غلام اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے، اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا''۔

حاصل یہ کہ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار اور ہر ایک اپنی ذمہ داری کی بابت جواب دہ

ہے، باقی یہ فرق مراتب جو حدود متعین کئے گئے ہیں، انہیں کی حد تک ہے، اس سے آگے زندگی کے ہر میدان میں ہر ایک کو شرکت اور جدوجہد کا حق حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر موقع پر ہر قوم و ملک اور رنگ و زبان اور ہر طبقہ و عہدہ کے لوگوں کو شرکت کا موقع دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے مفتوحین ہر میدان میں وہ نمایاں کام کر گئے جو کسی دوسرے مذہب و قوم کے مفتوحین نہ کر سکے، خواہ یہ میدان صنعت و حرفت کا ہو، یا علم و عمل کا، جنگ و جہاد ہو یا حلقہ تعلیم و تدریس، اسلام نے اپنے ہی اتباع کو موقع دیا ہے کہ عبادت کیلئے اپنے معبود کے دربار میں شاہ و گدا سب ایک جگہ، ایک وقت میں، ایک ہیئت پر پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں، خواہ نماز کی جماعت ہو یا اعمال حج، بڑے بڑے مایہ ناز فاتحین غلام ہی تھے، علم و عمل کی لائن میں کیا پوچھنا، اکابر صحابہ کی وفات کے بعد اصاغر صحابہ کی آخر عمر اور تابعین کے درمیانی عہد میں اسلامی مملکت کے مرکزی شہروں میں جن حضرات کے علم کا طوطی بولتا تھا وہ غلام ہی تھے اور اسلامی علوم و فنون کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے کہ کن علاقوں میں اور کن کن افراد کے ہاتھوں کیا کارہائے نمایاں انجام پائے، امام ابوحنیفہؒ کا اصل وطن کہاں تھا؟ بخاری و مسلم اور ابوداؤد و ترمذی وغیرہ کا کس سرزمین سے تعلق تھا؟ ابومنصور ماتریدی کہاں کے تھے اور محی الدین ابن عربی و ابن حزم کس ملک کے باشندے تھے؟ نافع، عکرمہ، حسن بصری، عطا، مکحول، سروق، ابن سیرین وغیرہ اکابر تابعین اہل علم کون تھے؟

یہ اسلامی مساوات ہی تھی جسے بدر کے موقع پر نگاہ تاریخ نے یوں دیکھا کہ ایک اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابودرداءؓ و علیؓ کے حصہ میں تھا اور آپ بھی اپنی باری میں باصرار پیدل چلتے تھے کہ سب برابر ہیں اور حضرت عمرؓ نے جب بیت المقدس کا سفر کیا تو اونٹ پر وہ اور غلام باری باری بیٹھتے تھے، جب قریب پہنچے تو غلام کی باری تھی، چنانچہ شہر میں داخلہ یوں ہی ہوا کہ نکیل حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں اور سواری پر غلام، اسی مساوات نے ہی حضورؐ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کو زید بن حارثہ غلام سے اور فاطمہ

بنت ولید قریشیہ کو حضرت حذیفہ کے غلام سالم سے جوڑا تھا، اسی کا کرشمہ تھا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ سب کے سب ایک غلام زادے اسامہ بن زید کی امارت و قیادت میں دے دیئے گئے تھے۔

عورتوں کیلئے بھی علم و عمل میں ترقی کے وہ دروازے کھولے کہ حضرت عائشہؓ تمام صحابہؓ کا مرجع تھیں اور حضرات صحابیات تمام امت کی عورتوں کے لئے اسوہ و نمونہ بنیں۔

اسلامی نظام شب وروز

اللہ کی قدرت کی اہم نشانیوں میں سے شب وروز کا نظام بھی ہے یعنی وقت کا رات ودن دو اہم حصوں پر تقسیم ہونا اور ان کا گھوم گھوم کر آتے رہنا، اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حکمت؛ تحصیل معاش کی سہولت اور اس کیلئے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تکان سے آرام واستراحت کو بتایا ہے، پھر رات ودن کو سہولت کیلئے گھنٹے اور دنوں پر تقسیم کیا گیا ہے جیسے کہ دنوں کو جوڑ کر ہفتہ، مہینہ اور سال پر تقسیم کیا گیا ہے اور سال کے اعداد وشمار کے مختلف نظام اپنائے جاتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی اپنا بہت بڑا احسان فرمایا ہے، اس لئے یہ پورا نظام انسانی ضروریات کے سلسلہ میں بڑی اہمیت و سہولت کا حامل ہے، اوقات کی یہ تقسیم طبعی وفطری ہے جس پر دنیا اور انسانیت روز اول سے قائم ہے۔

اسلام نے بھی اس فطری نظام کو اسی انداز پر قبول کیا ہے، البتہ دنوں ومہینوں کے نام عربی واسلامی تجویز کئے ہیں اور سالوں کے اعداد وشمار کا نظام بھی اسلامی رکھا ہے، ہفتہ کے سات دن ؛یوم الاحد (یکشنبہ)، یوم الاثنین (دوشنبہ)، یوم الثلاثاء (سہ شنبہ)، یوم الاربعاء (چہارشنبہ)، یوم الخمیس (پنجشنبہ)، یوم الجمعۃ، یوم السبت (شنبہ) اور مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱-محرم الحرام، ۲-صفر المظفر، ۳-ربیع الاول، ۴-ربیع الآخر، ۵-جمادی الاولی، ۶-جمادی الاخری، ۷-رجب المرجب، ۸-شعبان المعظم، ۹-رمضان المبارک، ۱۰-شوال المکرم، ۱۱-ذی القعدۃ، ۱۲-ذی الحجہ۔

شروع میں تاریخ کے اندراج کا کوئی اہتمام نہیں تھا، نہ اس کے حساب کا کوئی نظام

معروف تھا، حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی عہد تک یہی صورت رہی، پھر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے توجہ دلانے پر تمام صحابہؓ سے مشورہ ہوا اور حضرت علیؓ کی رائے کے مطابق حضرت عمرؓ نے اس نظام کی بنیاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بلکہ دعوت اسلامی و نظام اسلامی کے اہم واقعہ ہجرت کو بنایا جو ۱۴ سنہ نبوی کے آغاز میں پیش آیا تھا اور اسلامی تاریخ میں اس کی اہمیت مخفی نہیں کہ اسلام کے عروج وترقی اور ایک مکمل نظام کے اعتبار سے دنیا میں نفاذ کا نقطۂ آغاز ہجرت ہی ہے اور اس کے بعد سے اب تک مسلمانوں میں مذہبی اعتبار سے یہی نظام رائج ہے، اس کو ہجرت کے سترہویں سال اپنایا گیا، یوں سہولت کیلئے مسلمان کسی بھی نظام کو اپنا سکتا ہے جو اس کے علاقے اور ماحول کے مناسب ہو لیکن چونکہ شریعت کے جن احکام کا تعلق متعین دنوں سے ہے ان میں اسلامی حساب وشمار کا ہی اعتبار ہے، اس لئے اس کی معلومات کا رکھنا اور اس کو اختیار کرنا فرض کفایہ ہے کہ ہر علاقہ میں دو ایک افراد ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو اس نظام سے پورے طور پر واقف ہوں اور ہر مسلمان کا اس سے واقفیت رکھنا مستحب وپسندیدہ ہے، عید، بقرعید، رمضان، حج، عاشوراء محرم، شب قدر، شب براءت، مطلقہ عورتوں وغیرہ کی عدت، زکاۃ کا سال ان سب میں اسی حساب کا اعتبار ہے، اسلامی نظام سال کی بنیاد چاند کا طلوع وغروب ہے، جس کی گردش ماہ بماہ پوری ہوتی رہتی ہے، عموماً چھ مہینے ۲۹ دن اور چھ تیس دن کے ہوتے ہیں اور پورا سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مادی چیزوں کے حق میں سال کے مختلف حصوں ودنوں نیز رات ودن کے اوقات کی تاثیر مختلف رکھی ہے کہ کوئی فصل کسی زمانے میں تو کوئی کسی زمانے میں ہوتی ہے اور ان اوقات کی تاثیرات کی بناء پر وہ ہمارے کام کے لائق ہوا کرتی ہیں، ایسے ہی اعمال کے حق میں، اوقات میں فرق کیا ہے، یوں کسی لمحے میں بھی کی جانے والی عبادت باعث اجر ہوتی ہے؛ نماز، روزہ، تلاوت، رات کا جاگنا، صدقہ و

تاثیرات، جو کچھ ہو اور ہر ماہ کے کچھ نہ کچھ فضائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی عنایات کی زیادتی اور ثواب کی کثرت کے حق میں مختلف ماہ و اوقات کی خاص تاثیرات حضوؐر نے ارشاد فرمائی ہیں، دن بھر میں وقت سحر اور سورج نکلنے تک اور عصر تا مغرب کے اوقات خاص فضیلت کے ہیں اور ان میں بھی وقت سحر، جیسے کہ عین سورج کے طلوع اور غروب اور زوال کے وقت پندرہ بیس منٹ کے قریب، نماز کا پڑھنا منع ہے کچھ اور وقت بھی اس حد میں آتا ہے، ہفتہ میں دوشنبہ و جمعرات کے دن کی اور جمعہ کی رات کی خاص فضیلت ہے، جمعہ کے دن میں ایک خاص وقت دعاء کی قبولیت کا بتایا گیا ہے، اسی لئے دوشنبہ و جمعرات کا روزہ مستحب ہے، ہر ماہ میں تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کی فضیلت روزوں کے حق میں ہے، محرم کی دسویں تاریخ (یوم عاشورہ) کو روزہ و نیک اعمال اور بالخصوص کھانے پینے میں وسعت کے حق میں، ربیع الاول میں حضوؐر کی ولادت مبارکہ کے دن کو، شعبان میں پندرہویں دن اور رات کو جسے ''شب براۃ'' کہتے ہیں، جس کے متعلق آیا ہے کہ پچھلے سال بھر کا جائزہ اور اگلے سال بھر کے کاموں کی فرشتوں کو سپردگی اس رات میں ہوتی ہے، رات کو عبادت کیلئے اور دن کو روزہ کے حق میں فضیلت حاصل ہے اور رمضان کی تو ہر گھڑی خصوصی عنایات کی ہے، چاند نکلنے سے لے کر عید کی نماز تک انعام و اکرام کی بارش کا زمانہ ہوتا ہے اور اس کا آخری عشرہ اور اس کی بھی طاق راتوں یعنی (۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ کی راتوں) کی خصوصی اہمیت ہے کہ اکثر شب قدر انہیں میں واقع ہوتی ہے، یعنی وہ رات جس میں ہر مخلوق اللہ کیلئے سجدہ ریز ہوتی ہے جس کا احساس بمشکل کسی کو نصیب ہوتا ہے، ویسے یہ رات سال بھر میں کبھی بھی پڑسکتی ہے، مگر غالب گمان انہیں راتوں کے حق میں بتایا گیا ہے، شوال کی پہلی رات و دن روزہ داروں کیلئے انعام کا موقع بتایا گیا ہے اور خوشی منانے کا دن رکھا گیا ہے، حتیٰ کہ اس دن روزہ رکھنا منع اور سخت گناہ ہے، ہاں اس کے بعد اس ماہ میں چھ روزوں کی فضیلت بتائی گئی ہے، آخری مہینہ ذی

الحجہ، حج جیسی اہم عبادت کا مہینہ ہے، جس کی تیاری شوال بلکہ اور پہلے سے کرنے والے کرتے ہیں، حج کے علاوہ کہ حج تو مخصوص مقام پر ہوتا ہے، اس مہینہ کے ابتدائی دس رات و دن بڑی فضیلت کے ہیں، حتیٰ کہ قرآن میں ان دس راتوں کی قسم کھائی گئی ہے، ایک حدیث میں ان دنوں کو تمام دنوں سے افضل بتایا گیا ہے اور ان میں بھی نواں دن جسے ''یوم عرفہ'' کہتے ہیں، اسی وجہ سے علماء کا فیصلہ ہے کہ سال کے سب سے افضل دن یہ دس اور ان میں یوم عرفہ ہے اور راتوں میں رمضان کے آخری عشرہ کی راتیں اور ان میں بھی شب قدر، یوم عرفہ کا روزہ بھی مستحب ہے، جیسے کہ اس ماہ کی دس، گیارہ، بارہ، تیرہ کو روزہ رکھنا منع ہے کہ قربانی کی وجہ سے گوشت کے کھانے و کھلانے کے دن ہیں، ۱۰، ۱۱، ۱۲ کو حاجیوں کے علاوہ دوسرے اہل استطاعت مسلمانوں کو بھی قربانی کا حکم ہے اور اس کا گوشت خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کا۔

اسلامی آزادی

اسلام دین فطرت و دین رحمت ہے اور انسان ساری کائنات کا حاکم ہے اور تمام مخلوقات اس کی محکوم، اس کا تقاضا ہے کہ انسان کو طبعاً ایک گونہ آزادی حاصل ہو اور وہ طرح طرح کی قیدوں میں جکڑا ہوا نہ ہو، ساری دنیا کی نگاہ میں اس کی بڑی اہمیت اور قدر و قیمت ہے، اسی کی بدولت انسان کی شخصیت بنتی اور نکھرتی ہے اور اسی کی بنیاد پر صحیح انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے اور انسانیت ترقی کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ حدود کا پابند بنا کر انسانوں کو آزادی عطا کی ہے اور تمام آسمانی مذاہب اس آزادی کا سبق پڑھاتے وسکھاتے رہے ہیں، مگر انسانوں نے جیسے ہر موقع پر اپنی ذاتی خواہشات کو مقدم رکھا، اسی طرح اس آزادی کے حق میں بھی کیا اور اپنے مفاد کی خاطر خود اپنے بھائیوں کو طرح طرح کے بندھنوں میں جکڑ کر رکھتا رہا ہے، ظہور اسلام کے وقت یہ جکڑ بندیاں پوری دنیا میں عروج پر تھیں، انسانون کے مختلف طبقات، ایسی چیزوں میں گھرے ہوئے تھے کہ وہ اپنی انسانیت کے حقیقی تقاضوں پر عمل کرنا تو درکنار اپنے ضروری وواجبی حقوق کے حصول کی بھی نہ کوشش کر سکتے تھے، نہ اس کیلئے زبان کھول سکتے تھے۔

اسلام نے اپنی دعوت کے ذریعہ صرف یہی نہیں کیا کہ انسانوں کا رشتہ ان کے معبود حقیقی سے جوڑا؛ بلکہ پوری انسانیت کو اس کی فطری آزادی عطا کی، آپ گذشتہ اوراق میں پڑھ ہی چکے ہیں کہ اسلام نے مختلف انسانی طبقات کے کیا حقوق رکھے ہیں اور ان کی ادائیگی کا کس درجہ اہتمام کیا ہے، اسلام کی عطا کردہ آزادی کسی ایک میدان کے ساتھ خاص نہیں ہے، انسانی زندگی کے جس پہلو اور دنیا کی واقعی ضروریات کے جس بھی اہم شعبہ کو آپ لیں معلوم ہوگا کہ اسلام نے اس کو اپنے اس فیض سے محروم نہیں رکھا ہے، یہ اس کی

عطا کردہ آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ قوم مسلم نے ہر میدان میں وہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی مذہبی قوم نے ان تمام میدانوں میں ایسے کارنامے انجام نہیں دیئے، دین وسیاست ہو یا ملک وملت کی خدمت ہو، علم وعمل ہو یا صنعت و حرفت، اقتصادیات ومعاشیات کا مسئلہ ہو یا معاشرت واجتماعیت کا، اس میں نہ مرد وعورت کا فرق رہا، نہ جوان وبوڑھے کا، نہ آزاد وغلام کا، نہ حاکم ومحکوم کا، آپ ہر میدان میں، ہر نوع کے افراد کو نمایاں پائیں گے، نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، بلکہ مسلمانوں کے زیر سایہ بسنے والے غیر مسلم بھی ان حقوق سے پورے طور پر مستفید ہوئے بلکہ شاید یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ظہور اسلام کے بعد آج تک انسانیت نے جو صحیح ومفید ترقی کی ہے یا کرتی رہے گی وہ سب اسی فطری آزادی کا کرشمہ ہے جس کی دعوت اسلام نے دی اور جس کا سبق اس نے پڑھایا، یہ ضرور ہے کہ یہ آزادی ہر قسم کی قید وبند سے بالکل خالی نہیں بلکہ اس کے کچھ حدود ہیں، جن میں بنیادی حیثیت حکم خدا ورسول کی اطاعت اور مسلمانوں کی صلاح وانسانیت کے احترام کو حاصل ہے۔

۱. مذہبی آزادی یوں عطا کی ہے کہ کسی کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ ان غیر مسلموں کو بھی جو اسلامی مملکت میں رہ رہے ہوں اور ایک زمانہ اسلام کی دشمنی ومخالفت میں انہوں نے گذارا ہو، انہیں اپنے مذہب پر برقرار رہنے، اس کے احکام وعبادات کے بجالانے، اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت اپنے رسم ورواج پر عمل، اپنے مذہب کی ہدایت کے مطابق پینے، پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے کی پوری آزادی عطا کی ہے، حتیٰ کہ وہ شراب وخنزیر کا بھی ہر طرح کھانے پینے اور تجارت میں استعمال کر سکتے ہیں، ہاں یہ کہ کوئی عمل اگر فطرت انسانی کے تقاضوں کے خلاف ہو مثلاً بہن، بیٹی، ماں سے نکاح یا پوری انسانیت ومعاشرت کے لئے ضرر رساں اور گھن کی طرح اسے چاٹ جانے والا جیسے ''سود'' تو اس سے ضرور منع کیا جائے گا،

حضورؐ اور آپؐ کے خلفاء نے بار بار اس کا اعلان کیا اور اپنے کارکنندگان کو اس کی تاکید کی، جنگ میں کسی مذہب کے پجاری وعبادت گذار کے قتل کی اجازت نہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کے تحت مختلف مذاہب کے لوگوں نے صدیاں گذاریں، ہر قسم کی ترقیاں کیں حتیٰ کہ ملکی وحکومتی عہدے بھی حاصل کئے اور مذہبی آزادی کے تحت مسلمانوں سے بحث ومباحثہ کی بھی اجازت ہے اور مسلمانوں کو ان سے نرم کلامی کی تاکید ہے، ہاں یہ کہ وہ خود اس کے ذریعہ کوئی فتنہ کھڑا کرنا چاہیں تو پابندی لگائی جائیگی۔

۲. فکر ورائے کی بھی آزادی ہے اس لئے کہ عقل ہی انسان کا امتیاز ہے اور اس کا کام غور وفکر ہی ہے، قرآن نے بار بار اس کی دعوت دی ہے، اس لئے کہ یہ غور وفکر اللہ کی معرفت، خوف وخشیت، پھر شریعت پر عمل اور اس کے حدود کی رعایت کا ذریعہ بنتا ہے، ہاں اس کے بھی کچھ حدود ضرور متعین ہیں مثلاً اللہ کی ذات وصفات کے حق میں عقل کو زیادہ دوڑانے کی اجازت نہیں کہ عقل سے ان کی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا اور فکر سے انسان جو نتیجہ حاصل کرے جو رائے سامنے آئے اس کے اظہار کی بھی آزادی بلکہ مطالبہ ہے؛ خواہ زبان سے ہو یا قلم سے، حضورؐ نے حق کہنے کی بار بار تاکید کی حتیٰ کہ اظہار حق کو افضل ترین جہاد فرمایا خاص طور سے جب کہ جابر وظالم حکمراں کے سامنے ہو اور حق نہ کہنے والے کو شیطان قرار دیا، یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہؓ اپنے امراء وعمال کے حق میں بھی رعایت نہیں فرماتے تھے، حضرت عمرؓ کو منبر پر خطبہ کی حالت میں ٹوک دیا، پھر بھرے مجمع میں یوں کہہ دیا کہ اگر آپ نے ٹیڑھا پن اختیار کیا تو تلوار سے سیدھا کردیں گے، ہاں فتنہ کا اندیشہ ہو تو گنجائش عطا کی ہے کہ بعض مرتبہ اظہار حق کسی بڑے فساد کا باعث بن جاتا ہے، اسی آزادی نے اسلامی کتب خانہ کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں وہ وسعت وعظمت عطا کی ہے کہ جس پر آج

عقلیں حیران ہیں اور جسے عہد حاضر کی مغربی ترقیات کی بنیاد بننے کا شرف حاصل ہے۔

۳. سیاسی آزادی یوں کہ حکام کا انتخاب ارباب حل وعقد پر رکھا ہے، ان کی نگرانی اور ان پر تنقید کی اجازت دی ہے، خود خلفاء راشدین بار بار اپنے محاسبہ اور اپنے اوپر تنقید کا اعلان ومطالبہ کرتے تھے، ضرورت کے مطابق، عہدوں اور شعبہ جات کی تعیین خود ہمارے سپرد ہے، ضروریات کو انجام دینے کی صورتیں بھی ہماری صوابدید اور موقع ومحل پر موقوف ہیں۔

۴. تمدنی آزادی یعنی علم وصنعت کی ترقی، رہن سہن اور ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے حق میں وسعت خوب معلوم ہے، اسی لئے تمدن کے ہر شعبے میں خوب کام ہوا اور ہر فرد نے کیا، غلامی اس کے حق میں بہت بڑا مانع بنا کرتی تھی، اسلام نے اس سلسلہ میں اپنے اصول وتعلیمات کے ذریعہ وسعت وسہولت پیدا کی، جنگ میں قید کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ سے غلام بنانے کی اجازت نہیں دی پھر ان کی آزادی کے بہت سے راستے وصورتیں تجویز کیں، اس کی ترغیب دی اس کو بڑا کار خیر بتایا حتیٰ کہ بعض جرموں میں سزا کے طور پر غلاموں کی آزادی کا حکم دیا اور غلام رہتے ہوئے ان کی انسانیت واسلام کے احترام کی سخت تاکید کی اور کسی معاملہ میں فرق وامتیاز کو پسند نہیں کیا، ان کو اپنا بھائی بتایا اور بنایا، اسی سے سمجھئے کہ حضورؐ نے ہجرت کے موقع پر حضرت زیدؓ وحضرت حمزہؓ کو بھائی بھائی قرار دیا اور اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کا نکاح حضرت زیدؓ سے کیا جو کہ غلام تھے۔

اسلام میں عورت کا مقام

انسان نے حد سے تجاوز اور کوتاہی کا دامن کسی میدان میں نہیں چھوڑا، حتیٰ کہ عورت جس کے ساتھ اس کے اہم رشتے اور ہروقت کی رفاقت رہتی ہے: اس کے حق میں بھی وہ اس کا شکار ہوا، "حد سے تجاوز" کا تو کم، "حق کے احترام" میں کوتاہی کا زیادہ، نہ تو کسی قوم نے عورت کو صحیح حق اور واقعی احترام دیا، نہ کسی مذہب نے اس کا لحاظ کیا، اس میں دنیا کی متمدن وغیر متمدن تمام اقوام سب شریک رہی ہیں۔

یونان میں اسے "شیطان کی بیٹی" اور "نجاست کا مجسمہ" سمجھا جاتا تھا، سقراط نے اسے "فساد کی جڑ" افلاطون نے "برے لوگوں کی روح"، ارسطو نے "سبب زوال" اور عام یونانیوں نے اس کے زہر کو "لا علاج" اور اس کے وجود کو "بے ضرورت" بتایا، یہ تو عقلاء یونان کے نظریات وخیالات ہیں، ساری دنیا اسی قسم کے خیالات رکھتی رہی ہے، بیوی بنا کر بیچنے میں دریغ نہیں کیا اور بیٹی ہونے پر بھی زندہ درگور کیا، حتیٰ کہ اس کے انسان و جاندار ہونے میں تردد کیا اور آج بھی متمدن دنیا میں اس کی حیثیت ایک سامان کی سی ہے کہ جہاں چاہو رکھ دو اور سامان عیش کی طرح جہاں جس طرح چاہو اسے استعمال کرو، مساوات کا نعرہ لگا کر مردوں کے دوش بدوش کر کے گھریلو تمام ذمہ داریوں سے اسے باہر نکال کر مزید اس کی فطری عزت وحرمت کو مجروح کر دیا گیا ہے، آج متمدن دنیا میں بلا تکلف وہ قلی ومزدور کے درجے میں رکھی جاتی ہے اور اس کی اس بے حرمتی اور جا و بیجا استعمال کی وجہ سے معاشرتی بحران، صنفی انتشار، جنسی بے قیدی، اخلاقی پستی اور روحانی گراوٹ بھی کچھ پیدا ہو رہے ہیں۔

اسلام نے عورت کے حق میں ہر قسم کی زیادتی وکوتاہی کو ختم کر دیا ہے اور تمام احکام کی

طرح اس کے حکم میں بھی "اعتدال" کو اپنایا ہے، نہ تو بالکل ہی آزاد کر دیا ہے اور نہ ہی قیدی بنا کر رکھا ہے، بلکہ یہ بتایا کہ مرد وعورت عائلی وگھریلو نظام، بلکہ نظام کائنات کے دو پہیے ہیں، نظام عالم کی گاڑی دونوں کے تعاون سے ہی چلے گی، اسے جاندار وانسان، عام مردوں کی طرح حضرت آدمؑ کی اولاد اور تمام مخلوقات کی طرح صرف باقی رہنے یا عام حیوانات کی طرح محض کسی طرح زندگی گذارنے کا نہیں بلکہ پورے حقوق واحترام کے ساتھ دنیا میں رہنے کا حق دیا، بیٹی، بہن، بیوی، ماں ہر اعتبار سے اس کا احترام بتایا، اس کے حقوق متعین کئے، جو چیز اس کی ملکیت میں آئے، اس کا پورا پورا مالک اور اسے استعمال کا مکمل حق دار بنایا، باپ، بھائی، شوہر، بیٹا اور ماں وبہن وبیٹی کی میراث میں اس کا حصہ متعین کیا، ہر طرح کی تعلیم وتربیت کے حاصل کرنے کا مجاز ہی نہیں بلکہ والدین ونگراں کو اس کا ذمہ دار بنایا، اس کی کفالت وپرورش کو خصوصی اجر وثواب کا باعث اور مستحق جنت بنانے والا قرار دیا، ازدواجی تعلقات کو نہ صرف جائز بلکہ مستحب ومسنون اور بعض حالات میں ضروری قرار دیا، اسے صالح معاشرہ کا ایک رکن اعظم قرار دیا اور عورت کو شوہر کے انتخاب کا ہی حق نہیں دیا بلکہ اس کی رضامندی کو ضروری بتایا، مرد پر مہر کی ذمہ داری ڈالی، شادی کے بعد مرد کے ذمہ اس کے حقوق بتائے جن کے مطالبے کا پورا مجاز بنایا، خرچ وگذارے کا پورا پورا ذمہ دار مرد کو قرار دیا، اس کی دیکھ بھال اور حقوق کی ادائیگی کی مردوں کو سخت سے سخت تاکید کی، معاشرتی واجتماعی زندگی کا اولین واہم مرکز خود انسان کا گھر ہوتا ہے جہاں کے نظم ونسق کیلئے مستقل کسی ذمہ دار کی ضرورت ہوتی ہے، عورت کے فطری مزاج اور باہمی تعاون کے ذریعہ کام کرنے کے اصول کے پیش نظر عورت کو گھریلو جملہ انتظامات بچوں کی دیکھ بال، مرد کے مال اور خود اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کا اسے مکمل ذمہ دار بلکہ یوں کہئے کہ "گھر کی ملکہ" قرار دیا اور تعلقات میں اگر اس درجہ بدمزگی پیدا ہو جائے کہ ایک دوسرے کے حقوق ادا نہ ہوسکیں، عورت کو مرد سے طلاق وخلع کے مطالبہ کا حق دیا۔

ساتھ ہی یہ بھی نہیں کہ اس سے متعلق کمزور ونقصان دہ پہلوؤں پر نظر نہ رکھی ہو، سب سے نقصان دہ پہلو مرد کے اس سے قریب ہونے پر شہوت کی آگ کا بھڑکنا اور گناہ کا وجود میں آنا ہے، اس لئے دوسری طرف تو اسے شرم وحیاء کا پتلا بتایا، حیاء کو اس کا شعار قرار دیا، گھر سے باہر نکلنے کو ممنوع وناپسند بتایا، کسی ضرورت سے نکلنا پڑے تو پردے کو ضروری قرار دیا، اجنبی مردوں سے بے ضرورت وبے تکلف گفتگو پر پابندی لگائی اور جہاں تک ممکن ہو ایک کے دوسرے سے قرب واختلاط کو منع کیا، عورت کو شیطان کا جال اور ہمہ وقت شیطان کا اس کی فکر میں رہنا ذکر کیا، چھوٹے دل وچھوٹی عقل کا ہونے کی بناء پر شر وفساد کا ذریعہ اور فتنہ بتایا، شوہر کے قابو میں نہ رہے، اس کے حقوق ادا نہ کرے، احکام شرعی کی ادائگی میں سستی کرے تو تنبیہ کی صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ اسے ضروری قرار دیا، نصیحت کا حکم کیا، نہ مانے تو گھر کے اندر قطع تعلق کا حکم دیا، اس سے بھی فائدہ نہ ہو تو ایک حد تک مارنے کی بھی اجازت دی، پھر بھی عورت نہ سنبھلے تو پسندیدہ تو یہی ہے کہ مرد تعلقات کو نباہتا رہے اور اس کے حقوق ادا کرتا رہے اور زیادہ پیچھے بھی نہ پڑے کہ فطری کمزوریوں کی بنا پر پھر حالات مزید خراب ہوجاتے ہیں، بدرجۂ مجبوری طلاق کے ذریعہ تعلقات زوجیت کو ختم کرنے کی اجازت دی ہے۔

اس کی کمزوریوں کا ہی احساس کرکے اسے محنت مزدوری کا مکلف نہیں بنایا، گھر کے کام کا ذمہ دار بنایا اور اس میں بھی حسب وسعت وموقع خود اور دوسرے ذرائع سے اس کے تعاون کا حکم دیا اور اسے پسندیدہ بتایا اور اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنایا، خرچ کی ساری ذمہ داری مرد ہی پر ڈالی، باپ کرے، پھر شوہر، یہ نہ ہوں تو بھائی وچچا وخاندان کے قریبی مرد رشتہ دار، حتی کہ اس کی ذاتی املاک کو لینے کا بھی حق نہیں دیا۔

حضوؐر نے فرمایا: ''تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں مجھے بہت زیادہ محبوب ہیں''؛ جن میں سے ایک ''عورت'' ہے اسلام نے اسے ہر منصب شرافت وکرامت کا اہل

بتایا ہے حتیٰ کہ ایک تعداد علماء نے نبوت کا مستحق بلکہ بعض نے حضرت حواء، ہاجرہ، والدہ حضرت موسیٰ، آسیہ اور حضرت مریم کو نبی بتایا ہے۔

مملکت کے نظم ونسق میں سربراہ اعلیٰ کے عہدہ پر اس کا ہونا ممنوع وناپسندیدہ قرار دیا ہے، مگر سیاسی آراء کے اظہار کا حق دیا ہے اور بعض نے ناگزیر حالات میں پردہ میں رہ کر ارکان سلطنت کے مشورہ کے ساتھ اجازت دی ہے، ہاں دوسرے ذیلی مناصب پر کام کرنے کا مجاز بنایا ہے، حضرت عمرؓ کے عہد میں بعض عورتیں روک ٹوک کے سلسلہ میں بڑے عہدے پر فائز تھیں، ایک صاحبہ بازار کی نگراں تھیں۔

اسلام کے عطا کردہ حقوق کا نتیجہ ہے کہ مسلمان عورتوں نے عہد نبوی سے لے کر آج تک اور بالخصوص ابتدائی عہد میں جب کہ احکام کی پابندی کا مزاج بھی زیادہ تھا، جس کردار کا ثبوت دیا اس کی کوئی قوم نظیر نہیں رکھتی، ازواج مطہرات کے حالات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اور اب صحابیات کے کارنامے ملاحظہ فرما کر اس کا اندازہ لگایئے۔

حضرات صحابیات

جہاں تک حضرات صحابیات کے تفصیلی حالات کا سوال ہے تو آپ ازواج مطہرات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزدیوں کے حالات پڑھ چکے ہیں اور وہ بھی صحابیات میں سے ہیں، ان کے حالات سے اندازہ لگا سکتے ہیں، ان کی سیرت و کردار کا، یہاں تو انسانی زندگی سے متعلق مختلف میدانوں میں جو کارنامے انہوں نے انجام دیئے ان کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

جنگ و جہاد:

عربوں کی عام عادت تھی کہ عورتوں کو میدان جنگ میں لے جاتے تھے جو عموماً خیموں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور موقع پڑنے پر جنگ میں بھی حصہ لیتی تھیں، صحابیات کو اس میں خاص امتیاز حاصل ہے، تقریباً تمام اہم غزوات اور جنگوں میں ان کی شرکت رہی اور انہوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے، غزوۂ احد میں کفار کے پلٹ کر حملہ کر دینے کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے والے جاں نثار صحابہ میں حضرت ام عمارہ پیش پیش تھیں، تیر و تلوار سے کفار کے حملوں کو روکتیں، بعض کافروں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے کندھے پر گہرا زخم کھایا، یہی جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے بالمقابل جوانمردی سے لڑیں، بارہ زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا، احد میں حضرت اسماءؓ کو حضورؐ نے ہر طرف تلوار چلاتے دیکھا، حضرت صفیہؓ نے خندق کے موقع پر ایک یہودی کو قتل کیا۔

جنگ یرموک جو حضرت عمرؓ کے عہد کی نہایت اہم جنگ تھی، اس میں مختلف صحابیات نے باقاعدہ حصہ لیا، خاص طور سے حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ، حضرت ام ابان نے خیمہ کی لکڑیوں سے بہت سے رومیوں کو قتل کیا، جہاد کیلئے دور دراز اور پر مشقت سفر کیا، حضرت ام

حرامؓ پہلے بحری لشکر میں شریک تھیں، یہ تو خاص کارنامے تھے، ورنہ عموماً دوسرے امدادی کام کرتی تھیں، پانی پلانا، زخمیوں کی مرہم پٹی، مقتولوں اور زخمیوں کو میدان جنگ سے اٹھانا، تیر دینا، کھانے کا نظم کرنا، قبر کھودنا، فوج کی ہمت بندھائے رکھنا، یہ کام عام صحابیات بھی کرتی تھیں اور ازواج مطہرات بھی، اسلام کیلئے سب سے پہلے جاں نثاری و شہادت کا شرف اسی صنف کو حاصل ہے، حضرت عمارؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ کو مکہ مکرمہ میں ابوجہل نے نہایت بیدردی سے قتل کر دیا تھا، حبش کی ہجرت کے دونوں سفروں میں ان کی شرکت رہی۔

تبلیغ و اشاعت اسلام:

یوں تو تبلیغ کا بہت بڑا ذریعہ جہاد ہی ہے، مگر صحابیات نے براہ راست بھی یہ کام کیا ہے، حضرت عمرؓ اپنی بہن حضرت فاطمہؓ کی دعوت پر ہی مسلمان ہوئے، حضرت ام سلیمؓ کی دعوت پر ان کے شوہر حضرت ابوطلحہؓ نے اسلام قبول کیا، حضرت عکرمہ بن ابوجہل اپنی بیوی ام حکیمؓ کے سمجھانے سے مسلمان ہوئے، حضرت ام شریک دوسیہؓ کی دعوت پر متعدد قریشی عورتیں اسلام میں داخل ہوئیں۔

سیاسی کارنامے:

حضرت شفاء بنت عبداللہ اس درجہ صائب الرائے تھیں کہ حضرت عمرؓ ان کی تحسین کرتے اور ان سے مشورہ لیتے، حتیٰ کہ بسا اوقات بازار کا انتظام ان کے سپرد کر دیا جاتا۔

اسلام نے اس باب میں عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے دشمن کو پناہ دے سکتی ہے، حضرت ابوالعاصؓ جب دوسری مرتبہ گرفتار ہو کر آئے تو حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی، فتح مکہ کے موقع پر حضرت ام ہانیؓ نے ایک مشرک عزیز کو پناہ دی۔

علمی کارنامے:

اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں تو ان کی خصوصی شرکت رہی ہے، بعض کو اس میں بڑا

امتیاز تھا، ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن نیز حضرت ام ورقہؓ پورے قرآن کی حافظ تھیں اور مختلف حصوں کی تو بہت سی صحابیات حافظ تھیں، حضرت ام سعدؓ قرآن مجید کا درس دیا کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ کو تفسیر میں خاص کمال تھا، احادیث کی روایت تو بہت سی صحابیات نے کی ہے، جن میں سرفہرست حضرت عائشہؓ اور دوسرے نمبر پر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا نام ہے، ام عطیہ، اسماء بنت ابی بکر، ام ہانی اور فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہن نے بھی بڑی تعداد میں روایت کی ہے، افتاء کا کام بھی کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ کے فتاویٰ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، حضرت ام سلمہؓ کے فتاویٰ کے مجموعہ سے ایک رسالہ تیار ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ دیگر ازواج مطہرات اور ممتاز صحابیات سے بڑی تعداد میں فتاویٰ منقول ہیں، حضرت عائشہؓ کو فرائض یعنی میراث کے مسائل سے بھی خصوصی واقفیت تھی، بڑے بڑے صحابہ ان سے فرائض کے مسائل حل کرتے تھے، حتیٰ کہ صحابیات کی ایک تعداد کا مجتہدین میں شمار کیا گیا ہے، جن میں حضرات امہات المومنین اور حضرت فاطمہ، اسماء، فاطمہ بنت قیس وغیرہ ہیں، حضرت ام سلمہ کو اسرار سے بڑی واقفیت تھی، حضرات عائشہ وحفصہ ورمیصاء، اَم عمارہ وفاطمہ وغیرہ کئی علوم کی جامع تھیں۔

دوسرے علوم وفنون میں بھی ان کو امتیاز حاصل تھا، حضرت اسماء بنت قیس خواب کی تعبیر میں مشہور تھیں، متعدد صحابیات کو طب اور جراحی میں مہارت حاصل تھی، حضرت عائشہ واسماء بنت سکن کا خطابت میں خاص شہرہ تھا، شاعری تو عربوں کا خاص ملکہ وپیشہ تھا، صحابیات بھی اس میں پیچھے نہ تھیں، ایک اچھی خاصی تعداد اُس سے تعلق وشہرت رکھتی تھی، حضرت خنساء، صفیہ، عاتکہ، زینب بنت عوام، ام ایمن، کبشہ بنت رافع وغیرہ، بالخصوص حضرت خنساء تو بے مثال شاعرہ اور بے نظیر مرثیہ گوگذری ہیں، ان کا دیوان شائع ہوچکا ہے اور دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوچکا ہے، حضرت عائشہؓ کو بھی شاعری سے

تعلق تھا اور اشعار عرب سے تو بہت واقف تھیں۔

دستکاری:

دستکاری کے بھی علوم وفنون میں ان کو مہارت تھی، بہت سی صحابیات اپنے گھر کی ضرورت بھر کپڑا خود بن لیا کرتی تھیں، کاشتکاری کا کام بھی کرتی تھیں، اچھی خاصی تعداد لکھنا جانتی تھی، بعض صحابیات تجارت بھی کرتی تھیں؛ حضرت سودہ کھالوں کا کام کیا کرتی تھیں۔

عملی زندگی:

مذکورہ بالا حالات سے ان کی عملی زندگی کا اندازہ لگا لیجئے کہ اس میں وہ کتنی آگے رہی ہوں گی؟ جب کہ انہیں ساری دنیا کے لئے نمونہ بننا تھا!!

نماز، روزہ، زہد وتقویٰ، جود وسخا کا کیا پوچھنا، ان چیزوں میں حضرات صحابہ سے ہرگز پیچھے نہ تھیں، رضی اللہ عنہن وعن سائر الصحابۃ۔

اسلامی قوانین کی بنیادیں

یہ تو ظاہر ہے کہ قوانین کے بغیر کوئی معاشرہ یا جماعت باہمی اتفاق واتحاد کے ساتھ گذر نہیں کر سکتے، اسی لئے ہر دور میں انسان کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جہاں کہیں جماعت کی صورت میں زندگی گذارنے کو اپنایا ہے؛ پوری جماعت کو نظم واتحاد میں رکھنے کیلئے اپنا ایک سردار وذمہ دار اور چند قوانین ضرور بنائے ہیں اور چوں کہ ان قوانین پر عمل عادت ومزاج کے بغیر نہیں ہوسکتا اس لئے صرف اجتماعی حالات ومعاملات سے متعلق ہی قوانین نہیں بنائے جاتے بلکہ انفرادی حالات اور ذاتی معاملات میں بھی اپنے آپ کو نظم وضبط کا پابند بنا کر اس کا عادی بنایا جاتا ہے اور تجربہ یہ ہے کہ جو انسان اپنی انفرادی زندگی اور ذاتی معاملات میں نظم وضبط کا جتنا زیادہ پابند ہوتا ہے؛ وہ اجتماعیت ومعاشرہ کے قوانین پر عمل میں بھی آگے وکامیاب رہتا ہے۔

بہرحال یہی وہ چیز ہے جس کیلئے قبیلہ وقوم کے سردار چنے جاتے ہیں، گاؤں میں پردھان اور چوپال بنتی ہے، شہروں میں میونسپل بورڈ اور صوبوں میں اسمبلی وزارت قائم ہوتی ہے، ملکوں میں پارلیمنٹ اور حکومت بنتی ہے اور ان سے تعلق رکھنے والے اپنے ذاتی و انفرادی حالات میں بھی خود کو نظم وضبط کا پابند رکھتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی قانون کی بنیاد جتنی زیادہ مضبوط ہوگی وہ اتنا ہی پائیدار ومفید ہوگا، یہی وجہ ہے کہ جس قانون کے بنانے میں جتنی زیادہ عقلیں، مشورے اور غور وخوض شامل ہوتا ہے وہ مفید تر ہوتا ہے اور بسا اوقات صدیاں گذر جاتی ہیں اور اس میں کسی ترمیم و تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی، پھر بھی چونکہ ان قوانین کی بنیاد انسانی عقل وتجربہ اور حالات پر ہوتی ہے اور عقلیں یکساں نہیں، تجربے مختلف، حالات بدلتے رہتے ہیں، اس

لئے ہر زمانے میں اس کا تسلیم کیا جانا اور ہر زمانے کیلئے اس کا مفید ہونا ضروری نہیں، کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ترمیم پر مجبور ہونا ہی پڑتا ہے۔

اسلام صرف چند عبادتوں کے مجموعہ کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک ابدی نظام زندگی اور دائمی دستور حیات ہے، اس نے پیدائش سے لے کر وفات، مہد سے لے کر لحد تک کے احکامات اپنے ماننے والوں کو سکھائے ہیں اور انفرادیت واجتماعیت دونوں کے مناسب قوانین امت کے سامنے رکھے ہیں اور چونکہ اپنے ظہور کے وقت سے لے کر قیامت کے آنے تک کیلئے اس کو پیش کیا گیا ہے، خواہ یہ مدت دسیوں صدیوں کی ہو یا سیکڑوں صدیوں کی، یا اور بھی زائد، لہٰذا اس کے قوانین کی بنیادوں کا پختہ سے پختہ تر ہونا ضروری ہے۔

اس لئے اسلام نے قانون سازی کے نظام کو اپنے پیروکاروں کے ہاتھ میں نہیں دیا ہے کہ جو چاہیں، جیسے چاہیں قوانین بنالیں؛ بلکہ قوانین کا ایک حصہ تو من وعن پورا کا پورا اپنی طرف سے تعلیم کیا ہے اور جو حصہ اس سے رہ گیا ہے اس کے طے کرنے کیلئے بھی ایسے حدود متعین کردیئے ہیں کہ ان سے باہر جانا کسی طرح جائز نہیں، نیز غیر مذکور قوانین کو جاننے کیلئے بیان کئے ہوئے قوانین کا سامنے رکھنا ضروری قرار دیا ہے اور جو قانون ان حدود اور مذکورہ احکام کی رعایت کے بغیر وضع کیا جائے، اسے شرعاً غیر معتبر اور غیر لائق عمل قرار دیا ہے، شریعت نے اپنے قوانین کے سلسلہ میں اصلاً چار چیزوں کو بنیاد قرار دیا ہے، قرآن مجید، سنت رسول، اجماع امت، قیاس، ان میں بھی پہلے دو اصل سرچشمہ ہیں، باقی دو کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ان کی بنیاد پہلے دو میں سے کسی پر ہو۔

۱. قرآن مجید سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس وقت سے آج تک برابر اس کی نقل اور اس کا پڑھنا، پڑھانا جاری ہے۔

۲. سنت سے اصل میں تو حضورؐ کے اقوال وافعال مراد ہوتے ہیں اور وہ کام جو آپؐ کے

سامنے کئے گئے یا آپؐ کے علم آئے ولائے گئے اور آپؐ نے ان کے متعلق کچھ نہیں فرمایا اور اسی کے ضمن میں حضرات صحابہؓ کے اقوال وافعال اور ان کے سامنے یا علم میں لائے جانے والے حالات ومعاملات شمار ہوتے ہیں، جن سے اس وقت استدلال کیا جاتا ہے جب کہ حضورؐ سے کوئی چیز نہ ملے، سنت کو حدیث بھی کہتے ہیں۔

۳۔ اجماع امت ایک زمانہ کے تمام مجتہد علماء کا کسی ایک رائے پر اتفاق کر لینا بشرطیکہ یہ اتفاق قرآن وحدیث کے مخالف نہ ہو بلکہ ان ہی سے ثابت کسی حکم کے مطابق ہو۔

۴۔ قیاس یعنی کسی معاملہ میں قرآن وحدیث یا اجماع کی رو سے کسی حکم کے ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس کا حکم تلاش کرنا جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کتاب و سنت میں مذکور کسی حکم سے اس کی مناسبت تلاش کی جائے اس معنی کر کہ کتاب و سنت میں مذکور حکم کی علت جس چیز کو قرار دیا گیا ہو وہ اس میں بھی تلاش کی جائے تحقیق سے ثابت ہو جانے پر وہی حکم اس کو دے دیا جائے جیسے کتاب وسنت سے شراب کا حرام ہونا ثابت ہے اور شراب کے علاوہ بھی بعض چیزیں نشہ پیدا کرتی ہیں تو نشہ کی وجہ سے وہ بھی حرام قرار پائیں۔

ان چاروں کے ذریعہ کسی حکم کے جاننے اور کسی قانون کو بنانے کیلئے سب سے پہلے قرآن مجید کو دیکھا جائے گا، پھر حدیث رسول کو اور اس کے بعد اجماع اور سب سے آخر میں قیاس سے کام لیا جائے گا۔

قرآن وحدیث میں جو حکم مذکور ہو نہ تو اسے چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی بدلا جا سکتا ہے، یہی حال اجماع کا ہے، البتہ قیاس سے جو حکم ثابت ہو اس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور حالات کے اعتبار سے تبدیلی ہو سکتی ہے، اس لئے کہ اس میں عقل انسانی کا دخل ہو جانے کی بناء پر پختگی و پائیداری کی شان نہیں پیدا ہوتی۔

ان میں سے ہر ایک کے ذریعہ قوانین کے جاننے و بنانے کیلئے فقہاء نے بہت سے

اصول وقواعد وضع کئے ہیں، انہیں کی روشنی میں کام کیا جاتا ہے اور فقہی مسائل کے سلسلہ میں آپس میں جو اختلاف ہے وہ انہیں احکام کے حق میں ہے جن میں قیاس اور انسانی غور وفکر کا دخل ہے اور جو احکام کتاب وسنت سے صراحت کے ساتھ یا اجماع سے ثابت ہیں وہ اختلاف سے خالی و پاک ہیں۔

بیت اللہ

یوں تو ہر وہ مقام اور زمین کا ہر وہ خطہ افضل اور لائق احترام ہے جہاں پر دین کا کوئی کام انجام دیا جاتا ہو، بقول شاعر ؎

رشک کرتا ہے فلک ایسی زمیں پر اسعدؔ
جس پر دو چار گھڑی ذکر خدا ہوتا ہے

اس لئے مسجد، مدرسہ، خانقاہ سب محترم ہیں اور مساجد خاص طور سے اور ان میں بھی جامع مسجد کہ اس میں ایک نماز کا ثواب پانچ سو نمازوں کے برابر ملتا ہے، البتہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا بنانا انسان کے ہاتھ میں ہے، جہاں چاہے، جب چاہے بنا کر اجر وثواب حاصل کرے، لیکن کچھ مقامات ایسے ہیں کہ ان کی فضیلت اللہ نے ایسی متعین فرمائی ہے کہ کوئی دوسرا مقام ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، بیت اللہ ومسجد حرام، مسجد نبوی، بیت المقدس ومسجد اقصی۔

بیت اللہ: (جسے کعبہ بھی کہتے ہیں) مکہ مکرمہ میں واقع مسجد حرام کے حدود میں چوکور عمارت کا نام ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق زمین کا بننا اسی شہر بلکہ اسی مقام سے ہوا اور زمین کے بننے پر اولین تعمیر اس گھر کی ہوئی، جو اس وقت سے آج تک قائم ومحترم اور اس عرصہ میں متعدد مرتبہ اس کی تعمیر ہوئی، ۱-تعمیر ملائکہ؛ پیدائش آدم سے دو ہزار سال پہلے، ۲-تعمیر آدم؛ پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے: لبنان، طور سینا، طور زیتا، جودی، حراء، ۳-تعمیر شیث بن آدم؛ مٹی اور پتھر سے، ۴-تعمیر ابراہیمؑ واسماعیلؑ، ۵-تعمیر عمالقہ، ۶-تعمیر قبیلہ جرہم، ۷-تعمیر قصی بن کلاب، ۸-تعمیر عبدالمطلب، ۹-تعمیر قریش در ۳۵ سنہ ولادت نبوی، ۱۰-تعمیر عبداللہ بن زبیر ۶۵ ہجری میں، ۱۱-تعمیر حجاج ۷۳ سنہ ھ، ۱۲-

سلطان احمد ترکی ۱۰۲۱ سنہ ھ، ۱۳-تعمیر سلطان مراد خان ترکی ۱۰۴۰ سنہ ھ، ۱۴-تعمیر سلطان ابن سعود ۱۳۷۷ سنہ ھ، حضرت ابرہیمؑ نے اس کا طول ۳۲ ہاتھ، عرض ۲۲ ہاتھ اور اونچائی ۹ ہاتھ رکھی تھی، چھت نہیں تھی، زمین سے ملے بغیر کواڑ کے دو دروازے تھے، قصی نے کچھ جدت اختیار کی؛ چھت لگوائی، قریش نے رقبہ میں کچھ فرق کیا، رقم کی کمی کی وجہ سے لمبائی کچھ کم کردی، اونچائی اٹھارہ ہاتھ، اندر چھ ستونوں پر چھت، پرنالہ، اندر ایک زینہ، بہت اونچی کرسی پر ایک دروازہ لگایا، شمالی مشرقی کونے میں حجر اسود نصب تھا اسی جگہ نصب کیا، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے اونچائی ۲۷ ہاتھ اور دیواریں دو ہاتھ چوڑی اور جو حصہ قریش نے چھوڑا تھا اس کو تعمیر میں شامل کردیا، پرانا دروازہ زمین کے برابر اور جانب مغرب ایک دروازے کا اضافہ کیا، حجاج نے چھوٹا ہو حصہ پھر باہر کردیا اور دروازہ ایک اونچی کرسی کا جس کی اونچائی سوا دو میٹر ہے، اس لئے کہ اس نے اندر کا فرش پٹوا کر اونچا کردیا تھا، اس کے بعد سے عمارت کے رقبہ اور اصل صورت میں فرق نہیں کیا گیا۔

بعد کے حضرات نے کچھ حصہ منہدم ہونے یا شگاف پڑنے پر مرمت واصلاح کا کام کرایا، بیت اللہ کے اردگرد جو مسجد ہے وہ ''مسجد حرام'' کہلاتی ہے، اس کے اردگرد اس قسم کا حصہ ہر عہد میں رہا اور زمانۂ اسلام سے اس کو ''مسجد حرام'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا قدیم رقبہ تیس ہزار میٹر مربع تھا اور اب تقریباً ڈیڑھ لاکھ میٹر اور موجودہ عمارت تین منزلہ ایک زمین دوز اور دو اوپر، بیت اللہ کے چاروں طرف گول صحن ہے جسے ''مطاف'' (طواف کرنے کی جگہ) کہتے ہیں، اس لئے کہ حاجی اس حصہ میں بیت اللہ کے چاروں طرف سات چکر لگاتا ہے، مطاف کے بعد چاروں طرف ہر جانب آگے پیچھے کئی کئی بڑے بڑے دالان ہیں، ایک ترکی تعمیر کے ایک منزلہ قبوں والے، دوسرے سعودی تعمیر کے دو منزلہ، تہہ خانے میں ضروریات کی دوسری چیزیں بھی ہیں، سہولت کیلئے مسجد کے بیس کے قریب دروازے ہیں، عہد خلفاء راشدین سے لے کر اب تک اس کی چھ سات مرتبہ توسیع وتعمیر

ہوئی ہے اور تعمیر و توسیع کا سلسلہ حسب موقع برابر جاری ہے۔

حج سے متعلق دوسری اہم چیزوں میں ''حجر اسود'' ہے، جو کعبہ کے شمالی مشرقی گوشہ میں لگا ہے، طواف کے ہر چکر میں اگر ممکن ہو تو اس کو چھو کر ورنہ اشارہ کر کے ہاتھ کو چومنے کا حکم ہے، اسی کے قریب بیت اللہ کا دروازہ ہے جس پر سونے و چاندی کی منقش چادریں چڑھی ہیں، دروازے و حجر اسود کے درمیان جو دیوار کا حصہ تقریباً ڈھائی میٹر لمبا ہے، اسے ''ملتزم'' کہتے ہیں، اس سے لپٹ کر دعا کرنے کا حکم اور اس دعا کی قبولیت کی بشارت ہے، کعبہ کی شمالی دیوار کے سامنے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کے بالمقابل نصف دائرہ کی صورت میں ایک دیوار ہے جسے ''حطیم'' کہتے ہیں، یہ حصہ اصلاً بیت اللہ میں تھا، قریش نے باہر رہنے دیا، اسی لئے طواف اس کے باہر سے کیا جاتا ہے، اس تک فرش کا حصہ بیت اللہ کے ہی حکم میں ہے، بیت اللہ کے قریب ایک ستون پر ''مقام ابراہیم'' نامی پتھر رکھا ہوا ہے، یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کی تھی، اب تک اس پر ان کے پیروں کے نشانات ہیں، اس کے پاس نماز پڑھنا مستحب ہے، مشرقی جانب مشہور پانی بلکہ دنیا کے سب سے افضل اور مفید و بابرکت پانی کا کنواں ہے جسے ''چاہ زمزم'' کہتے ہیں، جس میں بڑے روحانی و جسمانی فوائد ہیں، مشرقی جانب مسجد حرام کے کنارے ''مسعیٰ'' ہے یعنی صفا و مروہ دو پہاڑوں کے درمیان کا حصہ و راستہ ہے جس پر دوڑنے کا حکم ہے، حج سے متعلق شہر سے باہر کے مقامات میں تقریباً ۲۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ''عرفات'' ہے، نو ذی الحجہ کو ظہر و عصر سے فارغ ہو کر یہاں کھڑے ہو کر دعا کا حکم ہے، پھر ''مزدلفہ'' جاتے ہیں، جو مکہ کے راستے میں پڑتا ہے، رات کو یہاں رہ کر علی الصباح ''منیٰ'' جانے کا حکم ہے، جو مکہ سے بہت تھوڑے فاصلہ پر ہے، بقیہ زمانہ حاجی یہیں گذارتے ہیں، اسی میدان میں قربانی کی جاتی ہے، مکہ کے مشرق میں ''جبل ثور'' میں ''غار ثور'' واقع ہے، جہاں حضورؐ نے بوقت ہجرت پناہ لی تھی اور شمالی جانب ''جبل نور'' ہے، جس میں ''غار حراء'' ہے یعنی وہ غار

جس میں حضورؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

مزید یہ کہ بیت اللہ کے چاروں طرف دسیوں میل کا علاقہ ''حرم'' کہلاتا ہے اور باقی سرزمین و حصہ ''حل'' کہا جاتا ہے، چاروں طرف جس جگہ سے ''حرم'' کا علاقہ شروع ہوتا ہے اسے ''میقات'' کہتے ہیں، حاجی کیلئے اس کی اجازت نہیں کہ ''احرام'' کے بغیر اس سے آگے بڑھے، ''احرام'' وہ دو چادریں کہلاتی ہیں جنہیں پہن کر حج کے اعمال ادا کئے جاتے ہیں، ایک بطور لنگی کے اور ایک مخصوص طریقے سے چادر کے طور پر مرد حاجی حج کیلئے کسی سلے کپڑے کا استعمال نہیں کرسکتا۔

بیت اللہ کا احترام اس کے نام سے ظاہر ہے اور اس سے کہ محض اس کے احترام میں چاروں طرف دسیوں میل کا علاقہ محترم ہے؛ جس میں کوئی شکار نہیں کیا جاسکتا؛ بجز ایک گھاس کے کوئی درخت نہیں کاٹا جاسکتا؛ کسی پناہ لینے والے مجرم کو سزا نہیں دی جاسکتی، مسجد حرام میں ادا کی جانے والی ہر نماز ایک لاکھ نماز کا ثواب رکھتی ہے اور ہر نیکی ایک لاکھ نیکی کا، ایسے ہی گناہوں کی اہمیت بھی بہت ہے۔

جب انسان نہیں تھے تو فرشتے ہی اس کا طواف کیا کرتے تھے، جب سے انسان پیدا ہوئے ان کو اس کی عظمت کا حکم دیا گیا، انبیاء جہاں کہیں رہے ہوں وہ سفر کر کے وہاں جاتے رہے، نیز مسلمان جہاں کہیں رہے ہوں اکثر زمانوں میں نماز کا قبلہ اسی کو قرار دیا گیا، ہماری نمازوں کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان اسی کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اسی کے احترام میں حج جیسی عبادت کی ادائیگی کے لئے ہزاروں میل طے کر کے ہزاروں صعوبتیں برداشت کر کے ایک طویل عرصہ کیلئے کاروبار و اہل و عیال سب کو ترک کر کے مکہ مکرمہ کا سفر کیا جاتا ہے۔

مسجد نبوی

مکہ مکرمہ: حرم الٰہی ہے اور مدینہ منورہ: حرم نبوی ہے، مسجد نبوی مدینہ منورہ کی وہ مسجد کہلاتی ہے جو اسلام کی دوسری مسجد ہے، پہلی مسجد مدینہ کے مضافاتی علاقہ ''قباء'' میں بنائی گئی تھی، مسجد نبوی کی بنیاد ۱ سنہ ھ میں رکھی گئی، اس کے بعد پھر برابر اس کی توسیع و تعمیر ہوتی رہی، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں ۷ سنہ ھ میں توسیع کی، پھر حضرت عمرؓ و عثمانؓ نے کی، اموی و عباسی خلفاء نے کی اور بعد کے سلاطین بھی کرتے رہے اور یہ سلسلہ آج بھی برابر جاری ہے، پہلی تعمیر میں مسجد کا رقبہ طول میں ۹۰ فٹ، چوڑائی میں ۱۰۵ فٹ، بلندی تقریباً ۱۰ فٹ، دیوار کی موٹائی ½۱ فٹ، چھت کھجور کے پتوں کی، فرش کچا اور تین دروازے تھے اور آج نہایت پختہ و مضبوط عمارت ہے، کئی دروازے ہیں، اسی اسی گز بلند پانچ مینار ہیں اور مسجد کا رقبہ اب لاکھوں میٹر مربع ہوتا ہے، اس مسجد کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تعمیر میں صحابہؓ کے ساتھ خود حضورؐ نے بھی بنفس نفیس حصہ لیا، عہد نبوی کی محراب کی جگہ ''محراب النبی'' کے نام سے آج بھی ممتاز ہے، اس کے قریب ایک خوبصورت سا منبر ہے، اس منبر اور حضورؐ کے روضۂ پاک کے درمیان کا حصہ ''روضۂ جنت'' (جنت کی کیاری) کہلاتا ہے، اس لئے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ یہ قطعۂ زمین جنت کا ایک حصہ و ٹکڑا ہے، اُس کیاری کے اندر چند ستون ہیں؛ جن کی مختلف وجوہ سے اہمیت ہے، مسجد نبوی کے چاروں طرف دالان ہیں، یعنی مسجد کے چھت دار اور صحن والے حصہ کے علاوہ، روضۂ جنت سے متصل بائیں جانب بجانب قبلہ دالان کی ایک جانب زمین کا وہ خوش بخت ٹکڑا ہے جس میں حضورؐ کا جسد اطہر رکھا ہوا ہے، یعنی حضور اکرم ﷺ کا روضۂ مبارکہ ہے جو ایک کمرے کی صورت میں ہے، چھت پر ایک سبز گنبد ہے جس سے ہر مسلمان واقف ہے اور اس سے

متصل مسجد کا پانچواں مینار ہے، کمرے کی لمبائی ½۵۳ فٹ اور چوڑائی ۵۰ فٹ ہے، کمرے میں چار دروازے ہیں، یہ اصلاً حضرت عائشہؓ کا حجرہ تھا، اخیر دنوں میں حضورؐ کا قیام اسی میں تھا اور اسی میں وفات ہوئی، آپؐ کے ارشاد کے مطابق اسی میں آپؐ کو دفن کیا گیا، بعد میں پیر کی طرف ذرا پیچھے کو ہٹ کر حضرت ابوبکرؓ کو اور ان سے ذرا ہٹ کر حضرت عمرؓ کو دفن کیا گیا، حاجی کیلئے حضورؐ کی محبت اور عظمت کا تقاضا ہے کہ روضۂ مبارکہ پر صلوٰۃ و سلام پیش کرے، حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میرے روضہ پر آکر صلوٰۃ و سلام کرنے والے کے سلام کو میں خود سنتا ہوں اور اگر کہیں کسی دوسری جگہ پڑھتا ہے تو اللہ کی جانب سے فرشتے متعین ہیں جو مجھ تک پہنچاتے ہیں، حضورؐ کی قیام گاہ ہونے کی وجہ سے اس کا چپہ چپہ لائق احترام ہے، گناہ و معصیت کی اہمیت یہاں بھی زیادہ ہے اور مسجد نبوی کی ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نماز اور بعض روایات میں ایک ہزار نمازوں کے برابر بتایا گیا ہے۔

بیت المقدس

"بیت المقدس" مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں؛ سب کے نزدیک ایک مقدس مقام ہے، یہ فلسطین کے مشہور شہر "یروشلم" میں ہے، اہل کتاب اس کو "ہیکل سلیمانی" کا نام دیتے ہیں، قرآن مجید میں اسے "مسجد اقصیٰ" کا عنوان دیا گیا ہے، بعض کتابوں میں اس کیلئے "مسجد الصخرہ" کا نام بھی آیا ہے، عام طور سے مسلمان اسے "بیت المقدس" کہتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ دنیا کا تیسرا مقدس ترین مقام ہے، بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء کی عبادت گاہ اور نمازوں کا قبلہ ہونے کا اسے شرف حاصل رہا ہے، ہجرت کے ابتدائی چند مہینوں تک مسلمانوں کا بھی قبلہ رہا، پھر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا ــــ یوں تو ممالک عرب کے جس خطے میں یہ واقع ہے وہ پورا خطہ ہی دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے بابرکت ہے؛ باغات، دریاؤں اور سبزہ و پھلوں کا علاقہ ہے اور بنواسرائیل نیز ان کے اکثر انبیاء کا وطن و مسکن رہا ہے، اکثر کی قبریں اسی علاقے میں ہیں، اسی لئے معراج کے موقع پر حضورؐ کو اس خطے میں لے جایا گیا اور آپؐ نے بیت المقدس میں تمام انبیاء عالم کی امامت فرمائی، پھر آگے کا سفر شروع ہوا، مگر بیت المقدس کو خصوصی شرف و تقدس حاصل ہے۔

مشہور تو یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اسے بنواسرائیل کے لئے ایک عظیم الشان عبادت گاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا، لیکن بعض احادیث میں مذکور ہے کہ: "بیت اللہ کی طرح اس کو بھی انسانوں کی پیدائش سے بہت پہلے تعمیر بیت اللہ کے چالیس سال کے بعد فرشتوں نے بنایا"، نیز جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ بیت اللہ کی عمارت کی تجدید کی، دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاقؑ کے ساتھ اس کی تعمیر کی،

ویسے تفصیلات حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کی ہی محفوظ ہیں، جس کو یہودیوں پر حملہ آور قوموں بلکہ خود یہودیوں کی بدست کئی مرتبہ بے حرمتی اور ویرانی کا سامنا کرنا پڑا، ایک ایک پتھر اکھاڑ دیا گیا، پوری عمارت کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا، حتیٰ کہ ایک مرتبہ تقریباً چھ سو سال کے عرصہ تک بجز اس کی بنیادوں کے کچھ نہیں رہا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، پھر پانچویں صدی ہجری میں نوے سال کے عرصہ تک عیسائیوں کے قبضہ میں رہا، پھر اسے صلاح الدین ایوبی نے فتح کیا، حتیٰ کہ پچھلے برسوں صدیوں کے بعد یہودیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

حضرت سلیمانؑ نے اس کی عمارت نہایت عظیم الشان اور وسیع بنائی تھی، جس میں بکثرت سونے کو استعمال کیا گیا تھا، عمارت دو منزلہ تھی پھر دوبارہ اسی انداز پر حضرت عزیرؑ کے عہد میں اس کی تعمیر ہوئی، سہ بارہ حضرت عمرؓ نے اور اس کے بعد بعض مسلمان سلاطین نے بھی اس کی تعمیر کا کام کرایا، مثلاً ولید بن عبدالملک اور سلطان سلیمان عثمانی، حضرت عمرؓ کے بعد جن لوگوں نے اس کو تعمیر کرایا انہوں نے حضرت عمرؓ کی تعمیر کا خیال رکھا، اصل عمارت کے اردگرد کا احاطہ "حرم شریف" کے نام سے معروف ہے، اس کی لمبائی ایک ہزار چار سو نناوے فٹ ہے اور عرض نو سو پچانوے فٹ ہے، اس کے اندر مختلف قسم کے درخت لگے ہیں، احاطہ کے درمیان سنگ مرمر کا بارہ چودہ فٹ اونچا ایک چبوترہ ہے جو در اصل مسجد کی کرسی ہے، اس کا رقبہ چار سو پچاس فٹ مربع ہے، اس کے چاروں طرف کشادہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، جن پر خوشنما محرابیں بنی ہوئی ہیں، چبوترہ کے اردگرد مسجد کی ضروریات سے متعلق کمرے ہیں، چبوترے پر مسجد ہے، جو تین منزلہ ہے، ایک منزل تہ خانہ ہے، جس کا راستہ مسجد کے اندر سے ہے، دو منزلیں مسجد کی ہیں، پہلی منزل سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے اور دوسری منزل کی دیوار رنگین لکڑیوں سے بنی ہے، پہلی منزل میں کھڑکیاں نہیں ہیں اور دوسری میں ہر جانب کئی کئی کھڑکیاں ہیں، دوسری منزل کی چہار جانب قرآن کی آیات نقش

ہیں، ہر چہار جانب کی پیمائش ۶۰ فٹ ہے اور ہر جانب ایک دروازہ ہے، ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، دوسری منزل کے اوپر ایک عظیم الشان گنبد بنا ہوا ہے، جس کا قطر چالیس فٹ اور بلندی ۹۰ فٹ ہے، مسجد میں متعدد تبرکات بتائے جاتے ہیں، سب سے خاص چیز ''الصخرۃ'' نام پتھر ہے، جس کی وجہ سے اس کو ''مسجد الصخرۃ'' کہتے ہیں، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آسمان سے گرا تھا، شہر یروشلم سے چار میل دور ''بیت اللحم'' ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے اور ۲۰ میل دور شہر ''خلیل''، جس کے غاروں میں حضرات ابراہیم واسحاق ویعقوب علیہم السلام کی قبریں ہیں اور ایک اہم چیز دیوار گریہ بھی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تورات کا اصل نسخہ اس کے نیچے محفوظ تھا اور وہیں سے وہ ضائع ہو گیا۔

کائنات ونظام کائنات

آج کی دنیا میں اس مسئلہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ آخر یہ وسیع وعریض کائنات کس طرح وجود میں آئی اور اس میں قائم نظام کن بنیادوں پر جاری ہے، قرآن وحدیث میں اگرچہ اس پورے نظام کے ایک ایک جزء کی مکمل تفصیل جس طرح اہل سائنس بیان کیا کرتے ہیں مذکور نہیں ہے، لیکن مسائل کے بیان کرنے میں قرآن کا جو عام طریقہ ہے کہ اصولی واہم چیزوں کو ذکر کیا کرتا ہے اور جزئیات کو کم سے کم لیتا ہے، اس کے مطابق بہت کچھ اصولی معلومات قرآن میں موجود ہیں اور بعض تفصیلات احادیث نبویہ میں منقول ہیں، ان کا حاصل اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

ایک وقت ایسا گذرا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی چیز موجود نہ تھی، صرف وہی تن تنہا تھا، پھر اللہ کی حکمت کے مطابق مخلوقات کے پیدا کرنے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کو پیدا فرمایا اور پانی کو، نیز لوح محفوظ اور اس میں لکھنے والے قلم کو اور لوح محفوظ میں تقادیر محفوظ فرمادیں، پھر ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد زمین وآسمان وغیرہ کی پیدائش کا مرحلہ آیا، چنانچہ پانچ دن مکمل اور چھٹے دن کے کچھ حصہ کے علاوہ وقت کی مقدار میں آسمان وزمین اور ان میں موجود چیزوں کو پیدا کیا، دو دن میں آسمان کی پیدائش مع سورج، چاند وستاروں کے مکمل ہوئی اور چار دن میں زمین کی مع پہاڑ، درخت، دریا اور ان جانداروں کے جن کی پیدائش کا طریقہ انسانوں کی طرح رکھا گیا ہے، آسمان و زمین دونوں کے سات سات طبقات ہیں اور ان کے ہر دو طبقوں کے درمیان سیکڑوں سال کی مسافت کا فاصلہ ہے، ہر آسمان الگ الگ عناصر سے بنایا گیا ہے، ساتوں آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، جو ان کو گھیرے ہے اور اس پر اس کی کرسی اور ساتوں آسمانوں کا

ایک ایک چپہ وحصہ ان فرشتوں سے بھرا ہوا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ہی ''بیت المعمور'' ہے، جس کی وہی حیثیت ہے جو زمین میں بیت اللہ کی ہے۔

زمین کے ہر ہر طبقے پر الگ الگ قسم کی مخلوق بسا رکھی ہے، آسمان وزمین دونوں کو پانی سے پیدا کیا گیا، پانی کو بھاپ کی صورت دے کر آسمان کو اور جما کر زمین کو، زمین کی پیدائش کا آغاز سرزمین مکہ سے اور بیت اللہ کے مقام سے ہوا کہ سب سے پہلے بے تھاہ پانی کے سمندروں میں یہ حصہ ظاہر ہوا، حتیٰ کہ پوری زمین تیار ہوئی۔

زمین کا یہ طبقہ جس پر ہم انسان موجود ہیں اس پر سب سے پہلے جناتوں کو آباد کیا گیا، وہ ایک طویل عرصہ تک یہاں رہتے رہے، لیکن چونکہ ان میں شر کا غلبہ ہے اس لئے انہوں نے زمین پر اتنا شر وفساد مچایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ ان کو سزا دے کر ان کی عام آبادی ویرانوں، پہاڑوں اور جنگلات کی طرف منتقل کردی اور زمین پر انسانوں کے بسانے کا ارادہ فرمایا اور سب سے پہلے حضرت آدمؑ پیدا کئے گئے، اس کیلئے زمین کے مختلف قسم کے حصوں سے مٹی جمع کی گئی، جس کو مختلف قسم کے پانیوں سے گوندھا گیا، پھر مٹی سوکھ کر بجنے کے لائق ہوگئی تو اس سے حضرت آدمؑ کا پتلا بنایا گیا اور جمعہ کے دن عصر بعد کے وقت میں اس پتلے کے اندر روح ڈال کر اس کو ایک زندہ انسان بنا کر فرشتوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور چونکہ حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اعلان فرمادیا تھا کہ: ''میں ایسی مخلوق کو پیدا کرنے جا رہا ہوں جو زمین میں میری خلافت ونیابت کے فرائض انجام دے گے''، لہٰذا فرشتوں کو حضرت آدمؑ کی اس صلاحیت کا مشاہدہ کرایا گیا، جس کی وجہ سے ان کو اس منصب کا اہل قرار دیا گیا تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں کے نام اور اثرات سے اللہ تعالیٰ نے ان کو واقف کرادیا تھا اور فرشتے اس سے محروم تھے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت سوال کیا تو فرشتے جواب نہ دے سکے، حضرت آدمؑ نے فوراً سب

کچھ بتادیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے حضرت آدمؑ بلکہ انسانوں کی عظمت کو یوں تسلیم کرایا کہ فرشتوں کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کا حکم دیا، شیطان اس اعزاز کو برداشت نہ کرسکا ،انکار کر بیٹھا تو ہمیشہ کیلئے اللہ کی رحمت سے دور قرار پایا اور انسانوں کا دشمن بن گیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت میں رکھا، ان کی دلجوئی کیلئے ان کی پشت کی جانب کی بائیں پسلی کے اوپری حصہ سے حضرت حواء کو پیدا کیا، ایک دن سو کر اٹھے تو دیکھا کہ وہ پہلو میں بیٹھی ہیں، کچھ وقفہ گذرنے پر ان دونوں کو زمین میں پہنچا دیا گیا اور انہیں دونوں سے نسل انسانی کا سلسلہ چلا، اللہ تعالیٰ نے حسب موقع وحاجت ضروریات کے پورا کرنے کی صورتیں اپنے مخصوص بندوں کو بتائیں، جن سے دوسروں نے سیکھا۔

کائنات کے نظام کا ایک حصہ تو ہم انسانوں کے ہاتھ میں دیا اور اسی کی بابت ہم کو ہدایات واحکام دیئے ہیں اور ایک حصہ خود اپنے اختیار میں رکھا کہ جس میں ہماری جدوجہد کا کوئی دخل نہیں بلکہ وہ کرتا ہے اور اس کے حکم سے اس کے فرشتے مثلاً سورج وچاند اور سیاروں وستاروں کا چلنا، ان کی روشنی، بارش کا برسنا، فصل کا اگنا، غلہ اور پھل وپھول کا پیدا ہونا اور انتفاع کے لائق ہونا، اولاد کو وجود دینا کہ مرد کے جسم سے ایک مادہ عورت کے جسم میں منتقل ہوتا ہے، جو صرف پانی ہوتا ہے، وہی پانی کا قطرہ ایک زندہ وحرکت کرتے ہوئے انسان کی شکل اختیار کرلیتا ہے، چالیس دن کا عرصہ گذرنے پر وہ خون بنتا ہے، پھر اسی عرصہ پر گوشت بنتا ہے، پھر اسی عرصہ پر روح پڑتی ہے اور اعضاء بننے لگتے ہیں، حتیٰ کہ پیدائش کی نوبت آتی ہے، پرندوں اور بعض دوسرے جانوروں میں یہی پانی کا مادہ انڈے کی شکل اختیار کرلیتا ہے، جس کے اندر کا مادہ ایک جیتا جاگتا وجود اختیار کرلیتا ہے، ہوائیں سمندروں سے بھاپ کو اٹھا کر بادل بناتی ہیں، جنہیں فرشتے ادھر سے ادھر ہنکاتے ہیں، کڑک وگرج انہیں کی آواز اور چمک کی صورت میں ان کا کوڑا ظاہر ہوتا ہے، بارش کے موقع پر بارش ایک حساب سے ہوتی ہے اور ہر ہر قطرہ کو ایک ایک فرشتہ اس کیلئے متعین جگہ تک پہنچاتا ہے، بہت

سے پودوں کی پیدائش بیجوں کے ذریعہ ہوتی ہے اور بہت سے خود سے اگتے ہیں، ایسے ہی جانوروں کا معاملہ ہے کہ بہت سے خود بخود پیدا ہوتے رہتے ہیں، اسی انداز پر یہ نظام کارفرما ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت اور صناعی کے ذریعہ برپا کیا ہے، حتیٰ کہ قیامت آنے پر یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک نیا نظام جاری ہوگا۔

اسلام کا اعتدال

''اعتدال'' کے معنیٰ ہیں برابر ہونا یعنی ہر طرف سے اور ہر طرح سے برابر ہونا، اسی لئے اس لفظ کا مشہور و معروف مفہوم ہے ''میانہ روی'' یعنی درمیانی حالت و کیفیت پر ہونا۔

دنیا کا پرانا مسلم اصول ہے کہ کوئی بھی چیز جب تک ''اعتدال'' پر رہے گی وہ پورے طور پر درست و مفید ہوگی اور اگر اعتدال سے باہر ہوئی، مناسب حدود سے آگے بڑھ گئی یا پیچھے ہوگئی تو وہ پورے طور پر نہ تو درست ہوگی، نہ مفید ثابت ہوگی، موٹی سی مثال یہ کہ جسمانی صحت کے تمام طریقے اس پر متفق ہیں کہ صحت کی بنیاد مزاج کا اعتدال ہے اور کسی جانب بھی اس میں خلل پیدا ہو تو یہی خلل مرض کہلاتا ہے، خواہ وہ کسی کیفیت کا حد سے بڑھنا ہو یا گھٹنا، مثلاً خون کے دوران کی اپنی حدود سے تیزی بھی مرض جسے ''ہائی بلڈ پریشر'' کہتے ہیں اور اس سے کمی بھی مرض جسے ''لو بلڈ پریشر'' کہتے ہیں، صحت اس کا اعتدال یعنی متعینہ حدود میں رہنا ہے، دنیاوی نظم و انتظام میں کامیابی کی روح بھی یہی اعتدال ہے، ان لئے روحانیت و اخلاقیات کی صحت و افادیت کا مدار بھی یہی وصف اعتدال ہے، سارے آسمانی مذاہب و کتابیں اسی لئے دنیا میں اتاری گئیں اور سب نے اسی اعتدال کی دعوت دی اور اب امت محمدیہ اور دین اسلام ہی اس خوبی کا حامل ہے، دوسرے آسمانی مذاہب اس سے محروم ہیں بلکہ اسلام اس لحاظ سے اس وصف میں ان سے فائق ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کو ایک طویل عرصہ کیلئے دنیا کی ہدایت کا علمبردار بنایا گیا ہے اور اس عرصہ میں طرح طرح کی ایسی ذہنی ترقیاں سامنے آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی، جن کی اسلام سے پہلے کے زمانوں میں کوئی مثال نہیں ہے، قرآن کا اعلان ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو نہایت اعتدال پر

ہے) نیز كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہری کی گئی) آپ جس میدان میں چاہیں اسلام کے اعتدال کا دوسرے مذاہب ونظریات وتحریکات سے موازنہ ومقابلہ کرلیں، آپ کو اسلام کا ہی پلڑا بھاری نظر آئے گا۔

اعتقادات کے باب میں پچھلی امتوں نے یا تو حد سے تجاوز کرکے انبیاء کو خدا کا درجہ دے دیا؛ یہودیوں نے حضرت عزیرؑ اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا یا ان کے مرتبہ ومنصب کا جو احترام وحق تھا اس کا لحاظ کئے بغیر؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت جہاد پر یوں کہا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (آپ اور آپ کے اللہ میاں چلے جایئے اور دونوں لڑ بھڑ لیجئے، ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں) لیکن امت محمدیہ ہر دور وعہد میں ایک طرف تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کرتی رہی اور اور دوسری طرف ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کا اعتقاد رکھتے ہوئے آپ کو اللہ کا بندہ ورسول ہی مانتی ہے۔

اعمال وعبادات میں پچھلی امتوں نے اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے عوض بیچ ڈالا، رشوتیں لے کر کتاب اللہ میں ترمیمیں کیں، غلط فتوے دیئے، احکام بدلے، عبادات سے پیچھا چھڑایا، دوسری طرف کچھ لوگوں نے محض رضاء الٰہی کی طلب میں حلال نعمتوں سے خود کو محروم رکھنے اور سختیاں جھیلنے کو عبادت سمجھا، اسلام نے ایک طرف حکم خدا ورسول پر مرمٹنے کا جذبہ پیدا کیا، دوسری طرف رہبانیت (دنیا اور دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کشی) کو انسانیت پر ظلم قرار دیا۔

معاشرت وتمدن کی رو سے پچھلی امتوں میں ایک طرف تو یہ غلو کہ کیڑے مکوڑے مارنا حرام، ذبیحہ حرام، دوسری طرف یہ بے اعتدالی کہ کسی کے حق کا کوئی احترام نہیں، لوٹ مار اور قتل وخوں ریزی عام، بات بات پر سیکڑوں سال کو جنگ جاری، لڑکیوں کی زندہ درگوری

اور عورتوں کی رسم ستی، اسلام نے حقوق انسانیت بھی بتائے، حتیٰ کہ میدان جنگ [illegible] جنگ کی حالت میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت کا حکم دیا، ہر انسان کو [illegible] حقوق میں درگذر وچشم پوشی کا سبق پڑھایا، دوسروں کے حقوق کا احترام [illegible] نفع بخش چیز سے حدود کا لحاظ رکھ کر انتفاع کا حق دیا۔

اقتصادیات ومالیات میں دنیا نے ایک طرف تو نظام سرمایہ داری کو [illegible] نصب العین حلال وحرام اور دوسروں کی ضروریات سے صرف نظر کرکے دولت [illegible] ہے، دوسری طرف شخصی وانفرادی ملکیت سرے سے جرم ہے اور دولت کو حاصل [illegible] اہمیت اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا ہے، اسلام نے ایک طرف اس کو مقصد زندگی بنانے سے روکا، انسانی عزت وشرافت، منصب وعہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، دوسری طرف دولت کی تقسیم اور دوسروں تک پہنچانے کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے کہ جن کا لحاظ کرنے سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہ سکتا، نہ کسی کی ضرورت اٹکی رہ سکتی ہے اور نہ ہی ایک یا چند افراد ساری دولت کو سمیٹ کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، شرکت کے لائق چیزوں کو مشترک اور وقف عام قرار دیا ہے اور مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کو نہ صرف یہ کہ جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کا مکمل احترام کیا ہے، حلال مال اور اس کی کمائی کی فضیلت بتائی ہے، اس کے رکھنے واستعمال کے صحیح طریقے بتائے ہیں۔

حاصل یہ کہ جس طرح اس امت کو سب سے افضل رسول، سب سے جامع ومکمل کتاب عطا کی گئی؛ اسی طرح تمام قوموں کا صحت مندانہ مزاج اور اعتدال بھی اعلیٰ پیمانہ پر عطا کیا گیا، اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھولے گئے، ایمان اور عمل وتقویٰ کی تمام شاخیں اس کی قربانیوں سے سرسبز وشاداب ہوئیں، وہ کسی مخصوص ملک وعلاقے میں محصور نہیں رہی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور اسی کا حاصل ''اعتدال'' ہے۔

اسلام اغیار کی نظر میں

مسٹر کارلائل:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زندگی کا ایک جگمگاتا ہوا نور تھا، جسے قدرت نے اپنے سینے پھاڑ کر دنیا کو روشن کرنے کیلئے بھیجا تھا، موجودات کا عظیم ہیبت ناک اور تابناک راز اس کی آنکھوں کے سامنے چمک اٹھا اور بلاشبہ اس کیلئے امر ربانی بھی تھا"

ڈاکٹر ای، اے، فریمن:

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت محمدؐ بڑے پکے راست باز اور سچے ریفارمر تھے، آپؐ کی ہی ہستی ایسی مفصل ہے جس کے حالات ہم تک صحیح اور بالتفصیل پہنچے ہیں، انسانی اخلاق کی جو اصلاح آپؐ نے فرمائی ہے، اجتماعیات کے اندر جو بلند انقلاب آپ کی تعلیم نے پیدا کیا ہے، سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی پاکیزگی کے لئے جو اسوۂ حسنہ آپ نے پیش کیا ہے وہ آپ کو انسانیت کا محسن اول قرار دیتا ہے"

پروفیسر باسورتھ اسمتھ:

"بلاشک حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں، اگر پوچھا جائے کہ افریقہ بلکہ پوری دنیا کو کسی مذہب نے زیادہ فائدہ پہنچایا یا اسلام نے تو جواب میں کہنا پڑے گا: اسلام نے، اگر محمدؐ کو قریش ہجرت سے پہلے خدا نخواستہ شہید کر ڈالتے تو مشرق و مغرب دونوں ناقص و ناکارہ رہ جاتے، اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا ظلم بڑھتے بڑھتے اس کو تباہ کر دیتا، یورپ کے تاریک زمانے دو چند بلکہ سہ چند تاریک تر ہو جاتے، انسان ریگستان میں پڑے بھٹکتے پھرتے اور عیسائیت بد سے بدتر ہو جاتی، جب میں آپ کی تمام صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے، کیا ہو گئے اور آپ کے تابعدار غلاموں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی کیا کیا کارنامے دکھائے تو آپ مجھے سب سے بزرگ تر، سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ دکھائے دیتے ہیں، آپ نے شروع سے لے کر آخر تک یعنی نبوت ملنے سے لے کر وفات تک اپنے کو نبی کہلایا اور اس سے رتی بھر آگے نہیں بڑھے، میں یہ اعتقاد کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے فلاسفر، عالی دماغ فضلاء اور عیسائی ایک دن بالاتفاق تصدیق کریں گے کہ بلاشک حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں"

ایسٹ اینڈ ویسٹ آف لندن:

"حضرت محمدؐ صاحب ہی ایسے بانی مذہب تھے جو دینی بادشاہ بھی تھے اور دنیوی بھی، ہم جس وقت یہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے قومی معاملات میں حق رسانی فتح کرنے میں رحم، حکمرانی میں اعتدال اور سب سے مقدم دوسرے مذاہب کی رسوم و فرائض کی بے روک ٹوک آزادی کے احکام صادر فرمائے ہیں تو ہم کو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ آنحضرتؐ تمام نبیوں اور تمام بادشاہوں میں سب سے زیادہ تعظیم و تکریم کا استحقاق رکھتے ہیں"

جارج سیل:

"میں نے اپنی تحقیقات میں ایسا کوئی ثبوت نہیں پایا جس سے حضرت

محمدؐ کے دعوی رسالت میں شبہ ہو سکے، یا ان کی مقدس ذات پر مکر و فریب کا الزام لگایا جا سکے"

ٹالسٹائی:

"عالم انسانی کی رہبری کیلئے قرآن بہترین رہنما ہے، اس کے اندر تہذیب وسلیقہ، تمدن ومعاشرت اور اخلاقی اصلاح کی تعلیم ہے، اگر دنیا میں محض یہ کتاب ہی ہوتی اور اس کے علاوہ کوئی رہنما نہ آتا تو بھی یہ کتاب عالمی ہدایت کیلئے کافی ہوتی"

ایڈورڈ گبن:

"اٹلانٹک سے گنگا تک یہ مان لیا گیا ہے کہ قرآن جمہوری حکومت کی روح اور اس کی بنیاد ہے، اس میں صرف مذہبی اصول ہی نہیں بلکہ احکام وتعزیرات اور تہذیب وتمدن اور پورے نظام حیات کیلئے جس سے نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے اور جو قدریں زندگی کیلئے تعمیری ہیں ان کیلئے اچھی بنیاد ہے"

دیوان پورٹ:

"قرآن اسلام کا عام قانون ہے جو معاشی ومعاشرتی اور فوجی ودیوانی، مقدمات دونوں پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک مذہبی دستور بھی ہے، اس کے دائرہ بحث میں مذہب وزندگی، جسم وروح کی نجات وصلاح، فرد واجتماع کے حقوق، دین ودنیا کے تمام احکام موجود ہیں"

مسٹر اسٹینلی لون پول:

"قرآن کو حضرت محمدؐ نے ایسے نازک وقت میں پیش کیا جب کہ ہر طرف تاریکی وجہالت کی حکمرانی تھی، اخلاق انسانی کا جنازہ نکل چکا تھا، بت پرستی کا ہر طرف زور تھا، قرآن نے ان تمام گمراہیوں کو مٹایا جن کو دنیا پر چھائے ہوئے کئی صدیاں گذر چکی تھیں، قرآن نے دنیا کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی، اصول مذہبیت اور علوم حقائق سکھائے، ظالموں کو رحم دل اور وحشیوں کو پرہیزگار بنایا، اگر یہ کتاب شائع نہ ہوتی تو انسانی اخلاق تباہ ہو جاتے اور دنیا کے باشندے برائے نام انسان رہ جاتے"

ایڈمنڈک برک:

"اسلامی قانون ایک تاجدار سے لے کر رعایا کے ادنیٰ فرد تک ہر ایک پر حاوی ہے، یہ ایک ایسا قانون اور معقول فقہ ہے جس کی نظیر دنیا اس سے پہلے نہیں پیش کر سکی"

مشہور مستشرق وان کریمر:

"اہل روما کو چھوڑ کر دنیا کی کسی قوم کے پاس اتنا عظیم الشان اور اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام نہیں جتنا کہ عربوں کا ہے"

پروفیسر سپریل جنیوا:

"پوری نسل انسانی کو اسلام کے پیغمبر پر فخر کرنا چاہئے، کیونکہ آپ نے انسانیت کیلئے وہ قانون چھوڑا ہے جس کے اعلیٰ معیار پر انسانیت اگر

آئندہ دو ہزار سال میں بھی آ جائے تو بڑی باعث مسرت کامیابی ہوگی"

فرانسیسی مستشرق گستاولی بان:

"اسلام کے طفیل عورتوں کے حقوق محفوظ اور خاندانی روابط مضبوط ہوئے، نظام معاشرہ اور خاندان کا ایک فرد بن گیا، زکوٰۃ نے اخلاق عامہ کو پاک کیا، عدل و احسان نے شعوری طور پر دلوں میں گھر کرلیا، حاکم و محکوم کا اپنے اوپر حق تسلیم کرنے لگے، معاشرہ کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں، خصوصاً عورتوں کا مقام بہت بلند ہو گیا، پردہ کا حکم ضرور دیا مگر مجالس علم، مساجد اور دوسرے رفاہی کاموں سے انہیں کبھی نہیں روکا"

پروفیسر سانتی لانا:

"اسلامی قانون کا نظم ماہرین قانون کی نظر میں ہر قدر و ستائش کا مستحق ہے اور اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام کے بے ڈول اور وحشیانہ رسم و رواج کے مقابلے میں وہ بہت بلند ہے، عربی قانون کے اہم اجزاء نے مغربی تصورات کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے جس سے اس کی فضیلت ظاہر ہے"

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥
وَصَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى نَبِيِّكَ الْكَرِيْمِ

۱۷ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ / ۱۲ فروری ۱۹۸۲ء
یوم جمعہ

تصانیف استاذ الاساتذہ حضرت مولانا و مفتی عبید اللہ الاسعدی مدظلہ العالی قاضی و شیخ الحدیث و صدر مفتی جامعہ عربیہ ہتھورا ضلع باندہ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و رکن اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

(۱) دار العلوم دیوبند (عربی)
(۲) الموجز //
(۳) سبق الغایات فی نسق الآیات //
۴- الحدیث الضعیف و أحکامھم //
(۵) تذکرۃ الصدیق
(۶) مآثر حضرت باندی - علیہ الرحمہ -
(۷) مسائل نماز
۸ احکام نماز احادیث و آثار کی روشنی
(۹) علوم الحدیث
(۱۰) حدیث ضعیف
(۱۱) ولی اللّٰہی
(۱۲) اسلام مکمل دین اور مستقل تہذیب
(۱۳) حیات جعفر - سوانح حیات
(۱۴) اصول الفقہ
(۱۵) تسہیل اصول الفقہ
(۱۶) غیر مسلم ممالک میں عشر و خراج
(۱۷) سرگزشت سفر جہاد
(۱۸) اسعاد النحو -
(۱۹) معراج رسول صلی اللہ علیہ وسلم
۲۰ تجدید نسل اور اسلامی تعلیمات

٢١۔ اسلام کے آداب معاشرت
٢٢۔ اجتہاد و تقلید
٢٣۔ فقہ حنفی
٢٤۔ تہتر فرقوں والی حدیث
٢٥۔ اہل حق
٢٦۔ ڈاکٹر ذاکر نائک کے افکار و خیالات
٢٧۔ اصلاح المسلمین
٢٨۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
٢٩۔ تاریخ جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ
٣٠۔ سوانح مولانا محمد مرتضی صاحب
٣١۔ اختلاف کے آداب و احکام
٣٢۔ سیرت تابعین
٣٣۔ اعتکاف
٣٤۔ حقیقت نکاح
٣٥۔ حدیث کے چند گوشے
٣٦۔ اہل سنت والجماعت کے کلامی فقہی مکاتب یا اصولی و فروعی مذاہب اور اسکے اجمالی اسباب
٣٧۔ تعزیات کاملین دین
٣٨۔ سود اور نقطۂ نظر
٣٩۔ الربا

(مطبوعہ)۔

جمع کردہ ۔ محمد بلال سلطانپوری ۔
جامعہ عربیہ ہتھورا ضلع باندہ
9839892018